معظم علی

حصہ دوم

نسیم حجازی

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ ملت، ننگ دیں، ننگِ وطن

(اقبالؒ)

انٹرنیٹ ایڈیشن دوم سال 2006 www.Nayaab.Net

ترتیب

بارھواں باب	03
تیرھواں باب	37
چودھواں باب	72
پندرھواں باب	108
سولھواں باب	138
سترھواں باب	165
اٹھارھواں باب	197
اُنیسواں باب	217
بیسواں باب	250
اکیسواں باب	289

بارھواں باب

ایک صبح صابر، شیر علی کے لیے ناشتہ تیار کر رہا تھا کہ باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد کسی آدمی نے آواز دی۔صابر، صابر دروازہ کھولو۔

صابر نے بھاگ ک ردورازہ کھولا تو اس کے سامنے دلاور خاں گھوڑے کی بات تھامے کھڑا تھا۔صابر بے بدحواس ہو کر سوال کیا۔معظم علی کہاں ہیں؟

وہ شام تک پہنچ جائیں گے۔دلاور خاں نے صحن میں پاؤں رکھتے ہوئے جواب دیا۔صابر کون ہے؟ مکان کے ایک کمرے سے شیر علی کی آواز سنائی دی۔

جی دلاور خاں آ گیا ہے۔

شیر علی جلدی سے باہر نکل آیا۔صابر دلاور خاں سے کئی سوالات پ]وچھنا چاہتا تھا، لیکن وہ اس کے ہاتھ میں گھوڑے کی باگ دے کر جلدی سے آگے بڑھا اور شیر علی سے مخاطب ہو کر بولا۔جناب خاں صاحب آ رہے ہیں۔مجھے انہوں نے اطلاد دینے کے لیے بھیجا ہے کہ وہی شام تک پہنچ جائیں گے۔وہ اپنے ساتھ اسی گھوڑے لا رہے ہیں۔اس لیے آپ شہر سے باہر فوراً کوئی ایسا مکان کرائے پر حاصل کریں جہاں گھوڑے کے علاوہ پندرہ بیس آدمیوں کے ٹھہرنے کا انتظام ہو سکے۔خاں صاحب نے کہا کہ اگر شہر کے باہ رکوئی ایسی کشادہ حویلی مل جائے جس کے اندر ایک رہائشی مکان بھی ہو تو زیادہ اچھا ہوگا۔اگر کرائے کی بجائے قیمت پر کوئی موزوں جگہ ملتی ہو تو خرید لیں وہ آتے ہی قیمت ادا کر دیں گے۔وہ یہ کہتے تھے کہ گھوڑوں کی تجارت کے لیے ہمیں لکھنوء میں مستقل طور پر ایک نہایت کشادہ مکان کی ضرورت ہے۔

شیر علی نے دلاور خاں سے چند سوالات پوچھے اور ناشتے کا انتظار کیے بغیر باہر

نکل گیا۔ دن کے تیسرے پہر شیر علی، دلاور خاں کے ساتھ شہر کے مغربی دروازے پر کھڑا معظم علی کا انتظار کر رہا تھا۔ عصر کی نماز کے تھوڑی دیر بعد سڑک پر ایک قافلے کی جھلک دکھائی دی اور دلاور خاں نے کہا جناب وہ آ گئے!

تھوڑی دیر بعد قافلہ کچھ فاصلے پر سڑک سے اتر کر ایک کھیت میں رُک گے اور شیر علی اور دلاور خاں تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے۔

معظم علی، شیر علی کو دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑا اور اکبر خاں نے اس کی تقلید کی۔

شیر علی نے آگے بڑھ کر گرمجوشی سے ان کے ساتھ باری باری مصافحہ کیا اور کہا۔

آپ کو یہاں رُکنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمام انتظامات کر لیے ہیں۔ شہر کی دوسری طرف مضافات کی ایک بستی میں مجھے ایک بہت کھلی حویلی مل گئی ہے۔ حویلی کا مالک نہایت شریف آدمی ہے اور اس نے مجھے یہ کہا ہے کہ آپ پندرہ بیس دن کے لیے اپنے گھوڑے اور نوکر یہاں رکھ سکتے ہیں اور اس کے لیے کوئی کرایہ وصول نہیں کروں گا۔ حویلی کے اندر ایک چھوٹا سا دو منزلہ مکان بھی ہے جو بالکل نیا ہے۔ ایک طرف چند پرانی کوٹھریاں ہیں جو نوکروں کے کام آ سکتی ہیں گھوڑے ابھی ہمیں کھلے صحن میں باندھنے پڑیں گے اگر حویلی کے مالک کے ساتھ ہمارا سودا ہو گیا تو گھوڑوں کے اصطبل تعمیر کرنے کے لیے اس میں کافی جگہ ہے۔

معظم علی نے سوال کیا۔ آپ نے اس سے قیمت کے متعلق پوچھا؟

جی ہاں میں نے پوچھا تھا لیکن وہ براہ راست آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔

وہ غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے شہر کی دوسری طرف ایک بستی میں داخل ہوئے حویلی کا مالک دروازے پر کھڑا تھا۔ شیر علی نے معظم علی کے ساتھ اس کا تعارف کرایا تو معظم علی نے کہا۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ اگر آپ اس قدر

فیاضی سے کام نہ لیتے تو ہمیں بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔

حویلی کے مالک نے کہا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ یہ جگہ کسی کام آرہی ہے۔ یہ حویلی ایک سرائے تھی۔ پہلے یہاں کافی رونق رہا کرتی تھی لیکن اب شہر میں چند نئی سرائیں بن گئی ہیں اور مسافر یہاں ٹھرنا پسند نہیں کرتے۔ پچھلے سال جب میں نے اسے خریدا تھا تو یہ نہایت شکستہ حالت میں تھی۔ میں اسے مرمت کروا چکا ہوں۔ اس کے اندر کام کا صرف ایک مکان تھا اور اس پر میں نے بالا خانہ تعمیر کرایا ہے۔ تین چار مہینے میں نے سرائے کا کاروبار چلانے کی کوشش کی تھی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا کبھی باہر سے کوئی بڑا قافلہ آتا تھا تو لوگ مجبوری کی حالت میں ایک آدھ دن کے لیے یہاں اتر پڑتے تھے لیکن اس کے بعد وہ شہر میں چلے جاتے تھے۔ اس لیے میں نے سرائے کا کاروبار بند کر دیا۔ آپ کے کاروبار کے لیے یہ جگہ بہت موزوں ہوگی اور اگر آپ خریدنا چاہیں تو میں کوء نفع لیے بغیر فروخت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ فوراً فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ اسے اندر باہر سے اچھی طرح دیکھ لیں۔

چلیے ابھی دیکھ لیتے ہیں۔ معظم علی سرائے کے مالک کے ساتھ اندر داخل ہوا اور صحن میں کھڑا ہو کر چاروں طرف نگاہ دوڑانے کے بعد بولا۔ یہ جگہ ہمارے کام آسکتی ہے۔ آپ قیمت بتائیں۔

نہیں آپ اچھی طرح دیکھ لیں۔ آیئے میں آپ کو مکان دکھاتا ہوں

مالک مکان کے اصرار پر معظم علی اس کے ساتھ چل پڑا۔ نچلی منزل کے پانچ کمرے دکھانے کے بعد وہ اسے بالا خانے پر لے گیا۔ وہاں تین کشادہ کمروں کے سامنے ایک برآمدہ تھا اور برآمدے کے سامنے کھلی چھت ایک چھوٹے سے صحن کا کام دیتی تھی۔

معظم علی نے بالا خانے سے حویلی کا جائزہ لینے کے بعد مالک مکان سے کہا آپ سودے کی بات کریں۔

مالک مکان نے کہا۔لیکن جناب اس طرف دیوار کے ساتھ چند کوٹھڑیاں ہیں نیچے اتر کر آپ وہ بھی دیکھ لیں۔

انہیں دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے اس حویلی کا بہت سا حصہ دوبارہ تعمیر کروانا پڑے گا۔آپ بلا جھجک قیمت بتائیں۔

مالک مکان نے جواب دیا۔ جناب میں آپ کو کاغذات دکھا سکتا ہوں۔ میں نے سات ہزار میں یہ حویلی خریدی تھی اور قریباً اڑھائی ہزار روپیہ اس پر خرچ کر چکا ہوں۔حویلی کا سودا چند آدمیوں کے سامنے ہوا تھا۔صبح تک میں انہیں بھی آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔

نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو دس ہزار روپیہ دینے کے لیے تیار ہون۔پانچ سو آپ کا نفع ہوگا۔

میں اس پانچ سو کو نفع کی بجائے ایک امیر آدمی کا انعام سمجھوں گا۔ مجھے دس ہزار منظور ہے لیکن میں آپ کی خدمت میں ایک درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں، جب میں نے یہ حویلی خریدی تھی تو یہاں دو غریب عورتیں رہتی تھیں۔سرائے کے پہلے مالک نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں انہیں یہیں رہنے دوں،وہ بے سہارا ہیں اور گاؤں کے لوگوں کے کپڑے سی کر اپنا پیٹ پالتی ہیں۔کبھی کبھی میری بیوی کچھ مدد کر دیا کرتی ہے۔ جب کبھی یہاں مسافر آیا کرتے تھے تو انہیں بہت تکلیف ہوتی تھی اور وہ سارا دن اپنی کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے پڑی رہتی تھیں۔ میں نے کونے کی ایک کوٹھڑی کے سامنے ان کے پردے کے لیے ایک چھوٹی سے دیوار بنوا

دی ہے۔وہ نہایت نیک ہیں اور آپ جیسے خداترس لوگوں کی اعانت کی مستحق ہیں۔ اس لیے میں آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ انہیں وہاں رہنے دیں۔

معظم علی نے اپنی جیب سے چاندی اور سونے کے چند سکے نکال کر حویلی کے مالک کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔انہیں ہماری طرف سے پیش کردیں اور صبح یہاں تشریف لا کر اپنی رقم وصول کرلیں۔

اس کے بعد معظم علی، شیر علی خاں کی طرف متوجہ ہوا۔اب گھوڑوں کی دیکھ بھال اور نوکروں کے قیام و طعام کا انتظام آپ کے ذمہ ہے۔میں اکبر خاں کے ساتھ شہر کے مکان میں جاتا ہوں۔ہم بہت تھکے ہوئے ہیں کل ہم یہاں آجائیں گے۔

اگلے دن معظم علی شہر کی مکان سے اپنا مختصر سا سامان اس حویلی میں منتقل کر چکا تھا۔

بالائی منزل کے کمرے وہ اپنی رہائش کے لیے منتخب کر چکا تھا۔شیر علی نچلی منزل کے ایک کمرے میں اپنا دفتر سجا رہا تھا۔شہر سے گھوڑوں کے خریدار جوق در جوق وہاں جمع ہو رہے تھے اور حویلی ایک اچھی خاصی منڈی معلوم ہوتی تھی۔آس پاس کے بہت سے لوگ صرف گھوڑے دیکھنے کے لیے وہاں جمع ہو جاتے تھے۔صابر سارا دن کھانا پکانے اور برتن صاف کرنے میں مصروف رہتا تھا۔جب کبھی فرصت ملتی حویلی کا ایک چکر لگاتا۔اسے وہ سفید گھوڑے جو اکبر خاں کو فخر الدین نے دیئے تھے، بیحد پسند تھے اور اس کی پسند کی وجہ یہ تھی کہ اس نے معظم علی اور اکبر خاں کو ان کی تعریف کرتے ہوئے سنا تھا۔وہ کسی دیہاتی کو بازو سے پکڑ کر ان گھوڑوں کے پاس لے جاتا اور پوچھتا۔تمہارے خیال میں ان گھوڑوں کی کیا قیمت ہو گی؟ وہ

سادگی سے کوئی رقم بتاتا تو صابر جھنجھلا اٹھتا۔ واہ کیا کہنے تمہاری پہچان کے ۔ اے اُلو ان کی قیمت تمھارے سارے گاؤں سے زیادہ ہے۔

تین دن کے اندر معظم علی بیس گھوڑے فروخت کر چکا تھا۔ چوتھے روز ایک خوش پوش اجنبی اس کے پاس آیا اور اس نے تیس گھوڑے منتخب کر کے ان کے قیمت طے کرنے کے بعد کہا۔ میں یہ گھوڑے بنارس کے راجہ کے لیے خریدنا چاہتا ہوں لیکن گھوڑوں کو بنارس پہنچانا آپ کی ذمہ داری ہے۔ ان کے قیمت بھی آپ کو وہیں ادا کی جائے گی۔

معظم علی نے جواب دیا۔ مجھے بنارس پہنچانے میں کوئی عذر نہیں لیکن اگر راجہ نے یہ گھوڑے پسند نہ کیے تو۔۔۔۔؟

میں راجہ کا چچازاد بھائی ہوں۔ اس نے جواب میں کہا۔

آپ کب جانا چاہتے ہیں؟

کل

معظم علی، شیر علی کی طرف متوجہ ہوا۔ چچا! آپ بنارس جانا پسند کریں گے؟

کیوں نہیں۔ میں ابھی جانے کے لیے تیار ہوں

بہت اچھا آپ کل ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔

○

دو دن بعد لکھنوء میں یہ افواہ گرم تھی کہ وتاج سندھیا کی افواج نجیب الدولہ کو مغلوب کرنے کے لیے سہانپور کی طرف پیشقدمی کر رہی ہیں ۔ روہیلکھنڈ کے مسلمانوں کے نزدیک نجیب الدولہ ایک بہت بڑے قومی ہیرو کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اکبر خاں یہ خبر سنتے ہی اپنے ساتھیوں کو گھوڑوں پر زینیں ڈالنے کا حکم دے کر

بالا خانے پر معظم علی کے کمرے میں داخل ہوا۔معظم علی دریچے کے سامنے کرسی پر بیٹھا ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔اس نے کتاب بند کرتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔اکبر خاں بیٹھ جاؤ۔

اکبر اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور معظم علی نے کہا۔ہمارے ابتدا بہت اچھی ہے۔مجھے امید نہیں تھی کہ یہ گھوڑے اتنی جلدی بک جائیں گے۔میں شیخ فخر الدین کو پیغام بھیج رہا ہوں کہ ہمارے لیے دو سو گھوڑے اور خرید لیں۔ان کا جواب آنے پر مجھے وہاں جانا پڑے گا۔اب مجھے زندہ رہنے کے لیے کسی دلچسپی کی ضرورت ہے۔

اکبر خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔بھائی جان!مرہٹوں کی فوج نجیب الدولہ کے تعاقب میں سہانپور کی طرف بڑھ رہی ہے۔میں نے ابھی یہ خبر سنی ہے اگر آپ اجازت دیں تو فوراً گھر جانا چاہتا ہوں۔''

ان حالات میں تمہیں مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔تم کب جانا چاہتے ہو؟

اکبر خاں نے جواب دیا۔میرے ساتھی گھوڑوں پر زینیں ڈال رہے ہیں۔

معظم علی نے کہا۔بہت اچھا تم نیچے جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔

اکبر خاں نے کرسی سے اٹھ کر کہا۔بھائی جان آپ خفا تو نہیں ہیں۔میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر حالات ٹھیک ہوئے تو میں بہت جلد واپس آجاؤں گا۔

معظم علی نے جواب دیا۔مرہٹوں کی پیش قدمی کی خبر سننے کے بعد اگر تم فوراً گھر جانے کے لیے تیار نہ ہوتے تو مجھے یقیناً افسوس ہوتا مجھ سے زیادہ اس بات کا احساس اور کسے ہوسکتا ہے کہ روہیلکھنڈ ایک معزز قبیلے کے سردار کے حیثیت میں تمھاری ذمہ داریاں کیا ہیں اور میں تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ جس دن

مجھے اس بات کا احساس ہو گا کہ تمہیں میری ضرورت ہے یا میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں تو میں بن بلائے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔

اکبر خاں کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی بالا خانے سے اتر کر حویلی کے صحن میں داخل ہوا تو اکبر خاں اور اس کے ساتھی گھوڑے پر زینیں ڈال چکے تھے۔معظم علی کے ایک ہاتھ میں روپوں کی تھیلی تھی۔اس نے آگے بڑھ کر اکبر خاں کے کندھے پر دوسرا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔اکبر یہ لو۔

اس میں کیا ہے؟ اکبر خاں نے سوال کیا۔

اس میں تمہارے حصے کی کچھ رقم ہے جب دوبارہ ملاقات ہو گی تو ہم اطمینان سے بیٹھ کر حساب کریں گے۔اس میں ساتھ اشرفیاں تمہارے آدمیوں کے لیے ہیں۔اکبر خاں نے کہا بھائی جان آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔نوکروں کے متعلق میں آپ کو منع نہیں کرتا لیکن اپنے لیے میں ایک کوڑی قبول نہیں کروں گا۔

معظم علی نے کہا جو لوگ اپنا حق وصول نہیں کرتے وہ غاصبوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

لیکن اس تجارت میں میرا کوئی حصہ نہیں۔

یہ سوچنا میرا کام ہے۔معظم علی نے یہ کہتے ہوئے سکوں کی تھیلی اکبر خاں کے گھوڑے کی خرجین میں ڈال دی۔

اکبر خاں نے احتجاجاً کہا۔بھائی جان مجھے روپے کی کوئی ضرورت نہیں۔

تمہیں مجھ سے زیادہ ضرورت ہے۔میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ تجارت میں جو نفع کماؤ اس کی ایک ایک کوڑی اپنے علاقے کے آدمیوں کو مسلح

کرنے پر صرف کرو اس ملک میں صرف روہیلکھنڈ ایک ایسا خطہ ہے جہاں کے لوگ بد طنیت، خود غرض اور مفلوج حکمرانوں کی ہوس اقتدار سے آزاد ہیں

اکبر خاں نے لاجواب ہو کر کہا۔ میں آپ کو حکم عدولی کی جرات نہیں کر سکتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس روپے پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔

معظم علی مسکرایا۔ تمہیں یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ میں تمہیں کوئی غلط حکم نہیں دوں گا۔

O

اس دن گیارہ بجے کے قریب وہ تنہا بالائی منزل کے برآمدے میں بیٹھا ہوتھا کہ اسے ایک عورت جو اپنا جسم ایک میلی کچیلی چادر میں ڈھانکے ہوئے تھی حویلی کے صحن میں داخل ہوئی نوکر صحن میں بندھے ہوئے گھوڑوں کو پانی پلارہے تھے۔ عورت ایک گھوڑے کے قریب سے گزر رہی تھی کہ گھوڑے نے اچانک بدک کر اپنے گلے پاؤں اٹھالیے۔ عورت گھبرا کر ایک طرف ہٹ گئی۔ ایک نوکر اس کی بدحواسی پر قہقہ لگایا اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی حویلی کے کونے کی طرف چلی گئی۔

معظم علی بھاگتا ہوا نیچے اترا اور اس نے نوکر کے منہ پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ تمہیں ایک غریب اور بے بس عورت پر ہنستے ہوئے شرم نہیں آتی اور یہ گھوڑا یہاں کس نے باندھا ہے؟ اسے یہاں سے ہٹاؤ اور راستے سے دوسرے گھوڑے بھی کھول کر ایک طرف باندھ دو۔ یہ کھونٹے بھی یہاں سے اکھاڑ دو۔

تھوڑی دیر بعد معظم بالاخانے پر اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ دلاور خاں ایک طشت میں کھانا لے کر آ گیا۔ معظم علی نے کہا۔ مجھے بھوک نہیں۔ تم یہ کھانا ان غریب عورتوں کو دے آؤ۔ جو ہماری حویلی میں رہتی ہیں اور میری طرف سے انہیں یہ کہو کہ

آئندہ انہیں دونوں وقت کا کھانا ہمارے لنگر خانے سے ملا کرے گا۔

شام کے وقت معظم علی بستی کی چھوٹی سے مسجد میں نماز پڑھ کر واپس آ رہا تھا کہ حویلی میں نوکروں کا شور سنائی دیا۔ معظم علی نے جلدی سے آ کر وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ اس کے ایک سرکش گھوڑے نے کود کر ایک نوکر کو بری طرح زخمی کر دیا ہے۔ معظم علی نے نوکر کی ٹانگ پر اپنے ہاتھ سے پٹی باندھی اور کہا۔ یہ گھوڑا بہت خطرناک ہوتا جا رہا ہے میں کل صبح اس پر سواری کروں گا۔

اگلی صبح معظم علی گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکل گیا۔ جب وہ واپس آیا تو گھوڑا پسینے سے تر تھا اور اس کی تمام شوخی ختم ہو چکی تھی لیکن جب معظم علی حویلی کی ڈیوڑھی کے قریب پہنچا تو گھوڑے نے پھر کودنا شروع کر دیا۔ اچانک چادر لپٹی ہوئی ایک عورت ڈیوڑھی سے باہر نکلی اور بے خیالی میں گھوڑے کے سامنے آ گئی۔ معظم علی نے جلدی سے گھوڑے کے باگ موڑی لیکن بدحواس عورت رُکنے یا پیچھے ہٹنے کی بجائے گلی کی دوسری طرف جانے کی کوشش میں گھوڑے سے ٹکرائی اور منہ کے بل گر پڑی ۔اس کے ہاتھ سے مٹی اک پیالہ گر کر چکنا چور ہو گیا۔ معظم علی نے پوری قوت کے ساتھ باگ کھینچ کر گھوڑے کو روکا اور نیچے کود کر بھاگتا ہوا عورت کے قریب پہنچا وہ بیہوش تھی ۔ چادر اس کے سر سے کھسک چکی تھی اور اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اچانک زندگی کی تمام حسیات سمٹ کی معظم علی کی آنکھوں میں آ گئیں ۔وہ چلانا چاہتا تھا لیکن اس کے حلق میں آواز نہ تھی ۔ سازِ ہستی کے ٹوٹے ہوئے تار دوبارہ جڑ چکے تھے اور زندگی کی اداس اور مغموم فضائیں محبت کے نغموں سے لبریز ہو رہی تھیں ۔اندھیری رات کے مسافر کے راستے کا ہر پتھر ایک چراغ بن چکا تھا۔ فرحت! فرحت! اس نے کہا اور پھر کسی توقف کے بغیر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر حویلی میں داخل ہوا

۔اس کے پاؤں زمین پر تھے لیکن اس کی روح مسرت کے ساتویں آسمان پر تھی ۔

نچلی منزل کے ایک کمرے میں پہنچ کر اس نے فرحت کو چارپائی پر لٹا دیا ۔نوکر جو وہاں جمع ہو چکے تھے ۔اس کے ہاتھ کا اشارہ پا کر اِدھر اُدھر ہٹ گئے ۔معظم علی کی خوشی اب پریشانی اور گھبراہٹ میں تبدیل ہو رہی تھی ۔اس نے صابر کو آواز دے کر پانی مانگا۔صابر پانی کا کٹورا لے آیا اور معظم علی فرحت کے منہ پر چھینٹے مارنے لگا۔

فرحت نے آنکھیں کھولیں اور معظم علی کی کائنات مسکراہٹوں سے لبریز ہو گئی۔ وہ سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔فرحت فرحت میں معظم علی ہوں!

فرحت مسکرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔ بالآخر یہ آنسو اس کی آنکھوں سے اُمڈ پڑے اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ میں پہلے بھی ایسے خواب دیکھ چکی ہوں۔

ہم دونوں ایسے خواب دیکھ چکے ہیں ۔فرحت !تم کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟

نہیں مجھے معلوم نہیں گرنے کے بعد مجھے کیا ہو گیا تھا میں کب سے یہاں ہوں؟

مجھے امی جان کے پاس جانا چاہیے ۔وہ بیمار ہیں ان کے لیے دودھ لینے جا رہی تھی ۔فرحت یہ کہتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

معظم علی نے کہا۔نہیں یہیں رہو۔ میں تمہاری امی جان کو لے آتا ہوں۔

نہیں ۔نہیں آپ وہاں نہ جائیں ۔وہ کوٹھڑی اس قابل نہیں کہ آپ اس میں پاؤں رکھیں۔

معظم علی نے کہا۔فرحت کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تم یہاں ہو! میں تم کو دلی سے

لے کر حیدر آباد تک تلاش کر چکا ہوں۔

فرحت نے کہا۔میرا خیال تھا کہ اب دنیا میں ہماری کسی کو تلاش نہیں ہو گی کبھی میں یہ بھی محسوس کرتی تھی کہ اس حالت میں شاید آپ ہمیں پہچان بھی نہ سکیں۔میں ہمیشہ یہ سوچا کرتی تھی کہ آپ کسی دن ضرور آجائیں گے۔جب مالکِ مکان آپ کی طرف سے روپے لے کر آیا تھا تو میں نے اس سے آپ کا نام پوچھا تھا۔اگلے دن میں دروازے کی آڑ میں کھڑی باہر جھانک رہی تھی کہ مجھے آپ کی جھلک دکھائی دی۔

اور اس کے باوجود تم نے مجھے اپنا پتہ دینا گوارا نہ کیا؟

مجھے یہ ڈر تھا کہ آپ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر منہ پھیر لیں گے۔میں سوچتی تھی کہ جب میں یہ کہوں گی کہ میں فرحت ہوں تو میری صورت دیکھ کر آپ قہقہ لگائیں گے اور اپنے نوکروں سے کہیں گے کہ اس پگلی کو حویلی سے باہر نکال دو۔میں نے امی جان سے آپ کا ذکر کیا تھا اور وہ یہ کہتی تھیں کہ تم پاگل ہو۔تمہیں ہر آدمی معظم علی نظر آتا ہے۔

مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ میں ہوش میں ہوں اور آپ مجھ سے اس قدر قریب ہیں۔فرحت بری طرح سسکیاں لے رہی تھی۔

معظم علی نے کہا۔فرحت چلو۔تمھاری امی جان کے پاس چلتے ہیں۔

فرحت اپنے جسم پر چادر لپیٹنے کے بعد معظم علی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی۔ نوکر صحن میں ایک جگہ جمع ہو کر پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔فرحت کو معظم علی کی موجودگی کے سوا اب کسی بات کا احساس نہ تھا۔وہ خوشی کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔اور اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔حویلی

کے کونے میں قد آدم اونچی دیور کے ایک چھوٹے سے دروازے سے گزرنے کے بعد وہ تنگ صحن کے اندر داخل ہوئے۔ سامنے کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ فرحت نے آہستہ سے کہا۔ آپ یہیں ٹھہریں!

فرحت! فرحت! کیا ہوا بیٹی؟ ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کرب انگیز لہجے میں کہا۔ خدا کے لیے بتاؤ تمہیں کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟

فرحت نے کہا۔ امی جان وہ مل گئے ہیں۔ انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر یہ نہیں کہا کہ پگلی ہوں۔

کون مل گئے ہیں؟ تم کیا کہہ رہی ہو؟

امی جان یوسف علی کے بھائی آپ کو دیکھنے آئے ہیں۔ فرحت نے گردن اٹھا کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ماں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا۔ بیٹی تمہیں کیا ہو گیا ہے کہاں ہیں وہ؟

معظم علی نے کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ مرزا حسین بیگ کی بیوی کے بے سرو سامانی کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور اس نے کہا۔ چچی جان میں معظم علی ہوں۔

عابدہ پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فرحت نے جلدی سے دوسری چارپائی کا میلا کچیلا بستر لپیٹ کر ایک طرف پھینک دیا اور کہا بیٹھ جائیے۔

معظم علی نے آگے بڑھ کر عابدہ کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ چچی جان آپ کو بہت تیز بخار ہے۔ میں ابھی طبیب کو بلواتا ہوں۔ پھر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور عابدہ کے قریب دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ عابدہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ معظم علی نے فرحت سے سوال کیا۔ چچی جان کب سے بیمار ہیں؟

فرحت نے جواب دیا۔ ابا جان کی وفات کے بعد ان کی صحت اکثر خراب رہتی تھی۔ پچھلے مہینے ان کی حالت بہت اچھی ہو گئی تھی لیکن اب کوئی دو ہفتے سے پھر بخار رہتا ہے۔

معظم علی نے کہا۔ چچی جان یہ کوٹھڑی آپ کے لیے ٹھیک نہیں۔ آپ چل سکیں گی یا میرے نوکر آپ کی چارپائی اٹھا کر لے جائیں۔

عابدہ نے کہا۔ بیٹا مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟

میں آپ کو دوسرے کمرے میں لے جانا چاہتا ہوں آپ کو تازہ ہوا اور روشنی کی ضرورت ہے۔

عابدہ نے جواب دیا۔ بیٹا تم کیوں تکلیف اٹھاتے ہو۔ مجھے یہیں پڑا رہنے دو

۔معظم علی نے کہا۔ چچی جان میں آپ کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہاں نہیں رہنے دوں آپ کچھ دیر بالا خانے میں قیام کریں۔ اس کے بعد شام سے پہلے شہر میں آپ کے لیے بہترین مکان کا بندوبست کر دوں گا۔ میں نے شہر کے بہترین طبیب کے پاس آدمی بھیج دیا ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک پہنچ جائے گا میں یہ چاہتا ہوں کہ طبیب کی آمدی سے پہلے پہلے آپ کو دوسرے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔ میں آدمیوں کو بلاتا ہوں۔ معظم علی اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن عابدہ نے کہا بیٹا آدمیوں کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ میں چل سکتی ہوں لیکن تم تکلیف کیوں اٹھاتے ہو۔

معظم علی نے کہا۔ میرے لیے اس سے بڑی تکلیف اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ

اس تنگ وتاریک کوٹھری میں پڑی ہوئی ہیں۔فرحت اٹھواوراپنی امی جان کوسہارا دے کربالاخانے پرلے چلو۔

عابدہ نے کہا۔بہت اچھابیٹا۔لیکن ہم شہرنہیں جائیں گے۔

فرحت نے کہا۔اگرآپ ہمیں اس لیے شہربھیجناچاہتے ہیں کہ ہمیں بالاخانے پررہنے سے آپ کے دوستوں اورمہمانوں کوتکلیف ہوگی توہمیں یہیں پڑارہنے دیں۔

معظم علی نے جواب دیا۔مجھے صرف آپ کی تکلیف کاخیال تھالیکن اگرآپ بالاخانے میں رہناپسندکریں تومیراکوئی دوست یامہمان آپ کی اجازت کے بغیر اس حویلی میں داخل نہیں ہوگا۔

O

تھوڑی دیربعد عابدہ بالاخانے کے ایک کشادہ کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ فرحت اس کی چارپائی پرپائینتی کی طرف بیٹھی ہوئی تھی۔اورمعظم علی ان کے قریب ایک کرسی پربیٹھاہواتھا۔عابدہ کے سوالات کے جواب میں معظم علی نے مختصراًاپنی قید،رہائی اورسفرکے واقعات بیان کیےاوراس کے بعدعابدہ سے اپنی سرگزشت سنانےکوکہا۔

عابدہ نے جواب میں اپنے مصائب کی داستان شروع کرتے ہوئے کہا۔بیٹا تمہاری گرفتاری کے بعدہمارے دل میں یہ خدشہ پیداہوگیاتھاکہ میرمیرن کسی نہ کسی بہانے ہماری عزت پرہاتھ ڈالنےکی کوشش کرے گا۔محلے کےلوگوں کی بھی یہی رائے تھی کہ ہم فوراًمرشدآبادسے نکل جائیں۔اگلے ہفتے ہم نے قافلے کے ساتھ مرشدآبادسے ہجرت کی۔شہرکے دروازے پرمیرجعفرکےسپاہیوں نے ہماری تلاشی

لی اور ہمارے پاس جو کچھ تھا وہ ہم سے چھین لیا۔ راستے میں فرحت کے ابا جان بیمار ہو گئے۔ چند دن وہ بیماری کی حالت میں قافلے کا ساتھ دیتے رہے لیکن اس کے بعد ان کی حالت زیادہ خراب وہ گئی۔ ہمارے ساتھ آگرے کا ایک نیک دل تاجر تھا۔ وہ ہمارا بہت خیال رکھتا تھا۔ جب ہمیں مجبوری کی حالت میں ایک بستی میں رُکنا پڑا تو اس تاجر نے چند روپے فرحت کے ابا جان کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ آپ کو لکھنوء پہنچنے کے لیے ان کی ضرورت پڑے گی۔ اس لیے اسے قبول فرمائیں۔ فرحت کے ابا جان نے اس کے اصرار پر روپے لے لیے۔ رخصت ہوتے وقت اس نے بستی کے زمیندار کو ہمارے متعلق بہت تاکید کی۔ زمیندار بھی کوئی نیک آدمی تھا اور اس نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ فرحت کے ابا جان کی وفات کے بعد جب ایک اور قافلہ اس بستی سے گزرا تو ہم اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ دو نوکر ابھی تک ہمارے ساتھ تھے۔ ہمارا قافلہ رات کے وقت لکھنوء کے قریب پہنچا اور بہت سے آدمیوں نے شہر میں جانے کی بجائے اس سرائے میں قیام کیا۔ ہم بھی یہیں ٹھہر گئے۔ یہاں رات گزارنے کے بعد صبح ہم نے شہر جا کر اپنے رشتہ داروں کا پتہ کیا لیکن ہمیں یہ معلوم ہوا کہ وہ حیدرآباد جا چکے ہیں۔ ہم سارا دن شہر گھومتے رہے لیکن کسی نے ہمارے حال پر توجہ نہ دی۔ شام کے وقت ہم پھر اسی سرائے میں واپس آ گئے۔

اگلے روز میں نے ایک نوکر کو اپنے رشتہ داروں کے نام خط دے کر حیدرآباد روانہ کیا لیکن اس کا آج تک پتہ نہیں چلا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا۔

ہمیں یقین تھا کہ حیدرآباد اطلاع پہنچتے ہی ہمارا کوئی نہ کوئی رشتہ دار ہماری مدد کے لیے پہنچ جائے گا۔ لیکن آج تک ہم ان کی راہ دیکھتے رہے۔ ایک ماہ بعد جب ہماری پونجی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ہمارا دوسرا نوکر کہیں بھاگ گیا۔ ایک دن سرائے

کے مالک نے ہمیں اطلاع دی کہ چند آدمی حیدر آباد جا رہے ہیں اگر آپ اپنے رشتہ داروں کو کوئی خط بھیجا چاہیں تو وہ پہنچا دیں گے۔ میں نے خط لکھ کر ان کے حوالے کیا لیکن دو ماہ گزر گئے اور اس کا کوئی جواب نہ آیا اور میں یہ سمجھنے لگی کہ اب زمانے کی نگاہیں بدل گئی ہیں اور ہمارے رشتہ داروں نے جان بوجھ کر ہماری طرف توجہ نہیں کی۔اس کے بعد میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ میں اس حالت میں ان کے پاس جاؤں۔

پھر ایک دن مجھے یہ خیال آیا کہ شاید انہیں میرا کوئی پیغام نہ ملا ہو اور میں حیدر آباد جانے کے لیے تیار ہو گئی لیکن لکھنوء سے قافلے کی روانگی سے دو دن قبل مجھے بخار ہو گیا اور مجھے سفر کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔پھر مجھے یہ خیال آتا تھا کہ اگر میرے رشتہ داروں کو میری طرف سے کوئی پیغام نہ ملا ہو تو بھی ان کا فرض تھا کہ وہ مرشد آباد جا کر ہمارا پتہ کرتے۔اس کے بعد انہیں یقیناً یہ معلوم ہوتا کہ ہم لکھنوء چلے گئے ہیں ۔میں یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب میں خدا کے سوا کسی کی مدد نہیں تلاش کروں گی۔ سرائے کے مالک ہمارے حال پر بہت مہربان تھا۔اس کی بیوی بھی بہت رحم دل تھی ۔وہ ہمارے لیے اس بستی اور کبھی کبھی شہر کی عورتوں سے بھی سلائی کا کام لے آتی تھی ۔جب وہ سرائے بیچ کر چلا گیا تو ہمیں بہت صدمہ ہوا۔لیکن سرائے کا نیا مالک بھی ہمارا بہت خیال رکھتا تھا کئی مہینوں سے یہ سرائے بالکل ویران تھی اور ہمیں یہاں وحشت ہوتی تھی لیکن اس بستی کے لوگ بہت شریف ہیں اور ان کا سلوک دیکھ کر میں نے شہر میں اپنے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

معظم علی نے کہا۔چچی جان مجھے صرف یہ شکایت ہے کہ فرحت نے جان بوجھ کر مجھے اپنا پتہ نہیں دیا۔اسے معلوم تھا کہ میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔

عابدہ نے جواب دیا۔بیٹا مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ تم یہاں ہو اور فرحت کو اس بات کا ڈر تھا کہ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر تمہیں تکلیف ہوگی اور شاید تم ہمیں پہچان نہ سکو۔

اتنے میں صابر نے دروازے کے پاس آکر آواز دی۔جناب! حکیم صاحب تشریف لے آئے۔

انہیں اوپر لے آؤ! معظم علی نے کہا۔

فرحت جلدی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ایک عمر رسیدہ طبیب کمرے میں داخل ہوا۔معظم علی نے اس کے لیے اپنی کرسی خالی کردی۔طبیب نے عابدہ کی نبض دیکھی اواس سے چند سوال پوچھنے کے بعد معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔میں جا کر ابھی دوا بھیجتا ہوں۔امید ہے کہ کل تک بخار ٹوٹ جائے گا اور اگر کچھ افاقہ نہ ہوا تو میں انہیں کل شام دوبارہ آکر دیکھوں گا۔

معظم علی نے کہا میں یہ چاہتا ہوں کہ جب تک یہ تندرست نہیں ہوتیں۔آپ ہر روز کم از کم دو بار انہیں دیکھنے کے لیے ضرور تشریف لایا کریں۔میں دونوں وقت آپ کے لیے گھوڑا بھیج دیا کروں گا۔

طبیب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔بہت اچھا میں شام کو پھر آؤں گا۔

معظم علی اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا اور صابر سے جو دروازے کے باہر کھڑا تھا، مخاطب ہو کر بولا۔صابر، دلاور خاں سے کہو کہ حکیم صاحب کے ساتھ جا کر دوا لے آئے۔پھر اس نے اپنی جیب سے چند سکے نکال کر طبیب کو پیش کرتے ہوئے کہا یہ قبول فرمائیے۔

طبیب نے جواب دیا۔نہیں! میں مریضہ کے تندرست ہونے سے پہلے کوئی

معاوضہ نہیں لوں گا۔

معظم علی نے کہا۔حکیم صاحب یہ علاج کا معاوضہ نہیں ۔یہ شہر سے یہاں تک آنے کی تکلیف کا صلہ ہے ۔ لیجئے ۔ جب مریضہ تندرست ہو جائے گی تو میں جی کھول کر آپ کی خدمت کروں گا۔

معظم علی کے اصرار پر طبیب نے چند سکے اس کے ہاتھ سے لے کر دیکھے بغیر اپنی جیب میں ڈال لیے لیکن حویلی سے باہر نکل کر اس نے جیب سے چاندی اور سونے کے سکتے نکال کر دیکھتے ہوئے دلاور خاں سے کہا۔تمہارا مالک بہت امیر آدمی معلوم ہوتا ہے۔

دلاور خاں نے فخر سے جواب دیا۔جناب میرا مالک بادشاہ ہے۔

لیکن وہ عورت تو بہت غریب معلوم ہوتی تھی؟

دلاور خاں نے جواب دیا۔جناب جب آپ دوسری دفعہ تشریف لائیں گے تو وہ آپ کو غریب نہیں معلوم ہو گی ۔خاں صاحب نے بالا خانے کے کمرے انہیں دے دیئے ہیں اور خود نیچے آ گئے ہیں ۔

دلاور خاں کا قیاس صحیح تھا۔جب شام کے وقت طبیب دوبارہ عابدہ کو دیکھنے آیا تو اس کا کمرہ قیمتی سازو سامان سے آراستہ تھا ۔مریضہ بوسیدہ لباس کی بجائے نیا لباس پہنے ایک خوبصورت پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی ۔طبیب نے نبض پر ہاتھ رکھتے ہوے کہا ۔ بخار بہت کم ہو چکا ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ یہ میری توقع سے پہلے تندرست ہو جائیں گی ۔

اگلے دن عابدہ کا بخار اتر چکا تھا اور وہ قدرے بشاش معلوم ہوتی تھی ۔ تیسرے اسے پھر بخار آ گیا لیکن شدت نسبتاً کم تھی ۔پانچویں روز طبیب نے اعلان

کیا کہ اب انہیں انشاءاللہ بخار نہیں ہو گا۔

○

بالا خانے کے تمام کمرے فرحت اور اس کی ماں کے لیے وقف تھے اور معظم علی نچلی منزل کے ایک کمرے میں آ گیا تھا۔ جب تک عابدہ بیمار تھی وہ ہر روز متعدد بار اس کے کمرے میں حاضری دیا کرتا تھا لیکن عابدہ کے تندرست ہونے کے بعد اس کے طرزِ عمل میں تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ کسی معقول وجہ کے بغیر بالا خانے پر جاتے ہوئے جھجک محسوس کرتا تھا۔ کبھی فرحت کی ماں بلاتی تو چلا جاتا اور اندر داخل ہونے سے پہلے دروازے پر دستک دیتا۔ فرحت جو پہلے اپنی ماں کی موجودگی میں بے تکلفی سے اس کے ساتھ باتیں کرتی تھی اب اس کی آواز سنتے ہی دوسرے کمرے میں چلی جاتی۔ معظم علی کے نوکروں میں صابر کے سوا کسی کو اوپر آنے جانے کی اجازت نہ تھی

۔

ایک شام صابر کھانا لایا تو معظم علی کو معمول سے زیادہ لذیذ معلوم ہوا۔ اس نے کہا صابر آج کیا ڈالا ہے تم نے سالن میں؟

صابر نے بدحواس ہو کر جواب دیا۔ جی میں بے قصور ہوں۔ میں نے کچھ نہیں ڈالا۔ یہ سالن چھوٹی بی بی نے پکایا ہے اور میں نے تو چکھا بھی نہیں۔ صبح جب وہ اوپر کھانا لے کر گیا تو وہ بہت خفا ہوئیں اور کہنے لگیں۔ آج شام ہنڈیا میں خود پکاؤں گی۔ میں نے انہیں سمجھایا تھا کہ میرے سوا کسی کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں کرتے لیکن وہ کہتی تھیں۔ وہ کہتی ـــــــــــ

کیا کہتی تھیں وہ؟

کچھ نہیں، جی، وہ کہتی تھیں کہ تم گوشت کو دال سے بدتر بنا دیتے ہو۔

معظم علی مسکرایا۔صابر وہ بالکل درست کہتی تھیں۔میں آج کئی دنوں کے بعد پیٹ بھر کر کھا رہا ہوں لیکن انہیں تکلیف دینا ٹھیک نہیں۔

جی میں نے کہا تھا کہ آپ خفا ہوں گے لیکن انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔اوپر باورچی خانہ نہیں ہے وہ اصرار کرتی تھیں کہ آپ نیچے باورچی خانے کے سامنے پردے کے لیے دیوار بنوا دیں۔

معظم علی نے کہا۔ان سے کہنا میں بہت جلد دیوار بنوا دوں گا اور انہیں نیچے آنے میں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ ہمارے لیے کھانا پکائیں۔وہ اگر چاہیں تو باورچی خانے میں آ کر تمہاری دیکھ بھال کر سکتی ہیں۔

میری دیکھ بھال؟ صابر نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

معظم علی نے جواب دیا۔میرا مطلب ہے کہ تم کھانا پکانے کے متعلق ان کی ہدایات لے سکو گے اور ہو سکتا ہے کہ تم بھی انہیں کچھ سکھا سکو۔

صابر کو کھانا پکانے کے مسئلے میں کسی کی نکتہ چینی یا مداخلت پسند نہ تھی۔اگر یہ مداخلت فرحت کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو وہ یقیناً شدید احتجاج کرتا۔ تاہم اس نے کہا جناب یہ کھانا واقعی لذیز ہے یہ آپ مجھے بیوقوف بنا رہے ہیں۔

معظم علی نے ہنستے ہوئے کہا۔صابر تم بہت ہی سادہ دل ہو۔

صابر نے کہا۔جناب وہ بھی یہی کہتی تھیں۔

کون؟

چھوٹی بی بی جی۔وہ تو یہ بھی کہتی تھیں کہ میرا دماغ بالکل خالی ہے۔

چند دن بعد نچلی منزل کے کمروں اور باورچی خانے کے سامنے پردے کے لیے دیوار تعمیر ہو چکی تھی اور مہمانوں کے لیے حویلی کے اندر صدر دروازے کے

قریب تین کئی کمروں کی بنیادیں کھودی جارہی تھیں۔

○

گھوڑوں کی تجارت شروع سے پہلے معظم علی یہ محسوس کرتا تھا کہ اسے اپنے دل سے تنہائی اور بے کسی کا احساس دور کرنے کے لیے کسی مصروفیت کی ضرورت ہے لیکن فرحت کو تلاش کر لینے کے بعد وہ حوصلوں، ولولوں، امیدوں اور آرزوؤں کی ایک نئی دنیا میں آچکا تھا۔وہ ایک کامیاب تاجر کی حیثیت میں اپنی ذات کو دوسروں کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنانا چاہتا تھا۔

ایک شام وہ گھوڑے پر سیر کرنے کے بعد واپس آیا تو حویلی میں چند گاڑیاں کھڑی تھیں۔

یہ کیا ہے۔اس نے گھوڑے سے اتر کر ایک نوکر سے سوال کیا۔

نوکر نے جواب دیا۔ جناب شیر علی خاں واپس آ گئے ہیں۔

میں پوچھتا ہوں۔یہ گاڑی کہاں سے آئی ہیں اور شیر علی کہاں ہیں؟

شیر علی ایک گاڑی کی آڑ سے نمودار ہوا اور اس نے بڑھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ گاڑیاں آپ کی ہیں۔ میں بنارس سے گھوڑوں کی قیمت وصول کر کے کپڑا خرید لایا ہوں۔لکھنوء میں بنارسی کپڑے کی بڑی مانگ ہے۔انشاء اللہ ہمیں بہت فائدہ ہوگا۔

معظم علی نے کہا۔ واہ جی، اب آپ گھوڑوں کے بعد مجھ سے کپڑوں کی تجارت بھی کروانا چاہتے ہیں۔

شیر علی نے جواب دیا۔اگر بنارس گھوڑے مل سکتے تو میں کپڑا نہ لاتا۔

اور اگر کپڑا نہ ملتا تو آپ کیا لاتے؟

کپڑا کیوں نہ ملتا۔آپ دیکھیں تو سہی۔

معظم علی نے کہا۔میں میسور سے ہاتھی لانے کے متعلق سوچ رہا تھا اور آپ بنارس سے کپڑا اٹھالائے ہیں۔

شیر علی نے اطمینان سے کہا۔میں آپ کو بتاؤں میں نے کپڑا کیوں خریدا؟

مجھے کیا معلوم؟

مجھے یہ ڈر تھا کہ آپ کہیں کاروبار جاری رکھنے کا ارادہ نہ بدل دیں او اس کپڑے کے متعلق آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔یہ انشاءاللہ دو چار دن کے اندر اندر بک جائے گا اور ہمیں کافی نفع ہوگا۔

لیکن یہاں اسے خریدے گا کون؟

آپ دیکھتے رہیں۔مجھے یقین ہے کہ یہ حویلی لکھنو کی ایک اہم منڈی بن جائے گی۔

معظم علی نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔مرزا صاحب کی بیوی اور صاحبزادی مل گئی ہیں۔

مبارک ہو مبارک ہو! کہاں ملیں؟

آپ کو یقین نہیں آئے گا وہ اسی حویلی کی ایک کوٹھری میں رہتی تھیں۔

اب وہ کہاں ہیں؟

میں نے بالا خانہ انہیں دے دیا ہے۔

اگلے روز حویلی میں شہر کے پارچہ فروشوں کا ایک ہجوم کھڑا تھا اور ایک دلال کپڑوں کے تھان نیلام کر رہا تھا۔

معظم علی نے ایک خوش رنگ ریشمی کپڑے کے دو تھان نکال کر صابر کو دیتے

ہوئے کہا۔صابر او پر دے آؤ۔اس کے بعد اس نے چند اور تھان نکال کر دلاور خاں کو دیتے ہوئے کہا۔دلاور خاں یہ کپڑا گاؤں کے چودھری کے گھر لے جاؤ اور ان سے کہو کہ وہ اسے بستی کے غریب اور مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیں۔

تین دن کے اندر اندر کئی معظم علی کا سارا مال فروخت ہو چکا تھا۔اور شیر علی خاں اسے حساب دکھانے کے بعد کہہ رہا تھا۔کیوں جی کیسی رہی ہماری یہ تجارت اگر ہم اطمینان سے یہ مال فروخت کرتے تو اس سے دوگنا نفع ہوتا۔اب بھی دس فیصد ی نفع معمولی نہیں اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟

معظم علی نے جواب دیا۔میں نے فخر الدین کو لکھ دیا ہے کہ دوسو گھوڑے خرید کر یہاں روانہ کر دیں۔اس کے بعد میرا ارادہ ہے کہ ہم میسور سے ہاتھی،صندل اور گرم مصالحہ خرید کر لائیں۔پہلے میرا خیال تھا کہ اکبر خاں آئے تو ہم اسے آپ کے ساتھ حیدر آباد بھیجوں لیکن پھر یہ سوچا کہ اس طرح دیر ہو جائے گی۔

شیر علی نے کہا۔اگر آپ اجازت دیں تو میں حیدر آباد سے گھوڑوں کے آنے سے پہلے بنارس کا ایک چکر لگا آؤں؟

معظم علی نے جواب دیا۔مجھے یقین ہے کہ یہ کپڑوں کا مسئلہ ہمیں بہت پریشان کرگا۔کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ چند دن آرام کریں۔اس عمر میں آپ کے لیے زیادہ کام کرنا ٹھیک نہیں

شیر علی نے جواب دیا۔مصروفیت میرے لیے سب سے بڑا آرام ہے میں صرف بیکار بیٹھ کر تھکاوٹ محسوس کرتا ہوں۔

○

معظم علی کا کاروبار آئے دن پھیلتا جا رہا تھا۔وہ سارا دن کاروبار کی دیکھ بھال

میں مصروف رہتا۔ اسے پڑھنے کا بھی شوق تھا اور دفتری کاغذات کے علاوہ کتابیں بھی اس کے کمرے میں انتہائی بے ترتیبی کی حالت میں پڑی رہتی تھیں۔ کسی نوکر کو کوئی کاغذ یا کتاب ایک جگہ سے دوسری جگہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ کبھی کبھی اسے فرصت ملتی تو وہ اپنی موجودگی میں نوکروں کو صفائی کا حکم دیتا لیکن چند دن بعد پھر وہی حالت ہو جاتی۔

ایک رات، دن بھر کے کام سے فارغ ہو کر معظم علی اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اسے کمرے کی ہر چیز اپنی توقع کے ساتھ کے خلاف دکھائی دی۔ کتابیں الماریوں میں بند تھیں۔ کاغذات ایک ترتیب کے ساتھ میز پر رکھے ہوئے تھے۔ بستر کی چادر اور تکیے کا غلاف تبدیل ہو چکا تھا اور تمام غیر ضروری چیزیں کمرے سے غائب تھے معظم علی نے صابر کو آواز دی اور اپنے کاغذات اور کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ صابر نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ جناب میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے چھوٹی بی بی کو منع کیا تھا لیکن وہ کہتی تھیں کہ تم بالکل جانور ہو۔ میری بڑی بے عزتی ہوئی۔ چھوٹی بی بی کہتی تھیں کہ تمہیں کوئی سلیقہ نہیں آتا اور تم نے کسی اصطبل میں پرورش پائی ہے۔ میں نے کہا سرکار خفا ہوں گے لیکن انہوں نے کہا تم جاؤ میں خود صفائی کروں گی اور ہم تمہارے سرکار سے بالکل نہیں ڈرتے۔

معظم علی نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ اچھا جاؤ میرا کھانا لے آؤ۔ اور جب وہ تھوڑی دیر بعد کھانا لے آیا تو معظم علی نے اس کی طرف شرارت آمیز تبسم کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا۔ اچھا صابر کیا کہتی تھیں چھوٹی بی بی تمہیں؟

جی وہ کہتی تھیں کہ تم بالکل جانور ہو اور تم نے اصطبل میں پرورش پائی ہے۔

جیسے میں کوئی گھوڑا ہوں اور جناب انہوں نے آپ کے متعلق بھی بہت کچھ کہا تھا۔

کیا کہا تھا۔

میں نہیں بتاؤں گا۔آپ خفا ہو جائیں گے۔

نہیں۔نہیں بتاؤ!

جی وہ کہتی تھیں یہ رہنے کا کمرہ ہے یا کسی کباڑی کی دکان ہے۔

اگلی صبح اپنے کمرے سے نکلتے وقت معظم علی کو شرارت سوجھی اور اس نے چند کتابیں الماری سے نکال کر بستر پر پھینک دیں۔پھر میز سے چند کاغذ اٹھائے اور اِدھر اُدھر بکھیر دیئے لیکن جب وہ واپس آیا تو کمرہ اس طرح سجا ہوا تھا۔

اس کے بعد وہ ہر روز یہ محسوس کرتا کہ فرحت س کی غیر حاضری میں اس کے کمرے کا معائنہ کرتی ہے لیکن ایک شام وہ شہر کے کسی تاجر سے کوئی معاہدہ کرنے کے بعد واپس آیا تو اس کے کمرے میں کاغذات کے پرزے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔بستر کی چارمیں سلوٹیں تھیں اور ایک کتاب جورات کو اس نے پڑھنے کے لیے نکالی تھی تکیے کے پاس اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔

صابر نے آکر کہا۔جناب کھانا لاؤں؟

معظم علی نے جواب دیا۔نہیں۔پہلے یہ بتاؤ چھوٹی بی بی آج باورچی خانے میں آئی تھیں؟

نہیں جی آج وہ سارا دن نیچے نہیں اتریں۔صبح میں کھانا لے کر گیا تھا تو وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھیں۔بڑی بی بی کہتی تھیں انہیں بخار ہے۔

معظم علی نے کہا۔جاؤ دلاور خاں سے کہو فوراً طبیب کو لے آئے۔نہیں ٹھہرو میں خود جاتا ہوں۔

قریباً ایک گھنٹہ بعد، معظم علی بالا خانے کے ایک کمرے کے پاس جا کر آواز دی۔ چچی جان! حکیم صاحب آئے ہیں!

اندر سے آواز آئی۔ حکیم صاحب؟! اچھا انہیں لے آؤ۔

معظم علی کے اشارے پر طبیب کمرے میں داخل ہوا اور وہ خود تذبذب کی حالت میں دروازے سے باہر کھڑا رہا۔

عابدہ نے آواز دی۔ معظم علی! بیٹا اندر آ جاؤ باہر کیوں کھڑے ہو!

معظم علی نے کمرے میں داخل ہوا۔ فرحت چادر میں اپنا منہ چھپائے بستر پر لیتی ہوئی تھی، معظم علی نے ایک کرسی اٹھا کر فرحت کی چارپائی کے قریب رکھتے ہوئے طبیب کو بیٹھنے کے لیے کہا۔

طبیب نے فرحت کی نبض دیکھی اور معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ بخار بالکل معمولی ہے۔ انشاءاللہ بہت جلد اتر جائے گا۔

پھر اس نے اپنی جیب سے چاندی کی ایک چھوٹی سے ڈبیا نکالی اور اس میں سے چار گولیاں نکال کر معظم علی کو دیتے ہوئے کہا۔ ان میں سے دو گولیاں اسی وقت کھلا دیجئے۔ اور آدھی رات کے وقت۔ صبح تک اگر بخار نہ اترا تو اپان نوکر میرے پاس بھیج دیجئے گا۔

تھوڑی دیر بعد حویلی کے دروازے پر طبیب کو رخصت کرتے ہوئے معظم علی نے کہا۔ حکیم صاحب مریضہ کے متعلق کوئی تشویش کی بات تو نہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔

طبیب نے جواب دیا۔ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔

رات کو دیر تک معظم علی کو نیند نہ آئی۔ صبح نماز کے بعد اس نے اوپر جا کر دستک دی۔ فرحت کی ماں نے دروازے پر آ کر پوچھا کون ہے؟

میں ہوں چچی جان! فرحت کی طبیعت کیسی ہے؟

عابدہ نے دروازہ کھول کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔

بیٹا فرحت اب بالکل ٹھیک ہے۔ تم نے رات کو خواہ مخواہ تکلیف اٹھائی۔

چچی جان ـــــــ معظم علی نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

ہاں بیٹا!

میں ـــــــــــ

ہاں بیٹا!

کچھ نہیں چچی جان۔ میں بہت پریشان تھا۔ معظم علی یہ کہہ کر نیچے اتر آیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے میز کے سامنے بیٹھ کر قلم اٹھایا اور کاغذ پر کچھ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ چند سطریں لکھنے کے بعد اس نے کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا۔ پھر دوسرے کاغذ پر لکھنا شروع کیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کاغذ لپیٹ کر اس کے اوپر ریشم کا دھاگہ باندھتے ہوئے کہا۔ صابر! یہ چچی جان کو دے آؤ۔ دیکھو کہیں چھوٹی بی بی کے ہاتھ میں نہ دے دینا ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ وہ بہت گالیاں دیں گی تمہیں۔

نہیں جی میں کوئی بیوقوف تھوڑا ہوں۔

اور دیکھو جواب کے لیے دروازے کے باہر ٹھہر کر انتظار کرنا!

اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے کورا کاغذ اور قلم دوات ساتھ لے کر جانا چاہیے۔

نہیں نہیں جاؤ۔

صابر کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے بولا۔ جناب اٹھیے بڑی بی بی آپ کو اوپر بلا رہی ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ انہیں تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے ابھی ناشتا نہیں کیا ہے۔ میں جواب لے جاتا ہوں لیکن انہوں نے الٹا مجھے پر ہنسا شروع کر دیا اور چھوٹی بی بی کہہ رہی تھیں یہ بالکل جانور ہے۔

تم نے چھوٹی بی بی کو تو خط نہیں دے دیا؟

نہیں جی۔ اب آپ مجھے جانور سمجھنے لگ گئے ہیں کیا؟ میں نے اپنی طرف سے بہت احتیاط کی تھی لیکن بری بی بی نے خط پڑھنے کے بعد انہیں دکھا دیا۔ میں نے بہت کہا یہ خط چھوٹی بی بی کو نہ دکھایئے لیکن آج وہ بھی مجھ پر ہنس رہی تھیں۔

معظم علی نے کمرے سے نکل کر بالا خانے پر پہنچا تو فرحت کی ماں دروازے میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ حیا کے مارے معظم علی کے گال اور کان سرخ ہو رہے تھے۔

عابدہ نے کہا۔ آؤ بیٹا اندر آ جاؤ۔

معظم علی جھجکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

عابدہ نے کہا۔ فرحت دوسرے کمرے میں ہے۔ بیٹھ جاؤ۔ اور وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ عابدہ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیئے اور آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ بیٹا! فرحت تمہاری ہے۔ وہ ہمیشہ تمہاری تھی۔ میرے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں کئی دنوں سے تمھارے پیغام کا انتظار کر رہی تھی۔ کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا تھا کہ زمانہ ہمیں ٹھکرا چکا ہے۔ میں سوچا کرتی تھی

کہ تم لکھنوء کے بڑے سے بڑے خاندان سے رشتہ حاصل کر سکتے ہو۔

چچی جان! معظم علی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ مجھے صرف یہ ڈر تھا کہ اگر میں نے جلد بازی سے کام لیا تو آپ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ آج بھی جب میں خط لکھ رہا تھا تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

آٹھویں روز لکھنوء کے بڑے بڑے گھرانوں میں یہ چرچا ہو رہا تھا کہ ایک لاکھ پتی نوجوان نے اس بے سہارا لڑکی سے شادی کر لی ہے جو اپنی بیوہ ماں کے ساتھ شہر سے باہر ایک بستی کے سرائے میں انتہائی مفلسی اور بے بسی کے دن گزار رہی تھی۔

فرحت رات کے وقت دلہن کا لباس پہنے بستی کی عورتوں کے ہجوم میں بالا خانے کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ معظم علی دعوت ولیمہ پر جمع ہونے والے مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف تھا۔ جب بستی کی عورتیں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں تو فرحت کرسی گھسیٹ کر باہر کی طرف کھلنے والے دریچے کے سامنے بیٹھ گئی۔ افق سے چاند نمودار ہو رہا تھا۔ فرحت نے اٹھ کر آہستہ سے درمیان کا دروازہ کھول کر ساتھ والے کمرے میں جھانکا۔ عابدہ کے کمرے کا چراغ بجھ چکا تھا۔ امی جان! اس نے آہستہ سے آواز دی لیکن جب ماں کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ چاند اب بادل کے ایک سیاہ ٹکڑے کے پیچھے روپوش ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں بادل گزر گیا اور چاند کی دلفریب کرنیں پھر ایک بار فضا میں نور کے خزانے بکھیر رہی تھیں۔ دروازے کی طرف سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ فرحت نے مڑ کر دیکھا۔ معظم اس کے سپنوں کا شہزادہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ فرحت کی نگاہیں جھک گئیں۔

معظم علی نے ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔فرحت میں تصور میں تمہاری ہزاروں تصویریں دیکھ چکا ہوں لیکن تم ان سب سے زیادہ حسین ہو۔

فرحت نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔

معظم علی مسکرایا۔تمہارے ہاتھ بھی خوبصورت ہیں۔

فرحت نے جلدی سے چہرے پر آنچل ڈال لیا اور اپنے ہاتھ اوڑھنی کے اندر چھپالیے۔

معظم علی نے دریچے سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔فرحت اِدھر دیکھو چاند پر بادل آگیا ہے لیکن اس کی رعنائی اور دلکشی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جب میں میر حبیب کی قید میں تھا۔تو اپنی کوٹھڑی کے دروازے کی دراڑوں سے کبھی کبھی چاند کی جھلک دیکھا کرتا تھا اور یہ سوچا کرتا تھا کہ شاید اس وقت تم بھی اپنے محل کے کسی دریچے میں کھڑی ہوکر چاند کی طرف دیکھ رہی ہوگی۔پھر قید سے نکلنے کے بعد جب مجھے معلوم ہوا کہ اب زندگی میں ہمارے راستے ایک دوسرے سے مختلف ہو چکے ہیں تو میں نے چاند ستاروں کی طرف دیکھنا ترک کر دیا تھا۔لیکن تم میری نگاہوں سے کبھی اوجھل نہ ہوسکیں۔معظم علی نے یہ کہہ کر اس کے چہرے سے نقاب اتار دیا۔

فرحت مسکرا رہی تھی لیکن اس کے خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

معظم علی نے کہا۔فرحت تمہیں وہ دن یاد ہے جب میں تمہارے کتب خانے میں کھڑا تھا اور تم مجھے دیکھ کر بدحواس ہوگئی تھیں اور پھر جب مرہٹوں نے تمہارے محل پر حملہ کیا تھا اور میں تم پر برس پڑا تھا لیکن تم اس وقت بہت چھوٹی تھیں۔

فرحت نے جواب دیا۔یہ یادیں میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔

معظم علی کا چہرہ اچانک مغموم ہو گیا اور وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔فرحت نے چند بار نظر بچا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔آپ کیا سوچ رہے ہیں؟

کچھ نہیں معظم علی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

آپ پریشان ہیں۔فرحت نے کہا۔

معظم علی نے جواب دیا۔پریشانیاں ہماری میراث ہیں۔فرحت جب میں بنگال کی فوج میں ملازم ہوا تھا اور اپنی تنخواہ کو بیشتر حصہ مفلس اور نادار لوگوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ اگر تم اپنی کمائی اسی طرح لٹاتے رہو گے تو اپنی بیوی کو حق مہر میں کیا دو گے۔میں نے جواب دیا کہ میری رفیقہ حیات کا مہر ایک ایسا ملک ہو گا جو اندرونی اور بیرونی خطرات سے آزاد ہو گا۔فرحت وہ تلواریں جو میں نے اپنے وطن کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے اٹھائی تھی۔اب ٹوٹ چکی ہے۔اب اس ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے باشندے اپنی آئندہ نسلوں کو یہ پیغام دینے کے قابل ہوں کہ تمہاری عزت اور آزادی محفوظ ہے۔ہم تاریک رات کے مسافر ہیں اور خدا معلوم ہماری آخری منزل کیا ہو گی۔مجھے اس موقع پر تم سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہییں لیکن کاش میں تمہیں مستقبل کے متعلق کوئی حوصلہ افزا پیغام دے سکتا۔فرحت فرض کرو اگر میں تم سے کہوں کہ میں اس وقت یا چند گھنٹے کے اندر اندر مرہٹوں کے خلاف ایک بڑی جنگ میں حصہ لینے کے لیے جا رہا ہوں تو تم کیا محسوس کرو گی؟

فرحت نے جواب دیا۔میں؟ میں یہ کہوں گی کہ مرزا حسین بیگ کی بیٹی اور آصف اور افضل کی بہن ہوں۔میرے شوہر کو یہ خیال کیسے آیا کہ میں اسے قوم کے دشمنوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے سے منع کروں گی۔

معظم علی نے کہا۔فرحت مجھے تم پر فخر ہے۔

فرحت مسکرا رہی تھی اور معظم علی کو اس کی مسکراہٹ کا ایک ایک لمحہ ماضی کے مہینوں اور برسوں پر حاوی معلوم ہوتا تھا۔وہ میدان جنگ کی کلفتیں اور قید و بند کی اذیتیں بھول چکا تھا۔مستقبل کے افق پر اٹھنے والی تاریک گھٹائیں اس کی نظروں سے اوجھل تھیں۔اس کے سامنے صرف حال تھا۔اس کی کائنات سمٹ کر اس کے کمرے کی چار دیواری تک محدود ہو رہی تھی۔جس کا ہر گوشہ فرحت کی مسکراہٹوں سے منور تھا اور اس کمرے سے باہر کی دنیا اور مستقبل کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں۔

فرحت نے کہا۔میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔

پوچھیے!

لیکن میں نہیں پوچھتی۔آپ برا مانیں گے۔

خدا کے لیے ضرور پوچھیے ورنہ مجھے بہت پریشانی ہوگی۔

اچھا یہ بتائیے کہ اس لڑکی کا نام کیا تھا؟

کونسی لڑکی؟

وہ جو آپ کو حیدر آباد کے راستے میں ملی تھی۔

شیخ فخر الدین کی بھانجی؟اس کا نام بلقیس تھا۔

فرحت نے اپنے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔نہیں جناب میں بڑی صاحبزادی کے متعلق پوچھتی ہوں۔

اس کا نام عطیہ تھا لیکن تمہیں اس وقت اس کا خیال کیسے آیا؟

بس یوں ہی آ گیا۔اچھا یہ بتائیے کہ وہ واقعہ بہت خوبصورت تھی؟

میں نے کب کہا کہ وہ خوبصورت تھی۔میں نے تو اسے اچھی طرح دیکھا بھی

نہیں۔

لیکن آپ نے تو یہ کہا تھا کہ چھوٹی کی شکل بہت پیاری ہے وہ بھی تو اس کی بہن تھی۔

ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی خوبصورت ہو لیکن میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔

فرحت کی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر عطیہ کی جگہ میں ہوتی تو کیا کرتی۔ آپ کو حیدر آباد سے واپس آنے کے بعد کبھی اس کا خیال نہیں آیا؟

معظم علی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ فرحت یہ میرے دل و دماغ میں اگر خیالات کے لیے کوئی جگہ تھی تو وہ تمہارے تصور سے پُر ہو چکی تھی۔

فرحت نے کہا۔ یہ عجیب بات ہے۔ میں نے جس دن سے اس لڑکی کے متعلق سنا ہے۔ میرے دل میں یہ بار بار خیال آتا ہے کہ کسی دن حیدر آباد جا کر اسے دیکھوں۔ نہ جانے کیوں میں نے اپنے دل میں اس کے لیے ایک بہن کی شفقت محسوس کرتی ہوں۔

معظم علی نے کہا۔ ممکن ہے ہمیں کسی دن حیدر آباد جانا پڑے۔

تیرھواں باب

معظم علی کا تجارتی کاروبار آئے دن وسیع ہوتا جا رہا تھا۔اس کی دولت اور فیاضی کے تذکرے زبانِ زدِ عام تھے۔اس کے دروازے پر غریب اور نادار لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا لکھنوء کے امراء اور فوجی افسر اس کا احترام کرتے تھے۔حویلی کے اندر اس کا ایک شاندار رہائشی مکان اور مہمانوں اور نوکروں کے لیے کمرے تعمیر ہو چکے تھے۔گھوڑوں کے اصطبل اور گودام پاس ہی ایک اور احاطے میں منتقل ہو چکے تھے۔فرحت کی رفاقت کے باعث زندگی کا ایک بھیانک خلا پُر ہو چکا تھا۔تاہم وہ بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کرتا تھا کہ ماضی کی تاریکیاں ابھی تک اس کا پیچھا کر رہی ہیں اور یہ احساس کبھی ان تمام مسرتوں پر حاوی ہو جاتا جو اسے فرحت کی رفاقت میں حاصل تھیں۔وہ فرحت کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھتا اور اپنے دل میں یہ کہتا۔میری زندگی! یہ دنیا تمہاری مسکراہٹوں کے لیے بنائی گئی ہے لیکن کاش ان مسکراہٹوں کی روشنی ان تاریک پردوں کے پار جا سکتی جو ہمارے حال اور مستقبل کے درمیان حائل ہیں۔وہ ماضی کو بھول سکتا تھا لیکن حال اور مستقبل سے آنکھیں بند کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔جن آندھیوں اور طوفانوں کے ساتھ لڑنے میں اس نے اپنی جوانی کے بہترین دن گزارے تھے۔وہ پھر ایک نئی شدت کے ساتھ مستقبل کے افق پر ظاہر ہو رہے تھے۔

مرشد آباد کے قید خانے سے نکلنے کے بعد اس کی ساری توجہ فرحت کی تلاش پر مرکوز تھی اور قوم کے حال اور مستقبل کے مسائل اس کے لیے ایک ثانوی حیثیت اختیار کر چکے تھے لیکن فرحت کو پا لینے کے بعد ان آندھیوں اور طوفانوں کا چہرہ اسے پہلے کی نسبت زیادہ بھیانک نظر آتا تھا وہ ایک درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر

سارے باغ کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ وہ اودھ کی سرزمین کو ان انسانی بھیڑیوں سے بچانا چاہتا تھا۔ جو بنگال کی طرح کرناٹک، دکن اور شمالی ہندوستان کے وسیع علاقوں کو اپنی شکارگاہیں بنا چکے تھے۔ اکبر خاں نے چھ ماہ قبل اسے جو آخری پیغام بھیجا تھا وہ یہ تھا کہ میں اپنے علاقے کے مجاہدین کے ساتھ نجیب الدولہ کی فوج میں شامل ہو چکا ہوں۔ ان دنوں ہم محاصرے کی حالت میں ہیں۔ دتاجی سندھیا ہم پر فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے کمک کا انتظار کر رہا ہے۔ لیکن نجیب الدولہ کو یقین ہے کہ احمد شاہ ابدالی اب کسی تاخیر کے بغیر ہماری مدد کو پہنچ جائیں گے۔

چند ہفتوں کے بعد احمد شاہ ابدالی کی آمد کی خبر ملک کے طول و عرض میں مشہور ہو چکی تھی۔ پھر معظم علی قریباً ہر روز لکھنوء کے امراء کی محفلوں میں اس قسم کی خبریں سنا کرتا تھا کہ آج احمد شاہ ابدالی نے دریائے سندھ عبور کر لیا ہے۔ لاہور کا مرہٹہ گورنر وہاں سے پسپا ہو کر دلی بھاگ آیا ہے۔ احمد شاہ ابدالی اب لاہور سے دلی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ راستے میں فلاں فلاں مقام پر فلاں فلاں روہیلہ سردار افغان لشکر کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں اور اب یہ لشکر مرہٹوں کو دلی کی طرف ہانک رہا ہے۔ دلی کے غدار وزیر عماد الملک غازی الدین نے مرہٹوں کو خوش کرنے کے لیے دلی کے شہنشاہ عالمگیر ثانی اور اس کے وزیر انتظام الدولہ کو قتل کروا دیا ہے اور کسی اور شہزادے کو شاہ جہان ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا ہے۔

دتاجی سندھیا ء نجیب الدولہ کا پیچھا چھوڑ کر احمد شاہ ابدالی کے مقابلے کے لیے روانہ ہو چکا ہے ابدالی نے تراواڑی کے قریب مرہٹہ افواج کے ہراول دستوں کو شکست دی ہے۔ افغان لشکر نے دریائے جمنا عبور کر لیا ہے اور سہارنپور کے قریب پہنچ گیا ہے۔ احمد شاہ ابدالی اب دلی کی طرف بڑھ رہے تھے، نجیب الدولہ، حافظ

رحمت خاں، سعد اللہ خاں، مولا سردار اور دوسرے روہیلہ اکابر اس کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ابدالی نے دلی سے چھ میل دور لونی کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا ہے۔دتا جی کی افواج نے افغان پڑاؤ سے دس میل کے فاصلہ پر دریائے جمنا کے دوسرے کنارے ڈیرہ ڈال دیا ہے۔ابدالی نے اچانک دریا عبور کر کے مرہٹہ لشکر کو تباہ برباد کر دیا ہے۔دتا جی مارا جا چکا ہے۔اور اس کا بھتیجا جن کو جی زخمی ہونے کے بعد رہی سہی فوج کے ساتھ کوٹ پتلی پہنچ گیا ہے____ راجپوتانہ سے طہار راؤ ملکر کی افواج جن کو جی کے ساتھ شامل ہو گئی ہیں____ مرہٹہ لشکر نے روہیلوں کے علاقوں میں تباہی مچا دی ہے____ مرہٹے بہادر گڑھ کی طرف بڑھ رہے ہیں____ احمد شاہ ابدالی کے مشہور جرنیل جہان خاں نے چودہ گھنٹے میں سو (۱۰۰) میل یلغار کر کے اسکندر آباد کے قریب مرہٹہ افواج کو عبرتناک شکست دی____

اور ان شاندار فتوحات کے بعد احمد شاہ نے موسم برسات گزارنے کے لئے علی گڑھ کے قریب ڈیرے ڈال دیے ہیں____

ان حوصلہ افزا خبروں سے معظم علی اپنے سینے میں زندگی کی نئی دھڑکنیں محسوس کر رہا تھا

لیکن یہ خبریں جس قدر حوصلہ افزا تھیں۔اسی قدر دکن کے حالات تشویشناک ہوتے جا رہے تھے____ حیدر آباد کے توپ خانے کا مشہور کمانڈنٹ ابراہیم گاردی جس نے فرانسیسی جرنیل سے تربیت حاصل کی تھی۔نظام سے غداری کر کے مرہٹوں کے ساتھ مل گیا۔بالا جی نے گاردی کی خدمات حاصل کرتے ہی دکن پر حملہ کر دیا۔اور احمد نگر کے مشہور قلعے کے محافظ کی غداری سے فائدہ اٹھا کر کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر اس پر قبضہ کر لیا____ احمد نگر کا قلعہ چھن جانے سے نظام کی فوج

ایک اہم مستقر سے محروم ہوگئی تھی ______ دوسری طرف تنخواہوں کی عدم ادائیگی کے باعث نظام کو اپنے سپاہیوں سے بغاوت کا بھی خطرہ تھا۔تا ہم ان کے لئے مقابلہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔پیشوا نے سداشیوراؤ کی قیادت میں چالیس ہزار فوج بھیجی۔اس کے علاوہ ابراہیم گاردی کو اس کے مشہور توپ خانے اور پانچ ہزار تربیت یافتہ سپاہیوں کے ساتھ روانہ کیا۔

۳ فروری ۱۷۶۰ء کو پونا سے دوسو میل دور دوارو گیر کے مقام پر جنگ ہوئی۔ مغل بہادری سے لڑے لیکن گاردی کے توپ خانے نے انہیں سخت نقصان پہنچایا۔ احمد شاہ ابدالی کی فتوحات کے بعد دکن کے متعلق یہ خبر آئی کہ نظام نے سداشیو کے ساتھ انتہائی ہتک آمیز شرائط پر صلح کر لی ہے۔اور بیجاپور، بےدار، اور اورنگ آباد کے گردونواح کے علاقہ جات اور دولت آباد، اسیر گڑھ۔احمد نگر، اور برہان پور کے قلعہ جات پر ان کا قبضہ تسلیم کرلیا ہے۔

○

پونا میں ابھی تک اوگیر کی فتح کی خوشیاں منائی جارہی تھیں۔کہ پیشوا کو دتاجی کی موت اور جنکوجی اور ملہارراؤ کی شکستوں کی خبریں ملیں۔عام حالات میں شاید دتاجی سندھیا کی موت کو مرہٹہ تاریخ کا ایک بہت بڑا سانحہ سمجھا جاتا۔لیکن مرہٹے ایک طرف دکن میں نظام کی قوت مفلوج کر چکے تھے، دوسری طرف چند ماہ قبل ان کی فتوحات کا سیلاب پشاور کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔گزشتہ کامیابیوں کے بعد مرہٹوں میں جو غرور اور خوداعتمادی پیدا ہوئی تھی۔اس کے باعث یہ شکستیں پوری مرہٹہ قوم کے لئے عزت اور وقار کا مسئلہ بن گیں۔اور مہاراشٹر سے وہ فوجی قوت نمودار ہوئی، جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔بلونت راؤ

نیمن ڈھیل، شمشیر بہادر، باجی راؤ کا بیٹا مستانی، نارو شنکر وٹھل، شیو دیو، تر میک راؤ، پورن دھر، انتاجی، مانکیشور، اور بے شمار دوسرے بڑے اور چھوٹے سردار اپنی اپنی افواج کے ساتھ قومی توہین کا انتقام لینے کے لئے پیشوا کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے ۔اس کے علاوہ ان کے ساتھ ابراہیم گاردی اپنے مشہور توپ خانے اور نو ہزار تربیت یافتہ سپاہیوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔اس عظیم فوج کی کمان اوگیر کے فاتح سداشیو راؤ (بھاؤ جی) کو سونپی گئی ۔اور اس کے ساتھ پیشوا نے اپنے نوجوان ولی عہد بشواش راؤ کو روانہ کر دیا۔مرہٹہ لشکر ۱۰ مارچ ۱۷۶۰ء کو پٹ دوڑ سے روانہ ہوا۔اور اورنگ آباد، برہان پور، اور گوالیار کے راستے سفر کرتے ہوئے ۴ جون کو دریائے چنبل کے کنارے پہنچ گیا۔راستے میں جوں، جوں یہ فوج شمال کی طرف بڑھتی گئی ۔اس کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا ۔ملہار راؤ ملکر، جنکوجی ،سندھیا، داماجی، جسونت راؤ پھاوڑ، اور دوسرے مرہٹہ سرداروں کے علاوہ لیٹروں اور پنڈاروں کے دستے ہر منزل پر اس کے ساتھ شامل ہوتے گئے ۔یہاں تک کہ ان کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی ۔یہ صرف ایک فوج نہ تھی ۔بلکہ پوری قوم کا فعال عنصر جمع ہو چکا تھا۔اور ان سب کا یہ نعرہ تھا، کہ ہم افغانوں کو ہندوستان کی سرزمین سے باہر نکال کر دم لیں گے ۔

دلی کی طرف مرہٹہ لشکر کی رفتار بہت سست تھی ۔اس سے قبل مرہٹوں کی کامیابی کا راز ان کی سادگی اور تیز رفتاری میں تھا۔سیوا جی کے زمانے میں مرہٹہ کیمپ میں کسی عورت کا لانا بعید از قیاس سمجھا جاتا تھا۔وہ اپنے ساتھ کوئی بھاری ساز و سامان بھی نہیں رکھتے تھے ۔ایک مرہٹہ سپاہی کے لوازمات گھوڑے اسلحے اور ایک توبڑے تک محدود ہوتے تھے ۔اپنے لئے کھانا اور گھوڑے کے لئے چارہ راستے میں لوٹتے تھے ۔لیکن بھاؤ جی کی شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ اس کے ساتھ سامان

رسد کی بے شمار گاڑیاں تھیں۔اور خیمہ بردار تھے۔ریشمی خیمے ہاتھیوں پر لدے ہوئے تھے۔مرہٹہ سرادر زرتار کے لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔چنبل کے مقام پر بھرت پور کا حکمران راجہ سورج مل جاٹ اپنے لشکر سمیت مرہٹوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ لیکن بھاءو جی کی خودسری کے باعث راستے میں ہی مرہٹوں کے ساتھ اس کے اختلاف پیدا ہو گئے۔مرہٹے جولائی کے آخر میں دلی کے دروازے پہ دستک دے رہے تھے۔۲، اگست کو انہون نے بغیر کسی شدید مزاحمت کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ بھاؤ نے اپنی افواج کو تنخواہ دینے کے لئے لال قلعہ کو لوٹا،اور دیوان عام کی چھت اور دیوارون میں لگی ہوئی چاندی اتار لی۔لال قلعہ سے باہر بزرگان دین کے مزارات کو بھی لوٹنے سے دریغ نہ کیا۔سورج مل جاٹ مرہٹوں کی اس حرکت سے خفا ہو کر واپس چلا گیا۔

موسم برسات کے دوران میں مرہٹے دلی سے باہر پڑاؤ ڈال کر شہر اور آس پاس کے علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کیے ہوئے تھے۔اس عرصہ میں ابدالی بلند شہر کے ضلع میں انوب کے مقام پر ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔اور دونوں فریق نواب شجاع الدولہ کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے تھے ______

O

معظم علی بلا ناغہ صبح کی نماز کے بعد گھوڑے کی سواری کیا کرتا تھا۔ایک دن سواری کے بعد وہ اپنی حویلی میں داخل ہوا تو ایک فوجی افسر کھڑا شیر علی سے باتیں کر رہا تھا۔اور معظم علی کا ایک نوکر اس کے گھوڑے کی باگ تھامے ہوئے چند قدم دور کھڑا تھا۔شیر علی نے معظم علی کی طرف دیکھ کر فوجی افسر سے کہا، لیجیے وہ آ گئے۔معظم علی نے گھوڑے سے اتر کر نوجوان افسر کے ساتھ مصافحہ کیا۔افسر نے کسی تمہید کے

بغیر کہا۔جناب مجھے محل کے داروغہ نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔آپ کو اسی وقت محل طلب کیا گیا ہے۔

معظم علی نے کہا۔میں وہاں طلب کیے جانے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔

جناب مجھے کچھ معلوم نہیں۔داروغہ نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں آپ کو ساتھ لے کر آؤں۔

معظم علی نے مسکراتے ہوئے کہا،اور اگر میں داروغہ کے حکم کی تعمیل نہ کروں تو؟

نوجوان افسر نے جواب دیا۔داروغہ نے آپ سے درخواست کی ہے حکم نہیں بھیجا۔

چلیے معظم علی نے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد معظم اور فوجی افسر محل کی ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔فوجی افسر نے کہ آپ یہاں تشریف رکھیے میں داروغہ کو اطلاع دیتا ہوں۔

معظم علی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔اور فوجی افسر باہر نکل گیا۔کوئی پانچ منٹ بعد محل کا داروغہ کمرے میں داخل ہوا۔اور اس نے گرم جوشی سے معظم علی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔آئیے آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔

معظم علی نے داروغہ کے ساتھ کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔اگر یہ بات اس محل کے رسوم وآداب کے خلاف نہ ہو،تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔کہ کہ میرا انتظار کرنے والے صاحب کون ہیں۔

داروغہ نے جواب دیا۔آپ کو نجیب الدولہ نے بلایا ہے۔نجیب الدولہ یہاں ہیں۔

جی ہاں وہ کل یہاں پہنچے تھے، لیکن ابھی تک ان کی آمد کو صغیہ راز میں رکھا جارہا ہے۔اور میں آپ سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ آپ یہ بات محل سے باہر کسی پر ظاہر نہیں کریں گے۔

معظم علی نے جواب دیا۔آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔لیکن میں حیران ہوں کہ انہیں میرے ساتھ کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

داروغہ نے جواب دیا۔میں سمجھتا ہوں کہ وہ آپ کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپ شہر سے باہر رہتے ہیں۔انھوں نے یہاں پہنچتے ہی آپ کے متعلق پوچھا تھا۔

معظم علی اپنے ذہن میں نجیب الدولہ کی سیماب پا شخصیت کی عجیب وغریب تصویریں لیے محل کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ایک قوی الجثۃ آدمی جس کے چہرے سے ذہانت اور شجاعت مترشح تھی۔اسے دیکھ کر اپنی کرسی سے اٹھا، اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔آپ شاید اس بات سے پریشان ہوں، کہ میں نے آپ کو یہاں آنے کی تکلیف کیوں دی۔اگر مجھے بعض مجبوریوں کا احساس نہ ہوتا تو میں سیدھا آپ کے ہاں آتا۔

معظم علی نے جواب دیا۔آپ کی خدمت میں حاضر ہونا میں اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا ہوں۔

تشریف رکھیے مجھے اکبر خان نے آپ کا پتا دیا تھا۔

اکبر خاں کا نام سن کر معظم علی کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔اور اس نے نجیب الدولہ کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔وہ کہاں ہے۔مجھے اس نے کئی مہینوں سے کوئی اطلاع نہیں دی۔میں اس کے متعلق بہت پریشان ہوں۔

وہ احمد شاہ ابدالی کے پاس ہے۔اور گزشتہ چند ماہ وہ مرہٹوں کے خلاف جنگوں میں بے حد مصروف رہا۔اور میں اس کی طرف سے معذرت پیش کرتا ہوں۔

معظم علی نے جواب دیا آپ کو اس کی طرف سے معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں، میں اسے جانتا ہوں اور شاید میں اس دنیا میں اس سے زیادہ کسی اور کو نہیں جانتا۔میرے لئے اس کے متعلق یہ جان لینا کافی ہے کہ وہ سلامت ہے۔

نجیب الدولہ نے کہا اس کا باپ میرا دوست تھا اور میں اس کو اپنا بیٹا سمجھتا ہوں۔اس نے مرہٹوں کے خلاف جنگوں میں جرات و ہمت کی نہایت قابل فخر روایات قائم کی ہیں۔اور میں جب کبھی اسے شاباش دیا کرتا تھا تو وہ ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ اس نے سب کچھ آپ سے سیکھا ہے۔آپ کے ساتھ میری ملاقات ایک مقصد کے لئے ہے۔اکبر خان مجھے سپاہیانہ زندگی سے آپ کی کنارہ کشی کی وجوہات بتا چکا ہے۔لیکن میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں، کہ احمد شاہ ابدالی نے جس جنگ کا بیڑہ اٹھایا ہے۔وہ اس ملک میں مسلمانوں کی اجتماعی بقا کی خاطر لڑی جائے گی۔مرہٹے اب ہمیشہ کے لئے اس ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنی پوری قوت کے ساتھ دلی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔اور میں آپ جیسے باشعور آدمی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ اگر ہم نے اس جنگ میں شکست کھائی تو جو امیدیں ہم نے شمالی ہندوستان کے مستقبل کے ساتھ وابستہ کی ہیں۔وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گی۔مرہٹے ایک ہو چکے ہیں اور اب ہمیں بھی ایک ہونے کی ضرورت ہے۔میں نواب شجاع الدولہ کے پاس احمد شاہ ابدالی کا ایلچی بن کر آیا ہوں۔اور مجھے امید ہے کہ وہ ہمارا ساتھ دینے پر رضامند ہو جائیں گے۔روہیل کھنڈ کے تمام سردار احمد شاہ ابدالی کے ساتھ شامل ہو چکے ہیں۔لیکن ہمیں اپنے سپاہیوں کو فوراً تربیت دینے کے لئے آزمودہ کار

افسروں کی ضرورت ہے۔

معظم علی نے کہا اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں۔ کہ میں کسی ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔ تو میری رضا کارانہ خدمات حاضر ہیں۔ اور مجھے اس بات کی ندامت ہے کہ میں اکبر خاں کی طرح آپ کی خدمت میں بن بلائے حاضر کیوں نہ ہوا۔

محل کا داروغہ کمرے میں داخل ہوا، اور اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد کہا۔ عالی جاہ حضور نواب صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

نجیب الدولہ نے جواب دیا۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

نہیں عالی جاہ خود تشریف لا رہے ہیں۔ داروغہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ اور معظم علی نے اٹھ کر کہا، تو میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں اور یہ وعدہ کرتا ہوں۔ کہ میں ایک ہفتہ کے اندر، اندر احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔

نہیں ٹھہریے:

لیکن نواب صاحب تشریف لا رہے ہیں؟

نجیب الدولہ نے کہا۔ بیٹھ جائیے؛ نواب صاحب سے آپ کا تعارف ضروری ہے۔

نواب اودھ اپنے شاہانہ لباس میں کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اور نجیب الدولہ اور معظم علی اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ شجاع الدولہ اپنے مہمان کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر چند ثانیے تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا۔ نجیب الدولہ نے کہا، جناب یہ معظم علی خاں ہیں۔ لکھنو میں پناہ لینے سے پہلے یہ بنگال کی فوج میں ملازم تھے۔ ان کا ایک ہونہار شاگرد احمد شاہ ابدالی سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اور میں ابھی ان سے یہ کہہ رہا تھا کہ ہمیں اپنے سپاہیوں کو تربیت دینے کے لئے آپ کی

خدمات کی ضرورت ہے۔اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے میری درخواست قبول کرلی ہے۔

شجاع الدولہ نے کہا۔تشریف رکھیے۔ایک اچھے سپاہی کے لئے میری فوج میں بھی جگہ تھی۔لکھنؤ میں آپ کے مشاغل کیا ہیں؟

میں تجارت کرتا ہوں۔

شجاع الدولہ نے نجیب الدولہ کی طرف متوجہ ہوکر کہا۔آپ انھیں کب سے جانتے ہیں۔روہیل کھنڈ کا ایک نوجوان سردار اپنی عمر کا کچھ حصہ ان کے ساتھ گزار چکا ہے۔اور اس کی بدولت میں غائبانہ طور پر ان سے متعارف ہو چکا تھا۔

شجاع الدولہ چند ثانیے خاموش رہا۔معظم علی نے اس محفل میں اپنی موجودگی کو دخل در معقولات سمجھتے ہوئے اٹھ کر کہا،اب مجھے اجازت دیجیے۔

بہت اچھا،اگر مجھے وقت ملا تو جانے سے پہلے آپ سے ایک اور ملاقات کی کوشش کروں گا۔لیکن اگر یہ ممکن نہ ہوا تو ہماری ملاقات احمد شاہ ابدالی کے کیمپ میں ہو گی۔

نجیب الدولہ نے اٹھ کر معظم علی کے ساتھ مصافحہ کیا،لیکن شجاع الدولہ نے کرسی پر بیٹھے، بیٹھے ہاتھ بڑھا دیا۔معظم علی دروازے کی طرف بڑھا لیکن کچھ سوچ کر اچانک رک گیا،پھر اس نے مڑکر شجاع الدولہ کی طرف دیکھا اور کہا،جناب اگر یہ گستاخی نہ ہو تو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

کہیے:

مجھے یہ معلوم نہیں کہ نجیب الدولہ اپنی مہم میں کہاں تک کامیاب ہونگے اور احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دینے کے متعلق آپ کا فیصلہ کیا ہوگا،میں صرف یہ جانتا ہوں، کہ

ہندوستان کا کوئی مسلمان، اگر اس نے خودکشی کا ارادہ نہیں کرلیا ہے۔اس جنگ میں غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔اگر خدانخواستہ اس ملک کے مسلمانوں کی اجتماعی بے حسی کے باعث احمد شاہ ابدالی کو شکست ہوگئی تو شمالی ہند میں ہمارا آخری دفاعی حصار ٹوٹ جائے گا۔مرہٹوں نے صرف دلی پر قبضہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ وہ پشاور سے کابل اور غزنی تک اپنی فتوحات کا پرچم لہرانے کی نیت سے میدان میں آئے ہیں۔اگر کسی میدان میں انہیں فیصلہ کن شکست نہ دی گئی تو وہ دن دور نہیں، جب دلی کی طرح لکھنو کی گلیوں اور بازاروں میں بھی ان کے گھوڑے دوڑ رہے ہونگے۔لکھنو میں اس قسم کی افواہیں گشت کررہی ہیں کہ مرہٹوں نے آپ کو جنگ سے علیحدہ رکھنے کے لئے دلی میں اپنے کٹھ پتلی حکمران کی وزارت کی پیش کش کی ہے۔اور آپ......

شجاع الدولہ نے سراپا احتجاج بن کر کہا۔یہ جھوٹ ہے۔اور مرہٹے مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔

معظم علی نے کہا، میری معذرت قبول فرمایئے لیکن عوام کا اعتماد بحال کرنے کے لئے اس قسم کی افواہوں کی تردید کی اشد ضرورت ہے۔اور تردید کی بہترین صورت یہ ہوسکتی ہے کہ آپ اپنی افواج کو مرہٹوں کے خلاف تیاری کا حکم دیں۔

شجاع الدولہ نے جواب دیا، مجھے کوئی فیصلہ کرنے کے لئے آپ کے مشوروں کی ضرورت نہیں

جناب مجھے معلوم ہے کہ میں مشورہ دینے کا اہل نہیں، لیکن میں آپ کے کانوں تک اس قوم کی فریاد پہنچانا چاہتا ہوں، جس کی شہ رگ تک ایک ایسے دشمن کی تلوار پہنچ چکی ہے۔جو عدل وانصاف اور انسانیت کے الفاظ سے نا آشنا ہے۔ میرے الفاظ بے شک تلخ ہیں لیکن آپ کو میرے خلوص پر شبہ نہیں کرنا چاہیے۔

معظم علی یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

○

تھوری دیر بعد معظم علی گھوڑے پر سوار اپنے گھر کا رخ کر رہا تھا۔شہر کے بارونق بازاروں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے اسے اپنے گردوپیش کا احساس تک نہ تھا۔وہ کوسوں دور کسی میدان میں ان افواج کے میلوں تک پھیلے ہوئے پڑاؤ دیکھ رہا تھا۔ جو ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والی تھی ۔ وہ لڑنے والوں کے نعرے، زخمیوں کی چیخ وپکار،توپوں کی دھنا دھن، بندوقوں کے دھماکے اور تلواروں کی جھنکار سن رہا تھا۔اسے حدنگاہ تک لاشوں کے انبار نظر آرہے تھے ۔پھر آگ اور خون کے طوفانوں سے نکل کر وہ اس مکان میں پہنچ چکا تھا، جہاں زندگی اپنی تمام تر رعنائیون اور دلفریبیوں کے ساتھ اس کا خیر مقدم کررہی تھی ۔فرحت اس کے سامنے کھڑی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔میری زندگی: میں آ گیا ہوں خدا نے ہمیں فتح دی ہے ۔ہم ان درندوں کے دانت توڑ آئے ہیں ۔ جو اس ملک میں انسانیت کے لئے ایک عظیم خطرہ بن چکے تھے ۔میرے پیچھے وہ فوج آرہی ہے ۔جس کے سپاہی مرہٹوں کی سطوت کے پرچم اپنے پیروں تلے روند چکے ہیں ۔اب یہ مجاہد ان فرنگی تاجروں کی چیرہ دستیوں سے ہمیں نجات دلائیں گے ۔جنھوں نے بنگال میں ہماری عزت اور آزادی پر ڈاکہ ڈالا تھا، اس ملک میں انسانیت دوبارہ جنم لے رہی ہے۔ اب ہماری منزل مرشد آباد ہے ۔ہم بہت جلد اس وطن کی مٹی کو آنکھوں سے لگائیں گے ۔جہان ہمارے شہیدوں کا خون گرا تھا۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی اپنے گھر میں داخل ہوا،تو وہان کمرے میں فرحت اور اس کی ماں کے علاوہ دو اجنبی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں ۔معظم علی جلدی سے واپس مڑا

اور دوسرے کمرے میں جا بیٹھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد فرحت اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

معظم علی نے کہا فرحت مجھے معلوم نہیں تھا، کہ وہاں تمہاری سہیلیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔انھوں نے برا تو نہیں مانا۔

فرحت مسکرائی وہ میری سہیلیاں نہیں تھیں۔انھیں امی جان نے بلایا تھا۔ جاتے، جاتے آپ کو ایک خوشخبری دے گئی ہیں۔

وہ کیا؟

یہی کہ ہمارے گھر ایک مہمان تشریف لانے والے ہیں۔

معظم علی نے کہا وہ یہ خوشخبری تو میں پچھلے ہفتے سن چکا ہوں۔

فرحت مسکرائی، امی جان کو اصرار ہے کہ شہر کی ہر تجربہ کار عورت باری، باری مجھے دیکھنے کے لیے آئے۔کل پڑوس کی کسی عورت نے ان عورتوں کا پتا دے دیا تھا۔ اور امی جان نے آج صبح کی نماز سے فارغ ہوتے ہی صابر کو ان کی تلاش میں بھیج دیا تھا۔

معظم علی فرحت کی طرف دیکھ رہا تھا۔لیکن اس کے خیالات کہیں اور تھے۔

فرحت نے کہا آج آپ پریشان نظر آتے ہیں۔خیر تو ہے۔دلاور خان کہتا تھا، کہ آپ کو شجاع الدولہ نے بلایا تھا۔

نہیں مجھے نجیب الدولہ نے بلایا تھا۔وہ کل سے لکھنو میں ہیں۔فرحت میں نے تم سے وعدہ کیا تھا، کہ اپنے ننھے مہمان کی صورت دیکھنے سے پہلے میں ہرگز گھر سے باہر نہیں جاؤں گا۔

فرحت نے کہا لیکن اگر آپ کہیں جانا چاہتے ہیں تو میں آپ کا راستہ روکنے کی

کوشش نہیں کرونگی،

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔فرحت آج میں اس بات پر ندامت محسوس کر رہا ہوں، کہ میں ان جنگوں سے غیر حاضر رہا۔ جو ہماری قوم کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والی ہیں ۔تم سن چکی ہو کہ مرہٹوں کا سیلاب اب دلی پہنچ چکا ہے ۔احمد شاہ ابدالی ہمارا نجات دہندہ بن کر آیا ہے ۔ اور اسے ہر اس انسان کے تعاون کی ضرورت ہے جو اس ملک کے مسلمانوں کے متعلق سوچنے کا شعور اور ان کی بقا کے لئے تلوار اٹھانے کی ہمت رکھتا ہو۔

فرحت نے کہا میں چند دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ آپ کوئی اہم فیصلہ کر نے والے ہیں ۔اور پچھلے ہفتے جب آپ نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ آپ اب چند مہینے لکھنو سے باہر نہیں جائیں گے

تو بھی مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ آپ کسی ذہنی مش مکش میں مبتلا ہیں ۔میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتی ہوں، کہ اگر آپ میری خاطر اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے کی کوشش کریں گے تو میں سمجھوں گی کہ میں آپ کی رفیقہ حیات بننے کے اہل نہ تھی ۔

آٹھ دن بعد معظم علی ایک سپاہی کا لباس پہنے فرحت کے سامنے کھڑا تھا ۔ فرحت کے چہرے پر ایک مغموم مسکراہٹ تھی۔ معظم علی نے کہا۔ میں اپنی زندگی میں ایسی جنگیں لڑ چکا ہوں، جو اپنے نتائج کے اعتبار سے بے معنی تھیں ۔لیکن اس دفعہ میں ایک ایسی جنگ میں حصہ لینے جا رہا ہوں، جس کے نتائج بہت دوررس ہونگے ۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں شمال مغرب کے علاقے ہندوستان کے مسلمانون کا آخری دفاعی حصار ثابت ہونگے ۔ اگر ہم مرہٹون کو شکست نہ دے سکے تو یہ سیلاب عظیم کسی دن اٹک کے پار پشاور اور غزنی تک پہنچ جائے گا اور مسلمانوں کی حالت

شودروں سے بدتر ہوگی۔فرحت میں اپنی شہرت اور نام وری کے لئے نہیں بلکہ قوم کی بقا کے لیے جنگ میں حصہ لینے جا رہا ہوں۔ یہ جنگ اس ملک کی تاریخ کی عظیم ترین جنگ ہوگی۔اور اس میں حصہ لینے والے ہزاروں سپاہی ایسے ہونگے، جن کی لاشیں دشمن کے گھوڑوں کے پیروں تلے روندی جائیں گی۔ اگر میں واپس نہ آیا تو سمجھنا کہ میرا مقصد میری ذات سے بلند تھا۔اور جو بچہ ہمارے ہاں پیدا ہوگا تم اسے کسی دن یہ بتاسکو گی کہ تمھارا باپ ان ہزاروں گمنام سپاہیون میں سے ایک تھا۔ جنھون نے اپنے آنے والی نسلوں کی عزت اور آزادی کی قیمت اپنی جانیں دے کر ادا کی تھی۔

فرحت کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے،اس کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ایک لمحہ کے لئے معظم علی نے اس کی طرف دیکھا،اور بھرائی ہوئی آواز میں خدا حافظ کہہ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا

تو فرحت اور اس کی ماں بالائی منزل کے دریچے میں کھڑی نیچے دیکھ رہی تھیں ۔جب معظم علی اور اس کے ساتھی حویلی سے باہر نکل گئے۔تو فرحت بے اختیار عابدہ کے ساتھ لپٹ گئی۔امی جان! اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا! دعا کیجیے کہ خدا انھیں فتح دے۔

○

موسم برسات ختم ہو چکا تھا۔بھاؤ نے نارو شنکر کو سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ دلی کی حفاظت کے لئے چھوڑ کر پیش قدمی کی اور دلی سے اسی میل دور شمال کی طرف جمنا کے کنارے افغانون کے مشہور قلعہ کنج پورہ پر حملہ کر دیا۔نجابت خاں دس ہزار

روہیلہ جان بازوں کے ساتھ اس قلعے کی حفاظت پر متعین تھا۔لیکن مرہٹوں کے سیلاب کے آگے اس کی پیش نہ گئی۔انھوں نے گاردی کے توپ خانے کی گولہ باری کے بعد یلغار کر کے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔نجابت خان اور سرہند کے سابق گورنر عبد الصمد خاں کے علاوہ ہزاروں سپاہیوں کو تہہ تیغ کر ڈالا۔اس قلعہ سے مرہٹوں کو اسلحہ اور بارود کے علاوہ رسد کے وہ ذخائر دستیاب ہوئے جو احمد شاہ ابدالی کی فوج کے لئے جمع کیے گئے تھے۔

دریائے جمنا طغیانی کے باعث ناقابل عبور تھا،اور احمد شاہ ابدالی انتہائی رنج وملال کے ساتھ دریا کے دوسرے کنارے مرہٹوں کے ہاتھوں اپنے بہترین ساتھیوں کے قتل عام کی خبریں سن رہا تھا۔لیکن جب مرہٹے کنج پورہ کے خزانے لوٹنے کے بعد دسہرے کی خوشیاں منا رہے تھے۔احمد شاہ ابدالی دلی سے بیس میل دور شمال کی طرف باغپت کے قریب جا نکلا۔کشتیوں کے بغیر وہاں بھی دریائے جمنا کو عبور کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔فوج کے افسر اور سپاہی دریا کی خشمگیں موجیں دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔لیکن کسی کو امیر لشکر کے حکم سے سرتابی کی مجال نہ تھی۔احمد شاہ ابدالی کے حکم سے توپیں ہاتھیوں پر لادی گئیں۔اور سواروں کے دستے دریا کے کنارے صف بستہ کھڑے ہو گئے۔پھر امیر لشکر نے اللہ اکبر کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دریا میں کود پڑا۔اس کے ساتھ ہی نجیب الدولہ،شجاع الدولہ،نصیر خاں بلوچ،مراد خاں ایرانی،برخوردار خان،شاہ ولی خان،جہان خان اور دوسرے افغانی،ایرانی،بلوچ،اور روہیلہ سرداروں نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیے، اور پھر آن کی آن میں پوری فوج دریا کی موجوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب یہ لشکر دریا کے پار پہنچ چکا تھا۔درختوں اور جھاڑیوں

کے عقب سے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ابدالی کی افواج کے چند دستوں نے کسی غیر متوقع حملے کے پیش نظر آگے بڑھ کر صفیں باندھ لیں ۔چند ثانیوں کے بعد بیس سواروں کا دستہ نمودار ہوا۔اگلی صف سے کسی نے بلند آواز میں کہا یہ ہمارے ساتھی ہیں ۔انہیں آنے دو۔اکبر خاں اور معظم علی ان سواروں میں سب سے آگے تھے۔وہ اپنے گھوڑوں سے اتر کر بھاگتے ہوئے لشکر کی صفوں میں گھس گئے،اور تھوڑی دیر بعد وہ نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں اور روہیل کھنڈ کے دوسرے سرداروں سے باتیں کر رہے تھے۔معظم علی کہہ رہا تھا کہ یہاں سے صرف چھ کوس کے فاصلے پر مرہٹوں کی چوکی ہے۔اور اس چوکی کا صفایا کرنے کے بعد یہ علاقہ ہمارے لئے محفوظ ہو جائے گا،وہاں سپاہیوں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہیں ۔مرہٹے اس وقت دسہرے کا جشن منا رہے ہیں ۔اگر میرے ساتھ چند تیز رفتار دستے بھیج دیے جائیں تو میں دوپہر سے پہلے ،پہلے ان کا صفایا کر سکتا ہوں ۔

حافظ رحمت خاں نے کہا ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔چلیے آپ ہماری رہنمائی کریں ۔

ہمارے گھوڑے تھکے ہوئے ہیں یہ کہہ کر معظم علی نے ایک نوجوان کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی ۔

نوجوان نے کہا لیکن میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں ۔

معظم علی نے اسے بازو سے کھینچ کر گھوڑے سے اتارتے ہوئے کہا،تم سن چکے ہو ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے ۔اکبر خاں نے اس کی تقلید کی اور اپنے قبیلے کے ایک سپاہی کا گھوڑا پکڑ لیا ۔تھوڑی دیر بعد کوئی چار سو سوار لشکر کی صفوں سے نکل کر گرد و غبار کے بادلوں میں روپوش ہو رہے تھے۔اور نجیب الدولہ احمد شاہ ابدالی سے

کہہ رہا تھا۔ عالی جاہ! اس کا نام معظم علی ہے۔ اس نے دو دن قبل اس علاقے دشمن کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لئے دریا عبور کیا تھا۔ اب وہ یہاں سے چھ کوس دور دشمن کی ایک چوکی کا صفایا کرنے جا رہا ہے۔ پھر یہ علاقہ بالکل محفوظ ہو جائے گا۔ اور ہم اپنی پیش قدمی جاری رکھ سکیں گے۔

اگلی رات مرہٹہ چوکی کے چند سپاہی جو روہیلہ دستوں سے جان بچا کر بھاگنے میں کام یاب ہو گئے تھے، بھاؤ جی کو یہ بتا رہے تھے، کہ ابدالی کے لشکر نے اچانک دریا عبور کر کے ہماری چوکی کا صفایا کر دیا ہے۔

بھاؤ جی نے مرہٹہ سرداروں سے مشورہ کرنے کے بعد اپنی فوج کو پانی پت کی طرف ہٹا لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے شہر کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔ مرہٹوں نے ابراہیم گاردی کی ہدایت کے مطابق شہر اور اپنے کیمپ کے گرد ساٹھ فٹ چوڑی اور بارہ فٹ گہری خندق کے پیچھے مٹی کے بلند پشتے پر جگہ جگہ توپیں نصب کر دیں۔ بھاؤ کو امید تھی کہ اس کی پنڈارہ فوج احمد شاہ ابدالی کے رسد اور کمک کے راستوں پر حملہ کر کے اسے حملہ پر مجبور کر دے گی۔ لیکن ابدالی مرہٹہ سپہ سالار کی نسبت کہیں زیادہ تجربہ کار اور دور اندیش تھا۔ وہ دشمن کی خواہش کے مطابق اپنی فوجوں کو اس کی توپوں کے سامنے لانے پر تیار نہ ہوا۔ اس نے اردگرد کے جنگلات سے بے شمار درخت کٹوائے اور پڑاؤ کے اردگرد لکڑی کے کھمبوں کی ایک دیوار کھڑی کر دی۔ ابدالی کے اس اقدام سے مرہٹے ایک غیر متوقع صورت حال کا سامنا کر رہے تھے۔ وہ اپنے بھاری توپ خانہ کو ایک فیصلہ کن حربہ سمجھتے تھے۔ لیکن بھاری ساز و سامان سے لیس ہونے کے باعث بدلے ہوئے حالات کے مطابق جنگ کا کوئی نیا نقشہ تیار کرنے کے قابل نہ تھے۔ انھوں نے دن رات ایک کر کے خندق کھودی تھی، کہ احمد شاہ ابدالی

ایک طوفان کی طرح آگے بڑھے گا۔اوران کی توپیں خندق کے اردگرد افغان سپاہیوں کے ڈھیر لگادیں گی۔لیکن اتنی بڑی تیاری کے بعد انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ دشمن کیا سوچ رہا ہے۔افغان لشکر اگر کھلے میدان میں نکل کرحملہ کرتا تو مرہٹے ابدالی کے ہرسوار کے مقابلے میں کم از کم پانچ سوار لا سکتے تھے۔پھر اگر پڑاوٴ میں مرہٹہ سرداروں کے ساتھ ان کی بیویاں نہ ہوتیں

توان کے لئے پسپا ہوکر جنگ کے لئے کوئی بہتر جگہ تلاش کرنا نسبتاً آسان ہوتا۔اب ان کے لئے پڑاوٴ سے باہر ہر جگہ غیر محفوظ تھی۔اس کے برعکس احمد شاہ ابدالی کی فوج ہر وقت حالات کے مطابق نقل وحرکت کرسکتی تھی۔ابدالی کے سپاہی بھاری توپ خانوں کی بجائے اپنے نیزوں تلواروں، بندوقوں اور گھوڑوں پر بھروسہ رکھتے تھے۔

فریقین کے کیمپوں کے درمیان قریباً آٹھ میل کے خلا میں روزمرہ انفرادی شجاعت کے واقعات دیکھے جاتے تھے۔کبھی کوئی مرہٹہ ماتھے پر تلک لگا کر اپنے پڑاوٴ سے نکلتا، اور مسلمانوں کے پڑاوٴ کے سامنے گھوڑا روک کرکسی افغانی، کسی ایرانی یا کسی بلوچ کو مقابلے کی دعوت دیتا۔اسی طرح افغان فوج کے جوان مرد گھوڑے دوڑاتے ہوئے اپنے پڑاوٴ سے نکلتے اور مرہٹہ کیمپ کی خندق کے پل کے قریب رک کرانھیں دعوت مبارزت دیتے۔ابدالی کے کیمپ میں ایک نوجوان کی زندہ دلی اور جرات کی داستانیں ضرب المثل بن چکی تھیں۔وہ ہر روز ایک نئے بھیس میں نکلتا اور دشمن کے دو چار سورماوٴں کا غرور خاک میں ملا کر واپس آتا۔ابدالی کے جانباز اسے کبھی افغان کبھی بلوچ، کبھی مغل اور کبھی روہیلہ سپاہی کے لباس میں دیکھتے اور داد وتحسین کے نعرے بلند کرتے۔چند شاندار معرکوں کے بعد وہ نصیر خاں بلوچ سے

ایک پٹکا، ملک جہان خاں سے ایک تلوار، شجاع الدولہ سے ایک گھوڑا، اور نجیب الدولہ سے ایک بندوق بطور انعام حاصل کر چکا تھا

یہ نوجوان اکبر خاں تھا۔ایک دن احمد شاہ ابدالی نے اسے اپنے خیمے میں طلب کیا، اور کہا بیٹا میں تمھارے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں، اور تم اپنے آپ کو میری طرف سے بہترین انعام کا مستحق ثابت کر چکے ہو۔تمھاری کوئی ایسی خواہش ہے جسے میں پورا کر سکتا ہوں۔

اکبر خاں نے انسانی سطوت اور جبروت کے اس پیکر مجسم کو دیکھا اور محبت واطاعت کے جذبات سے مغلوب ہو کر گردن جھکا لی۔

احمد شاہ ابدالی نے کہا۔بیٹا تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔

اکبر خاں نے گردن اٹھائی اس کی چمکدار آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا! عالی جاہ میری صرف ایک خواہش ہے اور اسے آپ کے سوا کوئی پورا نہیں کر سکتا۔

کہو!

عالی جاہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ مرہٹے دوبارہ اس سر زمین پر پاؤں نہ رکھیں۔اوران الفاظ کے ساتھ اکبر خان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

احمد شاہ ابدالی نے کہا بیٹا خدا مجھے ہمت دے، تمھاری یہ خواہش ضرور پوری ہو گی۔اب میں تمھیں ایک حکم دیتا ہوں اور وہ یہ کہ آج کے بعد تمھیں تنہا دشمن کے مقابلے میں جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔مرہٹوں کا یوم حساب شروع ہونے والا ہے اور میں تمھیں اس دن کے لئے زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔کاش اس ملک میں چند

اور نوجوان تم جیسے ہوتے۔

اکبر خاں نے کہا عالی جاہ میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں، جس کا بچپن میرے بچپن سے اور جس کی جوانی میری جوانی سے بہتر تھی۔اور جواب بھی میرے لئے باعث فخر ہے۔

اور وہ کون ہے؟

عالی جاہ وہ چھاپہ مار روہیلہ دستوں کا سالار ہے۔اور میں نے سب کچھ اسی سے سیکھا ہے۔

۱۹ نومبر کو گاردی نے اپنی پیادہ سپاہ کے ساتھ حملہ کیا۔لیکن اسے شدید نقصان اٹھانے کے بعد پسپا ہونا پڑا، تین دن بعد سندھیا نے یکے بعد دیگرے دو حملے کیے۔ لیکن اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ ۷ دسمبر کو روہیلوں نے جوابی حملہ کیا اور ان کی جھڑپ بلونت راؤ مہینڈیل کے دستوں کے ساتھ ہوئی۔سخت لڑائی کے بعد بلونت مارا گیا، اور اس کی فوج بھاگ گئی۔روہیلون نے شکست خوردہ دستوں کا تعاقب کیا، اور مرہٹہ کیمپ میں داخل ہو گئے، اور شام تک تباہی مچانے کے بعد واپس چلے آئے۔

قریباً ڈھائی ماہ فریقین کے درمیان اس طرح کی جھڑپیں ہوتی رہیں۔اس عرصہ میں دونوں فوجوں کے سامنے سپاہیوں کے لئے رسد اور گھوڑوں کے لئے چارے کی فراہمی سب سے بڑا مسلہ تھی مرہٹہ فوج کو زیادہ تر رسد دلی کے قلعہ دار نارو شنکر کی طرف سے پہنچتی تھی۔نجیب الدولہ نے امیر لشکر سے مشورہ کرنے کے بعد معظم علی کی قیادت میں اپنی فوج کا ایک حصہ مرہٹوں کی رسد و کمک کے راستوں پر چھاپہ مارنے کے لئے بھیج دیا۔چند دن کے بعد یہ چھاپہ مار دستے دلیّ اور پانی پت کے درمیان آمدورفت کے تمام راستے بند کر چکے تھے۔مرہٹہ فوج قحط کا سامنا کر رہی

تھی، افغان فوج کو زیادہ تر رسد روہیل کھنڈ کے علاقوں سے ملتی تھی۔ بھاؤ صاحب نے کھنڈ میں گوبند پنتھ کو صورت حال سے خبر دار کیا۔ اور اس نے بارہ ہزار تیز رفتار سواروں کے ساتھ روہیل کھنڈ پر یلغار کر دی۔ چند دن میں وہ رہیلوں کے کئی علاقے تباہ و برباد کرنے کے بعد میرٹھ تک پہنچ چکا تھا۔ اور افغان فوج کو خوراک کی ترسیل بند ہو چکی تھی۔ مرہٹہ کیمپ کی طرح افغان فوج کے پڑاؤ میں بھی قحط کے اثرات محسوس کیے جا رہے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے جرنیلوں نے مشورہ دیا کہ ہمیں یا تو فوراً مرہٹوں پر حملہ کر دینا چاہیے یا یہاں سے پیچھے ہٹ جانا چاہیے۔ ورنہ ہمیں چند دنوں تک ایک خطرناک قحط کا سامنا کرنا پڑے گا۔ احمد شاہ ابدالی کا جواب یہ تھا، تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ انتظار کرو۔ اور دیکھو ہمارے مقدر میں فتح ہے پسپائی نہیں۔

احمد شاہ ابدالی کی جوابی کاروائی یہ تھی کہ اس نے مرہٹوں کے کیمپ کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اور اپنے اور دشمن کے پڑاؤ کے درمیان پانچ ہزار سپاہیوں کی ایک اور چوکی قائم کر دی۔ اور وہاں اپنے لئے سرخ رنگ کا ایک چھوٹا سا خیمہ نصب کروایا۔ یہ چھوٹا سرخ خیمہ اس عظیم فوج کا ہیڈ کوارٹر تھا، جو اپنی تلوار کی نوک سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا صفحہ الٹنے والی تھی۔ احمد شاہ ابدالی دن بھر گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی بیرونی چوکیوں کا معائینہ کرتا۔ اور بسا اوقات اسے ایک دن میں پچاس ساٹھ میل سواری کرنا پڑتی۔ رات کے وقت اس کی اگلی چوکیوں کے سپاہی دشمن کے پڑاؤ تک پہنچ جاتے۔ اور باقی فوج کے کئی دستے مرہٹوں کی رسد و کمک کے راستوں پر چھاپہ مارتے۔

۷ دسمبر کو احمد شاہ ابدالی کے ایک جرنیل عطاء خاں کی قیادت میں سواروں کی ایک فوج نے ایک دن میں پچاس میل یلغار کر کے گوبند پنتھ کو جا لیا۔ اور بارہ ہزار

کے اس لشکر کو تہہ تیغ کر ڈالا۔ جو کئی دن سے رسد و کمک کے راستے پر افغانوں کو پریشان کر رہا تھا۔ چند دن بعد معظم علی اور اکبر خاں نیرات کے وقت مرہٹہ کیمپ کے ان دستوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جو گھوڑوں کے لئے چارہ تلاش کرنے کی نیت سے نکلے تھے۔

۶ جنوری ۱۷۶۱ کو دلی سے ایک قافلہ جو مرہٹہ فوج کے لئے رسد اور تنخواہیں لے کر آ رہا تھا۔ افغان چھاپہ ماروں کے دستے کے نرغے میں آ گیا۔ اور اس قافلے کے بہ تکلم آدمی ایسے تھے جنھیں افغان سرداروں نے بچ نکلنے کا موقع دیا۔ اب مرہٹہ کیمپ پر بے چارگی، بے بسی، اور خوف چھایا ہوا تھا۔ قریباً چار لاکھ انسان ایک ایسے پڑاؤ میں بری طرح گھرے ہوئے تھے۔ جہاں سفائی کا انتظام ناممکن تھا۔ سینکڑوں آدمی روزانہ بھوک سے مر رہے تھے۔ اور سینکڑوں غلاظت اور تعفن کے باعث پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار ہو رہے تھے۔ وہ فوج جو اپنی تعداد اور اسلحہ کی برتری کے نشہ میں غزنی تک پہنچنے کا عزم لے کر نکلی تھی، اب کیمپ سے باہر جاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ مرہٹے دن بھر اپنے پڑاؤ کے چاروں طرف افغان شاسواروں کے تیز رفتار گھوڑوں کے سموں سے اٹھنے والے گرد و غبار دیکھتے تھے۔ اور موسم سرما کی طویل اور اداس راتیں گزارنے کے بعد جب وہ صبح کے وقت بیدار ہوتے تو انھیں اپنے خیموں میں دشمنوں کی گولیوں کے نشان دکھائی دیتے تھے، بھوک سے مرنے والے انسانوں، گھوڑوں اور بیلوں کا تعفن میلوں تک پھیل چکا تھا۔ فضا میں دن بھر چیلوں اور گدھوں کے غول نظر آتے تھے۔

○

ایک دن احمد شاہ ابدالی کے خیمے میں بڑے، بڑے سردار جمع تھے، صلح کے لئے

مرہٹوں کی پیش کش پر غور کیا جا رہا تھا۔شجاع الدولہ جس کی وساطت سے مرہٹوں نے صلح کے لئے سلسلہ جنبانی کی تھی۔احمد شاہ ابدالی سے کہہ رہا تھا۔عالی جاہ! مرہٹے فاقہ کشی سے تنگ آ چکے ہیں۔اور وہ صلح کے لئے ہماری ہر شرط ماننے کو تیار ہیں۔اگر ان کی پیش کش ٹھکرا دی گئی تو انھیں مجبوراً میدان میں آنا پڑے گا۔اور اس گئی گزری حالت میں بھی ان کی فوجی طاقت ایسی نہیں، کہ انھیں آسانی سے شکست دی جا سکے۔وہ دلّی خالی کر کے واپس جانے کے لئے تیار ہیں۔ان سے یہ وعدہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ وہ دوبارہ شمال کا رخ نہیں کریں گے۔اگر ہم لڑے بغیر اپنا مقصد حاسل کر سکتے ہیں۔تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نجیب الدولہ ہزاروں جانیں ضائع کرنے پر کیوں مُصر ہیں۔

نجیب الدولہ نے کہا۔عالی جاہ ہمارا مقصد مرہٹوں کو پانی پت کے میدان سے بھگانا نہیں، بلکہ اس طاقت کو ختم کرنا ہے جو اس **ملک** میں مسلمانوں کی عزت اور بقا کے لئے ایک خطرہ عظیم بن چکی ہے۔مرہٹے اب لڑے بغیر اس لئے واپس جانا چاہتے ہیں کہ انھیں لڑائی میں اپنی تباہی نظر آتی ہے،لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ دوبارہ زیادہ تیاری کے ساتھ واپس نہیں آئیں گے۔شجاع الدولہ نے کہا۔ان کے سامنے یہ شرط پیش کی جا سکتی ہے، کہ وہ اپنے چند سرداروں کو بطور یرغمال ہمارے پاس چھوڑ دیں۔

نجیب الدولہ نے جواب دیا، ہمارا معاملہ چند سرداروں کے ساتھ نہیں، مرہٹہ قوم کے ساتھ ہے جو پورے ہندوستان پر قابض ہونے کا عزم کر چکی ہے۔اگر چند سرداروں کی جان کا خطرہ اس کے ارادوں میں حائل ہو تو اسے نئے سردار تلاش کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔مجھے اپنے اکابر کی ذہنیت پر تعجب ہوتا ہے، جو ایک

ایسے دشمن کے ساتھ سودا بازیوں سے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ جس کی پوری تاریخ ریاکاری، بدعہدی، اور مکر و فریب کی داستانوں سے لبریز ہے۔ میں آپ کو ان لوگوں کے ساتھ مصافحہ کرنے کا مشورہ نہیں دونگا، جن کے ہاتھ میری قوم کے بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ ہمارا سابقہ ایک ایسے دشمن کے ساتھ ہے، جو حالات کے مطابق اپنا طریق کار بدلتا رہتا ہے۔ جو طاقت ور کے سامنے بھیڑ اور کمزور کے سامنے شیر بن جاتا ہے۔ میں مرہٹوں کے ساتھ صلح کی بات کرنے سے پہلے اپنے معزز دوست سے یہ گزارش کروں گا، کہ وہ ہمارے ساتھ بحث کرنے سے پہلے اپنی فوج کے کسی معمولی سپاہی کے ساتھ مشورہ کرلیں، اگر وہ یہ کہے کہ مرہٹوں کے یہاں زندہ و سلامت بچ نکلنے کے دو یا تین سال بعد لکھنو کی گلیاں، ان کی لوٹ مار اور قتل و غارت سے محفوظ ہوں گی تو میں اپنا موقف بدلنے کو تیار ہوں۔ مرہٹوں کی منزل مقصود پانی پت نہ تھی۔ ان کی نگاہیں کابل، قندھار اور غزنی پر تھیں۔ اب وہ شاید یہ محسوس کرتے ہیں۔ کہ ان کا یہاں آنا ایک احمقانہ فعل تھا، اور ان کا یہ سمجھ لینا بھی ایک حماقت تھا، کہ ہم آنکھیں بند کرکے ان کی توپوں کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔ اب ان کے لئے اپنی غلطی کی تلافی کی یہی صورت باقی رہ گئی ہے، کہ وہ یہاں سے بچ کر چلیں جائیں۔ اور ان تجربات سے فائدہ اٹھا کر اگلے سال یا اس سے اگلے سال زیادہ تیاریوں کے ساتھ واپس آئیں۔ اگر ہم نے انھیں صحیح سلامت بچ نکلنے کی اجازت دی تو مستقبل کے مورخ ہمیں ان کی نسبت زیادہ احمق خیال کریں گے۔ میں آئندہ کسی وقت ان کے ساتھ لڑنے کی بجائے آج ہی ان سے نپٹ لینا بہتر سمجھتا ہوں۔ اور اگر میرے معزز دوست حقیقت پسندی کا ثبوت دیں۔ تو انھیں بھی یہی فیصلہ کرنا پڑے گا۔ مرہٹے زندہ رہو اور زندہ

رہنے دو کے اصول کے قائل نہیں، اگر وہ جنگ کے میدان سے بچ نکلنے کے لئے ہمارے ساتھ مصالحت کرلیں۔تو اس بات کی کیا ضمانت ہے۔کہ وہ واپس جاتے ہوئے مہاراشٹر تک راستے کی بستیوں اور شہروں کو راکھ کے انبار بنا کر نہیں رکھ دیں گے۔اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جس تلوار کو وہ ہمارے سپاہیوں کے سامنے بے نیام کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔وہ ان کے راستے کے نہتے اور بےبس انسانوں کے قتل عام سے دریغ کرے گی۔

عالی جاہ میرے حلق میں چیخوں کے سوا کچھ نہیں۔میں نے اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کے ہاتھوں اپنی قوم کی ذلت اور رسوائی کے دل خراش مناظر دیکھے ہیں۔میں نے رہیل کھنڈوں کی بستیوں اور دلی کے بازاروں میں ان درندوں کو انسانیت کا منہ نوچتے دیکھا ہے۔میں ان کے قول وقرار پر اعتماد نہیں کرسکتا، اور نواب شجاع الدولہ کو بھی میں یہ مشورہ دونگا کہ انھیں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔مجھے رہیل کھنڈ کی طرح اودھ کی سرحدوں پر بھی کوئی ایسی دیوار دکھائی نہیں دیتی، جو مرہٹوں کی جارحیت کو روک سکتی ہو۔مجھے تو ان سے یہ بات بھی بعید معلوم نہیں ہوتی کہ وہ نواب شجاع الدولہ کی کوششوں کی طفیل یہاں سے بچ کر نکلیں گے، اور واپس جاتے ہوئے لکھنو میں اپنی وحشت اور بربریت کی ناقابل فراموش یادگار چھوڑ جائیں گے۔

نواب شجاع الدولہ نے کہ۔نجیب الدولہ کو میرے متعلق غلط فہمی ہوئی۔اگر آپ حضرات کی رائے یہی ہے کہ مرہٹوں کے ساتھ بہر حال جنگ ہونی چاہیے۔تو ہمیں تیار رہنا چاہیے۔اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری فوج کسی سے پیچھے نہیں رہے گی۔

○

۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کا آفتاب ہندوستان کی تاریخ کا ایک عظیم ترین معرکہ دیکھ رہا تھا۔طلوع سحر کے ساتھ مرہٹوں نے میلوں لمبی صفوں میں اپنے پڑاؤ سے نکل کر آگے بڑھنا شروع کیا۔ان کے میسرہ پر گاردی کے دستے تھے۔اوراس کے ساتھ گیکوارکی فوجیں تھیں ۔ میمنہ میں ملہار راؤ ملکر اور جنکو جی سندھیا تھے،قلب لشکر میں بھاؤاور بشواش راؤ ایک جنگی ہاتھی کے ہودج میں بیٹھے تھے۔ مسلمانون کے لشکر کے قلب میں احمد شاہ ابدالی کا وزیر اعظم شاہ ولی خان تھا۔اوراس کی کمان میں درانی فوج کے وہ آزمودہ کارجان باز تھے جو کئی میدانوں میں دادشجاعت دے چکے تھے۔ میسرہ پر شاہ پسند خان اور نجیب الدولہ تھے۔شجاع الدولہ کی فوج میسرہ اور قلب لشکر کے درمیان تھی، میمنہ کی قیادت برخوردار خاں کے ہاتھ میں تھی۔اور روہیلہ ،مغل، اور بلوچ سپاہیوں کے کئی دستے اس کے ساتھ تھے۔

احمد شاہ ابدالی ایک سفید گھوڑے پر سوار ہوکر اپنی عقابی نگاہوں سے میدان جنگ کا نقشہ دیکھ رہا تھا۔برق رفتار سوارون کی ایک جماعت فوج کے جرنیلون اور سواروں کوایک کونے سے دوسرے کونے تک اس کی ہدایات پہنچانے میں مصروف تھی۔جنگ کی ابتدا مرہٹہ توپوں کی آتش بازی سے شروع ہوئی،اوراس کے بعد گاردی کے تربیت یافتہ دستوں نے افغان فوج کے دائیں بازو کے روہیلہ دستوں پر سنگینوں سے حملہ کردیا۔روہیلون کے پیچھے ہٹتے ہی بھاؤ نے اپنے سواروں کوایک عام حملے کا حکم دیا۔اورافغان فوج کی اگلی تین صفیں درہم برہم کردیں۔پانی پت کا معرکہ اب پوری شدت سے شروع ہوچکا تھا۔گردوغبار کے بادلون میں گھوڑوں کی ٹاپ،توپوں کی دھنا دھن، بندوقوں کے دھماکوں،تلواروں کی جھنکار اور زخمیوں کی

چیخ و پکار کے ساتھ ایک طرف سے اللہ اکبر اور دوسری طرف سے ہر ہر مہادیو کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ شاہ ولی خاں نے افغانوں کو پیچھے ہٹتے دیکھا، تو گھوڑے سے اتر کر پوری قوت سے چلایا۔ میرے رفیقو تم کہاں جا رہے ہو ہمارا وطن بہت دور ہے۔ لیکن اس کی آواز جنگ کے مہیب ہنگاموں میں گم ہو کر رہ گئی۔

جنگ کے ابتدائی دور میں مرہٹوں کا پانسہ بھاری معلوم ہوتا تھا۔ افغانوں کے میمنہ اور قلب لشکر میں افراتفری پھیل چکی تھی۔ لیکن میسرہ کی افواج ابھی تک پوری طرح منظم تھی۔ نجیب الدولہ جوابی حملہ کر چکا تھا، اور اس کے ساتھ حافظ رحمت خاں اور دوسرے روہیلہ سرداروں کی افواج پوری شدت سے دباؤ ڈال رہی تھی۔ نجیب الدولہ کے پیادہ سپاہی دشمن کی صفوں پر ہوائیاں اور گولے پھینکتے، اور جب دشمن پیچھے ہٹتا تو نیزہ باز ٹوٹ پڑتے۔ معظم علی کی کمان میں ایک ہزار روہیلہ سوار تھے، اور ان میں سے اکثر اکبر خان کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نے مرہٹہ لشکر کے میمنہ پر حملہ کیا۔ اور چند منٹ کے اندر، اندر جنکو جی سندھیا کی فوج کی کئی صفیں الٹ کر رکھ دیں۔ اس کے بعد دوسرے روہیلہ سردار اور نجیب الدولہ کے چند دستے اس کے ساتھ جا ملے اور انھوں نے پے در پے حملے کر کے دشمن کو پیچھے ہٹانا شروع کر دیا۔

سورج نصف النہار تک پہنچ چکا تھا، لیکن لڑنے والوں کو گرد و غبار کے بادلوں میں اس کے صرف دھندلے سے آثار نظر آتے تھے۔ جنگ اب اس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ کہ جب ہر وقت فریقین میں سے کسی ایک کو میدان چھوڑ کر بھاگ نکلنے کا امکان تھا۔ اس ہنگامہ محشر میں جس شخص کے چہرے پر اضطراب گھبراہٹ یا پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔ وہ احمد شاہ ابدالی تھا۔ اس کی پیشانی پر اپنے سپاہیوں

کے لئے فتح کی بشارت لکھی ہوئی تھی۔مرہٹے اپنی ساری قوت میدان میں لا چکے تھے۔لیکن احمد شاہ ابدالی کے ترکش میں ایک آخری تیر ابھی باقی تھا۔دوپہر کے وقت اس نے اپنی محفوظ فوج کے ان چودہ ہزار سواروں کو میدان میں آنے کا حکم دیا۔جنھیں جنگ شروع ہونے سے قبل میدان سے پیچھے ہٹا دیا گیا تھا۔اس کے ساتھ ہی اس نے ہر محاذ سے اپنے جرنیلوں کو فیصلہ کن حملہ کرنے کا حکم دیا۔اب گردوغبار کی یہ حالت تھی۔کہ زمین اور آسمان میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ابدالی کے محفوظ دستے اس کے لشکر کے عقب سے ایک آندھی کی طرح نمودار ہوئے۔اور دشمن کے میمنہ اور میسرہ کی صفوں کو چیرتے ہوئے اس کے عقب میں جا پہنچے۔تازہ دم فوج کے میدان میں آجانے سے محفوظ فوج کے دستے دشمن کی صفیں روندتے ہوئے، کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف نکل جاتے، سوا دو بجے کے قریب بشواش راؤ

گولی لگنے سے زخمی ہوگیا۔بھاؤ نے دل برداشتہ ہوکر آخری بار پوری شدت سے حملہ کیا، اور بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔سپہ سالار کی موت سے مرہٹوں کے حوصلے پست ہوگئے اور شام چار بجے کے قریب یکا یک ان کی ساری فوج میدان سے بھاگ نکلی۔فاتح فوج نے ان کا پیچھا کیا اور مرہٹہ کیمپ کی خندق لاشوں سے بھر دی۔آفتاب کی واپسیں نگاہیں کوسوں دور تک مرہٹوں کی تباہی کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ابدالی کا لشکر چاندنی رات میں طلوع سحر تک مرہٹوں کا تعاقب کرتا رہا۔اگلی صبح کیمپ میں پناہ لینے والے بچے کھچے دستوں پر بھی یلغار کی گئی۔بشواش راؤ زخمی ہونے کے چند گھنٹوں بعد مر چکا تھا۔میدان سے بھاگنے والی مرہٹہ فوج کا تعاقب کرنے والے صرف افغان روہیلے، بلوچ اور مغل ہی نہ تھے۔بلکہ قرب و جوار کے وہ دیہاتی جن پر مرہٹوں نے پانی پت میں قیام کے دوران میں ان گنت مظالم کیے تھے۔

تلواروں برچھیوں اور لاٹھیوں سے مسلح ہو کر جگہ، جگہ انھیں موت کے گھاٹ اتار رہے تھے ۔مرہٹوں سے عوام کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ دیہات کی عورتیں ان کا پیچھا کر رہی تھیں ۔مرہٹہ کیمپ کا مال غنیمت کسی بڑی سلطنت کے خزانوں سے کم نہ تھا ۔جوہرات سونے اور چاندی کے علاوہ ہزاروں بیل گاڑیاں، کوئی دو لاکھ مویشی، ہزاروں گھوڑے اور اونٹ اور پانچ سو ہاتھی افغانوں کے ہاتھ لگے ۔

مرہٹہ فوج کے بے شمار سردار جنگ میں کام آ چکے تھے ۔اگلے دن مرہٹوں کے تعاقب سے واپس آنے والے جرنیل اور بڑے، بڑے افسر احمد شاہ ابدالی کے سامنیاری، باری اپنی کارگزاری کی تفصیلات بیان کر رہے تھے ۔دوپہر تک تقریباً تمام فوج کیمپ میں جمع ہو چکی تھی ۔لیکن معظم علی اور اس کی کمان کے چند دستے لاپتہ تھے ۔اکبر خان اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے اسے

رات کے پچھلے پہرہ کر کے ساتھ فرار ہونے والے سپاہیوں کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھا تھا ۔غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے جب اکبر کاں اس کی تلاش میں کیمپ کے اندر کئی چکر لگا چکا تھا ۔اور نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خان اور دوسر یرو ہیلہ سردارا سے تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے ۔ایک روہیلہ سپاہی نے جنوب مشرق کے افق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا ۔شاید وہ آ رہے ہیں

۔

اکبر خاں نے چونک کر دیکھا اور اسے دور حد نگاہ پر چند شتر سوار دکھائی دیے، اس نے یمضطر ب ہو کر کہا لیکن وہ گھوڑوں پر تھے یہ کوئی اور ہیں ۔

نجیب الدولہ نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ۔بیٹا تمھیں مایوس نہیں ہونا چاہیے ۔معظم علی ضرور آئے گا ۔اور اکبر خاں اپنے دل میں

کہہ رہا تھا۔انھیں ضرور آنا چاہیے۔ہماری یہ شاندار فتح ان کے لئے تھی۔ ہماری اس کامیابی پر ان سے زیادہ کسی کو خوش ہونے کا حق نہیں ۔پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوکر بولا۔تم تیار ہو جاؤ ہم ان کی تلاش میں جا رہے ہیں ۔ مجھے یقین ہے وہ کسی جگہ دشمن کے گھیرے میں آ چکے ہیں ۔

نجیب الدولہ نے کہا دشمن میں اب لڑنے کی طاقت نہیں رہی ۔اور اس وقت کسی گھوڑے میں سوار کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رہی۔

ہم پیدل جائیں گے اکبر نے کہا

نجیب الدولہ نے جواب دیا ۔اپنے ساتھیون کو تھوڑی دیر آرام کرنے دو ۔ اگر معظم علی شام تک نہ آیا، تو ہم چند دستے اس کی تلاش میں بھیج دیں گے۔تھکاوٹ کے باعث اکبر خاں کے اعضا شل ہو چکے تھے۔وہ کچھ اور کہے بغیر زمین پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد شتر سوار کیمپ میں داخل ہو چکے تھے ۔ایک نوجوان بھاگتا ہوا آیا ۔اور اس نے بلند آواز میں کہا، اکبر، اکبر معظم علی آ گئے ۔کہاں ہیں وہ؟ اکبر خاں نے جلدی سے اٹھ کر سوال کیا۔نوجوان نے اس کے جواب میں شتر سواروں کی طرف اشارہ کیا۔اکبر خاں بھاگ کر آگے بڑھا۔معظم علی ایک اونٹ پر سوار تھا۔اس کا چہرہ گرد وغبار سے اٹا ہوا تھا۔اس کی قبا خون سے رنگی ہوئی تھی ۔اس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور آنکھیں بند تھیں ۔اس نے ڈھیلے ہاتھ سے اونٹ کی نکیل پکڑ رکھی تھی

بھائی جان، بھائی! اکبر کان نے اس کے ہاتھ سے اونٹ کی نکیل پکڑتے ہوئے کہا۔آپ ٹھیک ہیں نا۔آپ زخمی تو نہیں؟

معظم علی نے نیم بے ہوشی کی حالت میں آنکھیں اوپر اٹھائیں، اور تھکی ہوئی آواز میں کہا میں بالکل ٹھیک ہوں۔

اکبر خاں نے نکیل کھینچ کر اونٹ بٹھا دیا، اور معظم علی نیچے اتر پڑا۔ اکبر خاں کو اس کی آستین پر تازہ خون کے نشان دکھائی دیے۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ بھائی جان آپ زخمی ہیں۔

معظم علی مسکرایا یہ معمولی خراش ہے۔

معظم علی! معظم علی تم کہاں تھے۔ نجیب الدولہ نے آگے بڑھ کر کہا۔ میں بہت دور نکل گیا تھا۔ معظم علی نے یہ کہہ کر لڑکھڑاتے ہوئے

نجیب الدولہ کی طرف چند قدم بڑھائے۔ لیکن اچانک اس کی طاقت جواب دے گئی اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اکبر نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں نے بیک وقت آگے بڑھ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی، ایک سپاہی نے پانی کی چھاگل اتار کر اس کے منہ سے لگا دی۔ معظم علی نے پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد کہا۔

آپ لوگوں کو مطلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا مجھے تھوڑی دیر آرام کی ضرورت ہے۔

حافظ رحمت خاں نے اس کی آستین پھاڑ کر بازو کا زخم دیکھتے ہوئے کہا۔ زخم معمولی ہے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

ایک سپاہی نے اپنا پٹکا پھاڑ کر بازو باندھ دیا۔ اور وہ دوبارہ زمین پر لیٹ گیا۔

نجیب الدولہ نے کہا اسے میرے خیمے میں لے جاؤ

نہیں معظم علی نے نحیف آواز میں جواب دیا۔ مجھے تھوڑی دیر یہیں رہنے دیجیے ۔چند ثانیے بعد معظم علی گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے ساتھی بھی اب اونٹوں سے اتر کر اس کے گرد جمع ہو چکے تھے، ایک نوجوان نجیب الدولہ کو بتا رہا تھا۔ ہم نے چالیس میل تک دشمن کا پیچھا کیا تھا۔ ہمارے گھوڑے دم توڑ چکے تھے۔ تو ہم پیدل ان کا

پیچھا کر رہے تھے۔ یہ اونٹ ہم نے مرہٹوں سے چھینے تھے۔ اور ہمارے پچاس اور ساتھی پیدل واپس آ رہے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد احمد شاہ ابدالی اپنے چند جرنیلوں کے ساتھ پڑاؤ میں گشت کر تا ہوا ادھر آ نکلا۔ یہ کون ہے۔ اس نے معظم علی کے قریب پہنچ کر سوال کیا۔

نجیب الدولہ نے جواب دیا عالی جاہ یہ معظم علی ہے۔ یہ ابھی مرہٹوں کے تعاقب سے واپس آیا ہے۔

اس کے زخم زیادہ خطرناک تو نہیں؟

نہیں عالی جاہ! یہ بہت تھک گیا ہے۔

شاہ ولی خاں نے کہا۔ میں اسے میدان میں کئی بار دیکھ چکا ہوں، اور اگر یہ اب تک دشمن کا پیچھا کر رہا تھا، تو اس کا زندہ رہنا معجزہ ہے۔

ابدالی نے کہا یہاں سردی ہے اسے خیمے کے اندر لے جاؤ۔

اکبر خاں نے معظم علی کا بازو پکڑ کر ہلایا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ اپنے سامنے ابدالی کو دیکھ کر اٹھا اور باادب کھڑا ہو گیا۔

ابدالی نے اس کے خون آلود کپڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اب جنگ ختم ہو چکی ہے تمہیں اس سے بہتر لباس کی ضرورت ہے۔ پھر اس نے اپنے ایک افسر کی طرف دیکھا اور کہا۔ جاؤ اسے میرا لباس لا دو۔

چند دن بعد احمد شاہ ابدالی کی فوج دلی کا رخ کر رہی تھی۔ پانی پت کی شکست مرہٹہ تاریخ کی ایک مکمل شکست تھی۔ ہلکر داماجی، گیکوار، نارو شنکر، مہادیو جی، سندھیا اور نانا فرنویس، کے سوا تمام بڑے، بڑے مرہٹہ سردار مارے جا چکے تھے۔ ابراہیم گاردی جسے مسلمانوں کا بدترین غدار سمجھا جاتا تھا۔ گرفتار ہونے کے بعد قتل کیا گیا۔

شمشیر بہادر اور انتاجی، منگیشور جو زخمی ہو کر بھاگ گئے تھے۔ راستے میں مر گئے۔ مرہٹوں کی عظیم فوج میں سے صرف ایک چوتھائی سپاہی ایسے تھے جنہیں دوبارہ اپنا وطن دیکھنا نصیب ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کو بھی اس فتح کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ لیکن وہ عظیم مقصد جس کے لئے جنگ لڑی گئی تھی۔ پورا ہو چکا تھا۔ شمالی ہندوستان میں پاؤں پھیلانے کے متعلق مرہٹوں کے عزائم ہمیشہ کے لئے خاک میں مل چکے تھے۔

چودھواں باب

چند دن بعد افغان افواج دلی کے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔اور شہر میں پانی پت کی فتح کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔جمعہ کے روز جامع مسجد میں عید کا سا سماں تھا۔اہل شہر کے علاوہ فوج کے افسر اور سپاہی مسجد کے اندر اور مسجد کی چار دیواری سے باہر کھلے میدان میں جمع تھے۔نماز کے بعد احمد شاہ ابدالی کی عزت اقبال اور درازی عمر کی دعا کی جا رہی تھی۔دعا کے بعد جب نمازی اٹھنے لگے تو خطیب نے بلند آواز میں کہا۔حضرات تھوری دیر ٹھہر جائیے،پانی پت کا ایک مجاہد اُپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔نمازی ہمہ تن گوش ہو کر منبر کی طرف دیکھنے لگے۔معظم علی اٹھ کر منبر کے قریب پہنچا۔اور اس نے بلند آواز میں کہا۔

عزیزو اور بزرگو! پانی پت کی فتح بلا شبہ ہماری تاریخ کا شاندار کارنامہ ہے۔ ہمارے بعد آنے والی نسلیں احمد شاہ ابدالی کو اپنا محسن عظیم خیال کریں گی۔انھوں نے ہمیں اس وقت سہارا دیا ہے،جب ہم تباہی کے کنارے پہنچ چکے تھے۔انھوں نے ہمیں اس دشمن سے نجات دلائی،جو ہمیں بدترین غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتا تھا۔ہم ان کے احسانات کا بدلہ نہیں دے سکتے۔لیکن اس وقت ہماری دعاؤں کے سب سے زیادہ مستحق پانی پت کے وہ شہدا ہیں۔جنھوں نے ہماری عزت،ہماری آزادی اور ہماری بقا کے لئے اپنا خون پیش کیا ہے۔آج ان گمنام شہیدوں کی روحیں ہم سے یہ مطالبہ نہیں کرتیں،کہ ہم پانی پت کے میدان میں جا کر ان کی قبرون پر چراغ جلائیں۔ان کا مطالبہ سرف یہ ہے کہ ہم کسی وقت بھی اس مقصد سے انحراف نہ کریں۔جس کے لئے وہ اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔پانی پت کے شہیدوں نے ہمین اس ملک میں آزادی اور عزت کی زندگی بسر کرنے کا ایک اور موقع دیا ہے

۔اور اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا، تو ہمیں یہ جان لینا چاہیے، کہ قدرت کسی گرتی ہوئی قوم کو بار، بار سنبھالا نہیں دیتی۔

ہمارے عظیم محسن احمد شاہ ابدالی نے ہمیں اس وقت ایک نئی زندگی کا پیغام دیا ہے۔ جب کہ ہمارے دروازے پر موت کا پہرہ تھا۔انھوں نے ایک منتشر، مفلوک الحال، اور مایوس قافلے کو اٹھا کر پھر زندگی کی شاہراہ پر ڈال دیا ہے۔اب یہ سوچنا ہمارا کام ہے، کہ ہماری اگلی منزل کیا ہے؟ ہماری ماضی کی وہ کون سی کوتاہیاں تھیں۔جن کے باعث مرہٹوں کی بربریت اور وحشت کا طوفان اٹک تک پہنچ چکا تھا ۔اور ہم سے ہمارے حال اور مستقبل کے مطالبات کیا ہیں؟

احمد شاہ ابدالی اپنے حصے کا کام پورا کر چکے ہیں۔لیکن ہمارے حصے کا کام ابھی باقی ہے۔پانی پت کی جنگ میں مرہٹوں کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔لیکن ہمیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔اگر ہم نے اپنی کمزوریوں کا علاج نہ کیا، تو ممکن ہے کہ چند برس کے اندر، اندر ہمیں مرہٹوں سے زیادہ خطرناک دشمن کا سامنا کرنا پڑے۔بنگال میں ہماری آزادی کے پرچم سرنگوں ہو چکے ہیں۔کرناٹک فرنگیوں کی شکار گاہ بن چکا ہے۔اوران کی سازشیں دکن تک پہنچ چکی ہیں۔ پنجاب میں سکھوں کی طاقت ابھر رہی ہے۔اور اگر ہم نے آنکھیں نہ کھولیں تو یہ بعید نہیں کہ ہمارے لئے اس ملک کی سرزمین تنگ ہو جائے۔جس پر ہم نے صدیوں حکومت کی ہے۔

حضرات احمد شاہ ابدالی نے ہمین ایک خطرہ عظیم سے نجات دلائی ہے۔لیکن وہ ہمیشہ کے لئے اس گھر کی حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتے، جس کے مکینوں نے چوروں اور ڈاکوؤں کو اپنا محافظ سمجھ رکھا ہو۔ہماری بے بسی اور مظلومیت کا باعث وہ

مفاد پرست امراء ہیں۔جنھوں نے قوم کے مستقبل سے بے پرواہ ہوکر دلی کی عظیم سلطنت کو چھوٹے، چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرلیا ہے۔ہماری مایوسی اور بد دلی کا باعث وہ محلاتی سیاست ہے جو ہر ضابطہ اخلاق سے آزاد ہوچکی ہے۔بنگال میں مٹھی بھر انگریزوں سے ہماری شکست کا باعث وہ وطن فروش تھے۔جنھوں نے قوم کا ساتھ چھوڑ کر اپنا مستقبل انگریزوں کے ساتھ وابستہ کرلیا ہے۔اور اگر آپ نے بنگال کے واقعات سے سبق نہ لیا اور اسی طرح انتشار اور لامرکزیت کی لعنتوں میں مبتلا رہے،تو بنگال کی تاریخ ملک کے ہر حصے میں دہرائی جائے گی۔کسی قوم کے لئے اس سے بڑا عذاب اور کیا ہوسکتا ہے کہ ملت فروش اس کی عزت اور آزادی کے امین بن جائیں۔اور حریص طالع آزما اقتدار کی مسندون پر متمکن ہو جائیں۔گزشتہ نصف صدی کے واقعات سے ہم پر یہ حقیقت اچھی طرح واضع ہوچکی ہے کہ یہ دنیا کسی کمزور قوم کو عزت اور آزادی کے ساتھ زندہ رہنے کا حق نہیں دیتی۔جو ملک انتشار اور لامرکزیت کا شکار ہوتا ہے۔وہ لامحالہ انسانی بھیڑیوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

آج اس مسجد میں وہ لوگ موجود ہیں جنکی حقیقت پسندی ہمیں مستقبل کے خطرات سے بچاسکتی ہے۔اب وقت آگیا ہے کہ ملک کے باشعور لوگ ان جاہ پسندوں کے خلاف عوام کی قوت محاسبہ بیدار کریں جن کی چیرہ دستیوں کے باعث ہماری قوت مدافعت اس قدر کمزور ہوچکی ہے کہ ہم اپنے حقیر ترین دشمنوں کا مقابلہ بھی نہیں کرسکتے۔پانی پت کی جنگ اس لئے نہیں لڑی گئی ہے کہ ہمارے حکمران مرہٹوں کی طرف سے مطمئن ہوکر اپنی مسندوں پر سو جائیں۔یا انھیں کچھ عرصہ اور عیش وعشرت کی محفلیں آراستہ کرنے کا موقع مل جائے۔پانی پت کی جنگ اس لئے

لڑی گئی ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کو عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کا ایک اور موقع دیا جائے ۔ میں اس ملک کی حکومت کے دعویداروں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ ماضی سے سبق سیکھیں۔اوران غلطیوں کا اعادہ نہ کریں،جن کے باعث بنگال میں ہم ایک عبرت ناک تباہی کا سامنا کر چکے ہیں ۔اور میں عوام سے یہ بھی درخواست کروں گا، کہ وہ اپنے گردوپیش سے خبر دار رہیں ۔ اور جب انھیں کوئی بیرونی حملہ آورللکاررہاہوتو وہ میدان میں آنے سے پہلے یہ تسلی کرلیں کہ ان کی صفوں میں کوئی میر جعفر تو نہیں ۔

حضرات مجھے تقریر کرنے کا شوق نہ تھا۔میں صرف ایک سپاہی ہوں ۔ میں نے بنگال کی آزادی کے لئے اپنی جان کی بازی لگائی تھی ۔میرا باپ ،میرا بھائی اور میرے بہترین دوست بنگال پر قربان ہو چکے ہیں ۔لیکن یہ بےلوث قربانیاں صرف اس لئے بےنتیجہ ثابت ہوئیں کہ بنگال کیعوام اس قدر بےدار نہ تھے کہ وہ محبان قوم اور وطن فروشوں کے درمیان تمیز کر سکتے ۔ میں نے شہرت اور ناموری ک یلیئے پانی پت کی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ بلکہ میرے دل میں اگر کوئی تڑپ تھی تو یہ تھی کہان بھیانک تاریکیوں کو آپ کے گھروں سے دور رکھا جائے ۔ جو بنگال کے مسلمانون پر مسلط ہو چکی ہیں ۔اور آج میں نے آپ کے سامنے زبان کھولنے کی صرف اسلیئے جرات کی ہے کہ میں آپ کو ان خطرات سے خبر دار کرنا چاہتا ہوں ۔ جو حال اور مستقبل کی طرف سے آنکھیں بند کر لینے کے بعد آپ کو پیش آ سکتے ہیں ۔

اختتام پر میں یہ دعا کرتا ہوں، کہ خدا آپ کو پانی پت کی فتح سے اپنے لئے اور اپنی آئندہ نسلوں کے لئے صحیح نتائج پیدا کرنے کیہمت اور طاقت دے ۔خدا ہمارے امراء اور حکم رانوں کو بھی یہ توفیق دے، کہ وہ قوم کیلئے زندہ رہنا سیکھیں۔

معظم علی کی تقریر کے اختتام پر جب لوگ مسجد سے باہر نکل رہے تھے۔تو ایک افغان افسر نے اس سے کہا۔حضور بادشاہ سلامت آپ کو بلاتے ہیں۔

احمد شاہ ابدالی منبر سے تھوڑی دور دلی کے اکابر اور اپنے سرداروں کے درمیان کھڑے تھے۔معظم علی ان کے قریب پہنچا تو انھوں نے کہا۔میں ایک مدت سے اس ملک کے کسی آدمی کے منہ سے ایسی باتیں سننے کا منتظر تھا۔اگر ہندوستان کے ہر علاقے میں تمھارے جیسے صحیح الخیال لوگ جاگ اٹھیں،تو مجھے یقین ہے کہ یہ قوم تباہی سے بچ سکتی ہے۔پھر انھوں نے ایک ثانیہ شجاع الدولہ کی طرف دیکھا،اور دوبارہ معظم علی کی طرف متوجہ ہوکر کہا۔لیکن اگر تم کسی مرحلہ پر یہ محسوس کرو،کہ اس ملک میں تمھاری خدمات کی ضرورت نہیں،تو سیدھے میرے پاس پہنچ جاؤ۔وہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو حق گوئی کی قدر کرنا جانتے ہیں۔

O

اگلے دن معظم علی ظہر کی نماز ادا کر کے جامع مسجد سے نکل رہا تھا کہ اسے نجیب الدولہ کی فوج کا ایک سپاہی دکھائی دیا۔

آپ کو امیر الامرا نے یاد فرمایا ہے۔سپاہی نے آگے بڑھ کر ادب سے سلام کرتے ہوئے کہا۔

وہ کہاں ہیں؟

وہ فوج کے پڑاؤ میں ہیں۔چلیے!

تھوڑی دیر بعد معظم علی پڑاؤ کے ایک عظیم الشان خیمے کے اندر نجیب الدولہ کے سامنے کھڑا تھا۔نجیب الدولہ نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔کل مسجد میں تمہارے منہ سے میرے دل کی آواز نکل رہی تھی۔لیکن شجاع الدولہ تمہاری تقریر سے بہت

پریشان ہیں۔وہ صبح مجھ سے ملے تھے۔ان کا خیال ہے، کہ تم نے جو کچھ کہا ہے۔وہ سب ان کے متعلق تھا۔وہ مجھ سے کہتے تھے یہ نوجوان لکھنو پہنچ کر میرے لئے سر دردی کا باعث بنے گا۔وہ اس سے پہلے بھی تم سے زیادہ خوش نہ تھے۔لیکن کل تمہاری تقریر نے انھیں بہت زیادہ پریشان کر دیا ہے۔

معظم علی نے کہا۔میرا خیال ہے میں نے کوئی غلط بات نہیں کی۔

میں تمھاری حق گوئی کا معترف ہوں۔لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ شجاع الدولہ کو ناراض کر کے تمھارا لکھنو ٹھہرنا مشکل ہو جائے گا۔

معظم علی نے جواب دیا۔لکھنو میرے سفر کی آخری منزل نہیں۔اور جب مجھے اس بات کا احساس ہو گا کہ وہاں رہ کر میری زبان میرے ضمیر کا ساتھ نہیں دے سکتی، تو میں اپنے لئے کوئی اور جگہ تلاش کرنے میں کوئی تکلیف محسوس نہیں کرونگا۔

نجیب الدولہ نے کہا میں نے شجاع الدولہ کو سمجھا دیا ہے۔اور مجھے امید ہے وہ تم کو پریشان نہیں کرے گا۔لیکن اگر کسی وقت تم کو لکھنو کی آب و ہوا راس نہ آئے تو تمہارے لئے دلیّ کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔اور اگر اس وقت بھی اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں فوج میں بہترین عہدہ دینے کو تیار ہوں۔

معظم علی نے جواب دیا ابھی دلی کے حالات اس قابل نہیں کہ میرے دل میں ملازمت کا شوق پیدا ہو۔جس دن مجھے اس بات کا احساس ہو گا کہ میں یہاں آ کر کوئی مفید کام کر سکتا ہوں

تو آپ مجھے ایک رضا کار کی حیثیت میں یہاں موجود پائیں گے۔مجھے معلوم نہیں کہ احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد دلیّ کے حالات کیا ہونگے۔مجھے آپ کے تدبر اور فراست پر اعتماد ہے۔لیکن جب تک دلیّ کے تخت پر کوئی اولوالعزم حکمران

نہیں بیٹھتا، میرے نزدیک دلّی اور لکھنو میں کوئی فرق نہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ کہ ایسی عظیم الشان فتح کے بعد اس ملک کے اکابر قوم کا مستقبل کسی ایسے حکمران کو نہیں سونپ سکے۔ جس کی سیرت اور کردار رعایا کی بقا اور آزادی کی ضمانت دے سکتا ہو۔ میں یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، کہ قابلیت کے بغیر کوئی شخص اپنے سر پر تاج پہننے کا پیدائشی حق رکھتا ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں ہم اپنے نام نہاد حکمرانوں کی نا اہلیت کے باعث بہت کچھ کھو چکے ہیں۔ قدرت نے ہمیں زندہ رہنے کا ایک اور موقع دیا ہے۔ لیکن کاش ہمارا وہ محسن جس نے ہمیں مرہٹوں کی جارحیت سے نجات دلائی ہے۔ ہمیں یہ مژدہ بھی سنا سکتا کہ دلّی کے تخت کے لئے ایک انسان کی ضرورت ہے، اور اس ملک کے امرا کا فرض ہے، کہ اپنے میں سے بہترین آدمی کو قوم کی سیادت سونپ دیں۔ خدا کرے دلّی کی حکومت کے نئے دعویدار سے آپ کی توقعات درست ثابت ہوں۔ لیکن مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ وہ

صحیح معنوں میں حکمران ثابت ہوگا یا صرف یہاں کے بادشاہ گروں کے ہاتھ میں ایک نیا کھلونا ہوگا۔

تم جانتے ہو کہ میں اس معاملے میں تمہارا ہم خیال تھا لیکن مغل امراء کا یہ مطالبہ تھا، کہ دلّی کے تخت پر کسی جائز وارث کو بٹھایا جائے۔

معظم علی نے جواب دیا۔ میرے نزدیک صرف وہ بات جائز ہوتی ہے جو صحیح بھی ہو۔ شاہ عالم کے متعلق میں اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ وہ دلّی کی سازشوں سے خوف زدہ ہو کر کہیں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور جن امراء نے اسے تخت پر بٹھانے کے لئے بہت زیادہ زور دیا ہے۔ وہ صرف اس بات پر خوش ہیں کہ وہ اپنے باپ سے زیادہ کمزور ثابت ہوگا۔ میرے لئے اگر کوئی بات اطمینان بخش ہے

تو وہ صرف یہ ہے کہ آپ دلّی میں احمد شاہ ابدالی کے نمائندے ہونگے۔اور میں یہ دعا کرتا ہوں کہ نیا شہنشاہ کسی دن آپ سے منہ پھیر کر ان لوگوں کے ہاتھ کا کھلونا نہ بن جائے جو اس سے پیشتر کئی کھلونے توڑ چکے ہیں۔

تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ شاہ عالم ایک ناکام حکمران ثابت ہوگا۔میں اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ وہ ایک کمزور آدمی ہے۔اور اس کی بادشاہت ہمیشہ دوسروں کے رحم وکرم پر ہوگی۔مجھے جلاوطنی کی حالت میں اس کی بے بسی کا احساس ہے۔لیکن مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ تخت پر بیٹھ کر زیادہ بے بس ثابت ہوگا۔

نجیب الدولہ نے موضوع بدلتے ہوئے کہا تم کب واپس جارہے ہو۔

معظم علی نے جواب دیا، میں صرف اس امید پر ٹھہر گیا تھا کہ شاید احمد شاہ ابدالی واپس جانے کا خیال ترک کردیں، اور جنوب کی طرف پیش قدمی کریں۔میں انھیں مہاراشٹر کے میدانوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔لیکن اب میں دو تین دن تک یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔

نجیب الدولہ نے کہا یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ واپس جارہے ہیں۔اگر افغان سردار مخالفت نہ کرتے تو شاید اس وقت تک ہمارے گھوڑے دریائے نربدا کا پانی پی رہے ہوتے۔لیکن میں تمھیں ایک بار پھر یہ مشورہ دونگا کہ تم لکھنو جا کر محتاط رہو۔ شجاع الدولہ ایک منتقم المزاج آدمی ہے۔اگر اس کے دماغ میں یہ بات سما گئی کہ تم اسے پسند نہیں کرتے۔تو وہ تم سے نجات حاصل کرنے کے ہزاروں بہانے تلاش کرے گا۔میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اسے اپنا دشمن بنانے کی بجائے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرو۔ہوسکتا ہے کہ وہ تمھارے خیالات سے متاثر ہوکر وہ قوم کی بھلائی کا کوئی

کام کر سکے

معظم علی مسکرایا قوم کی بھلائی کے لئے میں ایک حقیر ترین انسان کے پاؤں میں اپنا سر رکھنے سے بھی دریغ نہیں کرونگا۔

اور تمھیں شاہ عالم کے متعلق اپنے خیالات کے اظہار میں بھی محتاط رہنا چاہیے۔نواب شجاع الدولہ اور ان کے ہم خیال امراء ان کے بہت زیادہ طرف دار ہیں۔

معظم علی نے جواب دیا میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ انھیں ایک کارآمد کھلونا سمجھتے ہیں۔

معظم علی نجیب الدولہ سے ملاقات کے بعد پڑاؤ میں اپنے خیمے کے قریب پہنچا تو اکبر خاں باہر دھوپ میں بیٹھا ایک نوجوان سے باتیں کر رہا تھا۔معظم علی کو دیکھتے ہی اکبر خاں نے کہا بھائی جان یہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

معظم علی اجنبی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد چٹائی پر بیٹھ گیا۔

اجنبی نے کہ امیرا نام اسد خاں ہے۔میں میسور سے حیدر علی کا ایک خاص پیغام لے کر احمد شاہ ابدالی کے پاس آیا تھا۔کل مسجد میں، میں نے آپ کی تقریر سنی تو آپ سے متعارف ہونے کا شوق پیدا ہوا۔

آپ احمد شاہ ابدالی سے مل چکے ہیں؟

جی ہاں اور دو تین دن تک واپس جا رہا ہوں۔کل آپ کی تقریر سننے کے بعد میں نے فوج کے ایک سپاہی سے آپ کے متعلق کچھ معلومات حاصل کی تھیں۔میں نے یہ ضروری خیال کیا کہ آپ کو کسی دن میسور آنے کی دعوت دوں۔ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق آپ جو خواب دیکھ رہے ہیں وہ انشا اللہ میسور میں پورے ہونگے۔حیدر علی اس دور کی ایک بہت بڑی شخصیت ہے۔وہ جنوبی ہندوستان کو ایک

طرف مرہٹہ کے چیرہ دستیوں سے اور دوسری طرف انگریزوں کی ہوس ملک گیری سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ اور اس نے میسور کے دروازے ہر صحیح الخیال مسلمان کے لئے کھول دیے ہیں۔

وہ دن دور نہیں جب آپ اس کے متعلق یہ سنیں گے کہ جنوبی ہندوستان کے لوگ اسے اپنا نجات دھندہ سمجھتے ہیں۔ میری اپنی سرگزشت یہ ہے کہ میں کرناٹک کی فوج میں ملازم تھا۔ اور محمد علی والا جاہ کی فوج کے افسروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس ملک کا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔ جب انگریزوں نے نواب سراج الدولہ کے ساتھ جنگ شروع کی تھی تو محمد علی نے مدراس کے گورنر کی خواہش پر چند دستے کلکتہ بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے ان دستوں کی کمان کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس پر مجھے بغاوت کے جرم میں پانچ سال قید کی سزا سنا دی گئی۔ لیکن چھ ماہ قید کاٹنے کے بعد مجھے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ اور میں سیدھا سرنگاپٹم پہنچ گیا۔ حیدر علی کی سفارش سے مجھے میسور کی فوج میں ملازمت مل گئی۔ اس وقت مجھے یہ توقع نہ تھی، کہ میسور کے راجا کی فوج کا یہ نڈر سپاہی کسی دن جنوبی ہند کی آزادی کا سب سے بڑا محافظ بنے گا۔ اگر وپ کسی ایسے آدمی کی تلاش میں ہیں۔ جو ہندوس تان کے بے بس اور مایوس مسلمانوں کو صحیح راستہ دکھا سکے تو آپ کسی دن سرنگاپٹم ضرور آئیں۔ مجھے یقین ہ یکہ وپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ آپ کو ان کے سامنے جا کر یہ بتانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی کہ آپ کون ہیں۔ ان کی مردم شناس نگاہیں آپ کے چہرے سے آپ کے دل کا حال معلوم کر لیں گی۔

معظم علی نے جواب دیا، میں حیدر علی کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں، لیکن سر دست میں سرنگاپٹم جانے کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے مجھے کچھ عرصہ تک حیدر آباد جا

نا پڑے۔اور اگر موقع ملا تو شاید میسور بھی دیکھ سکوں۔بہر حال مجھے آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی ہے۔

○

ایک دوپہر فرحت اپنے دو ماہ کے بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی،اور عابدہ اس کے قریب مصلے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔صابر ہانپتا ہوا آیا،اور اس نے کمرے کے اندر جھانکتے ہوئے کہا،بی بی جی۔بی بی جی!خاں صاحب آ گئے ہیں۔

فرحت کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور عابدہ الحمدللہ کہہ کر سجدے میں گر پڑی۔

چند ثانیے بعد سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔فرحت نے بچے کو بستر پر لٹا دیا،معظم علی السلام علیکم کہہ کر کمرے میں داخل ہوا۔اور فرحت اپنی نگاہوں میں ہزاروں دعائیں لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔پھر یہ دعائیں آنسو بن کر اس کی آنکھوں میں چھلکنے لگیں،اور اس نے کہا آپ کو فتح مبارک ہو۔

عابدہ سجدے سے سر اٹھا کر معظم علی کی طرف متوجہ ہوئی۔اور وہ اسے سلام کر کے بچے کے بستر کے قریب بیٹھ گیا۔عابدہ دعائیں دیتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔اور اس نے بچے کو بستر سے اٹھا کر معظم علی کی گود میں ڈال دیا۔تمھیں سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔اس نے کہا۔

معظم علی نے شرماتے ہوئے پوچھا۔چچی جان،اس کا نام کیا رکھا ہے؟

بیٹا ہم ہر روز اسے ایک نئے نام سے پکارا کرتے ہیں۔شیر علی مصر تھے،کہ اس کا نام صدیق علی رکھ دیا جائے۔لیکن فرحت کہتی تھی،کہ تمھارے آنے تک انتظار کر لیا جائے۔

صدیق علی نام اچھا ہے۔چچی جان!کیوں فرحت تمھارا کیا خیال ہے؟۔

فرحت ابھی تک مسرت کے ساتویں آسمان پر پرواز کر رہی تھی۔اس نے جواب دیا مجھے اس کے لئے ہر نام اچھا لگتا ہے۔

عابدہ نے کہا بیٹا میں تمھارے لئے کھانا لاتی ہوں۔

معظم علی نے جواب دیا نہیں چچی جان میں کھانا راستے میں کھا چکا ہوں۔آپ تشریف رکھیں۔فرحت تم بھی بیٹھ جاؤ۔

ماں اور بیٹی چارپائی پر بیٹھ گیں۔

عابدہ نے کہا بیٹا اکبر خاں ملا تھا؟

چچی جان اکبر خاں میرے ساتھ تھا۔جنگ میں اس کی بہادری کے قصے دور دور تک مشہور ہو چکے ہیں۔

فرحت نے کہا پچھلے مہینے حیدر آباد سے شیخ فخر الدین کا خط آیا تھا،انھوں نے لکھا تھا آپ اکبر خاں کو ساتھ لے کر حیدر آباد ضرور آئیں۔

معظم علی نے کہا۔اب چند مہینے میرا گھر سے نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں،ممکن ہے میں اگلے سال وہاں جاؤں۔لیکن آپ اور چچی جان میرے ساتھ ہونگی۔

عابدہ نے کہا بیٹا جب پانی پت میں تمھاری فتح کی خبر آئی تو لکھنؤ میں چراغاں کیا گیا تھا۔صابر کو اس بات پر اصرار تھا کہ سب سے زیادہ چراغ ہمارے گھر میں جلنے چاہیں۔

جشن کی رات ہمارے گھر کا کوئی کونہ چراغوں سے خالی نہ تھا۔پھر شہر میں ایک رات چراغ جلائے گئے تھے۔لیکن صابر نے پوری سات راتیں چراغاں کیا تھا۔ اب تم ہمیں اطمینان سے جنگ کے واقعات سناؤ۔

معظم علی نے پانی پت کے واقعات بیان کرنے شروع کیے،تو فرحت نے کہا

۔آپ کی باتیں سننے کے لئے صابر ہم سب سے زیادہ بے قرار ہے۔آپ ذرا اونچی آواز میں باتیں کریں۔مجھے یقین ہے کہ وہ دروازے کے پیچھے کھڑا ہے،

معظم علی مسکرایا۔صابر اندر آجاؤ۔

صابر کمرے میں داخل ہوا،اور نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔پھر معظم علی جنگ کے واقعات سنا رہا تھا،اور صابر کے دل کی دھڑکنیں کبھی تیز اور کبھی سست ہو رہی تھیں۔ پانی پت کے آخری معرکے کی تفصیلات سننے کے بعد صابر اٹھ کر دبے پاؤں کمرے سے باہر نکلا،اور بھاگتا ہوا صحن میں جا پہنچا۔تھوری دیر بعد گھر کے نوکر اور محلے کے لوگ اس کے گرد جمع تھے،اور وہ انھیں اپنی رنگ آمیزیوں کے ساتھ معظم علی اور اکبر خاں کے بہادرانہ کارنامے سنا رہا تھا۔

پانی پت کی جنگ کے بعد ہندوستان کے دوسرے شہروں کی طرح لکھنو کے مسلمان عوام میں بھی ایک نیا ولولہ بیدار ہو چکا تھا شہر کی گلیوں اور بازاروں میں غریبوں کے جھونپڑے سے لے کر امراء کے محلات تک ان بہادروں کی جوانمردی کی داستانیں زبان زدعام تھیں،جو مرہٹوں کی عظیم ترین طاقت کو پامال کر چکے تھے ۔پانی پت کی فتح کے بعد لکھنو واپس آنے والے سپاہی اپنے ساتھ بے شمار اولوالعزم مجاہدوں کیکارناموں کی روح پرور داستانیں لائے تھے،اور معظم علی جسے لکھنو کے لوگ کچھ مدت قبل صرف ایک کامیاب اور خوش حال تاجر کی حیثیت سے جانتے تھے،اب ان کی نگاہوں میں ایک قومی ہیرو بن چکا تھا،گھر سے باہر نکلتا تو عوام اس کے راستے میں آنکھیں بچھاتے ،اس کے ساتھ ہم کلام ہونے یا مصافحہ کرنے میں ایک خوشی محسوس کرتے ۔امیر لوگ اسے دعوت دینے پر اصرار کرتے ۔طبقہ اعلیٰ کی

خواتین اس کے گھر آ کر فرحت کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنا اپنے لئے باعث عزت سمجھتیں۔ معظم علی ان دعوتوں اور رسمی ملاقاتوں سے اجتناب کرتا، لیکن کبھی لوگوں کی گرم جوشی میں فرق نہ آتا۔ ہر محفل میں اس سے پانی پت کی جنگ کی تفصیلات سنانے کا مطالبہ کیا جاتا۔ بسا اوقات وہ اپنے عقیدت مندوں کو مختصر سا جواب دے کر ٹالنے کی کوشش کرتا، لیکن کبھی، کبھی وہ اس انداز سے گفتگو کرتا کہ سننے والوں کی نگاہوں کے سامنے پانی پت کے میدان کی تمام تفصیلات سامنے آ جاتیں۔

ایک دن اودھ کی فوج کے ایک بڑے افسر نے اسے اپنے ہاں دعوت دی، شہر کی چیدہ، چیدہ لوگ اور فوج کے کئی افسر اس دعوت میں شریک تھے۔ جب پانی پت کی جنگ کے متعلق گفتگو شروع ہوئی تو شہر کے ایک رئیس نے سوال کیا، جناب آپ کے خیال میں احمد شاہ ابدالی اور ان کی افواج کے بعد اس جنگ میں سب سے زیادہ حصہ کن لوگوں کا ہے۔

معظم علی نے جواب دیا، میں جگن میں شریک ہونے والے ہر سپاہی کو یکساں حصہ دار سمجھتا ہوں۔ دوسرے آدمی نے سوال کیا، لیکن میں نے سنا ہے، کہ آپ روہیل کھنڈ کے سپاہیون کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

معظم علی نے جواب دیا، روہیل کھنڈ کے جوانوں نے پانی پت کی جنگ میں حصہ لینے والے ہر سپاہی کو متاثر کیا ہے۔ اور میں نے احمد شاہ ابدالی کو بھی یہ کہتے سنا ہے کہ کاش ہندوستان کے باقی امراء کے پاس بھی ایسے ہی سپاہی ہوتے۔

فوج کے ایک افسر نے کہا معاف کیجیے! روہیلوں کے ساتھ آپ کی محبت کی وجہ یہ تو نہیں، کہ ان کے چند دستے آپ کی کمان میں تھے۔

معظم علی نے برہم ہو کر کہا۔ اگر میں اودھ کی فوج کا سپہ سالار ہوتا تو بھی آپ

اسی طرح میرے منہ سے روہیلوں کی تعریف سنتے ۔ میں نے پانی پت کے میدان میں جو کچھ دیکھا ہے، ایک سپاہی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

فوجی افسر نے پھر کہا لیکن جناب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک سپاہی کی نظر سے دیکھنے کے بعد آپ نے اودھ کی فوج کے متعلق کیا رائے قائم کی ہے۔

کیا آپ کے خیال میں روہیلہ سپاہی اودھ کے سپاہیوں سے بہتر ہیں؟

معظم علی نے جواب دیا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ روہیلہ سپاہیوں کی تعریف کرنے سے اودھ والوں کی توہین ہوتی ہے تو میں آپ سے گفتگو کرنا پسند نہیں کروں گا‘‘ افسر خاموش ہو گیا اور معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ’’اگر آپ حضرات برا نہ مانیں تو میں یہ کہوں گا کہ روہیلکھنڈ کا ہر جوان اس جنگ کو اپنی بقا اور آزادی کی جنگ سمجھتا تھا لیکن وہاں بعض لوگ ایسے تھے جو اس جنگ کو صرف اپنے امراء کی جنگ سمجھتے تھے۔ اور میں آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ اس محفل میں مجھے ان امراء کا تذکرہ چھیڑنے پر مجبور نہ کریں جو آخری وقت اس کوشش میں تھے کہ مرہٹوں کے ساتھ صلح کر لی جائے ۔ اور وہ لڑے بغیر فتح کے نعرے لگاتے ہوئے اپنے گھروں کو واپس جائیں۔‘‘

ایک امیر زادے نے کہا، لیکن آپ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے، کہ پانی پت کی فتح کے لئے ہمیں بہت بڑی قربانی دینی پڑی ہے۔ اور احمد شاہ ابدالی کے ہزاروں سپاہیوں کے نقصان کا یہ نتیجہ نکلا ہے، کہ افغان سرداروں نے دلی سے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اگر نجیب الدولہ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے ساتھ قوت آزمائی پر مصر نہ ہوتے تو مرہٹوں سے آئندہ پر امن رہنے کا وعدہ لیا جا سکتا تھا، اور ہماری متحدہ افواج ایک طرف کلکتہ اور دوسری طرف مدراس تک پیش قدمی کر کے

اس ملک کو انگریزوں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلا سکتی تھی۔

معظم علی نے جواب دیا یہ اس ملک کی بد قسمتی ہے کہ بعض لوگ نیام سے تلوار نکالے بغیر یہ سمجھ لیتے ہیں، کہ ان کے دشمن کا سر قلم ہو چکا ہے۔مرہٹوں کو فیصلہ کن معرکے سے پہلے اپنی شکست کا یقین ہو چکا تھا، لیکن اگر ہم یہ سمجھ لیتے، کہ ہمیں لڑائی کے بغیر فتح حاصل ہو چکی ہے تو یہ ایک بدترین حماقت ہوتی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا، کہ مرہٹے کچھ عرصے بعد زیادہ تیاریوں کے ساتھ شمال کا رخ کرتے، اور ہمیں ان کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ ہولناک جنگ لڑنا پڑتی۔مرہٹوں کے ساتھ مصالحت کے حق میں ہمارے وہ سیاست دان تھے جو، اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اپنے تدبر اور ذہانت کے بل بوتے پر مرہٹوں کی جارحیت کو اپنی سرحدوں سے دور رکھ سکتے ہیں، لیکن نجیب الدولہ ایک حقیقت پسند انسان ہیں۔وہ جانتے تھے کہ مرہٹوں کو ایک فیصلہ کن جنگ ہی راہ راست پر لا سکتی ہے۔آپ میں سے کسی کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا

چاہیے کہ مرہٹے جو گزشتہ چند برس میں سینکڑوں شہر اور ہزاروں بستیاں تباہ و برباد کر چکے تھے پانی پت کے میدان میں پہنچنے کے بعد اچانک جنگ سے متنفر ہو گئے تھے اور آپ کو اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، کہ اگر انھیں وہاں سے بچ نکلنے کا موقع دے دیا جاتا تو وہ واپس جاتے، جاتے دلّی اور دکن تک راستے کی ہر بستی کو تباہی اور بربادی کا پیغام نہ دیتے، اور پھر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سیدھے گھر جانے کی بجائے آگرہ اور لکھنو جیسے شہروں کو اپنے راستے کی منزلیں بنانے کی کوشش نہ کرتے، مجھے افسوس ہے کہ آپ میں سے بہت کم لوگوں کو اس سیلاب کا اندازہ ہے، جو پونا سے نکل کر پانی پت تک پہنچ گیا تھا۔آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے

اس سیلاب کے راستے میں ایک عظیم پہاڑ کھڑا کر دیا۔ ورنہ اس ملک کے جو امراء اپنی فراست اور تدبر پر فخر کرتے ہیں، ان میں یہ سکت نہ تھی کہ وہ اس طوفان کی معمولی لہروں کا بھی مقابلہ کر سکتے، احمد شاہ ابدالی نے ہمیں اس وقت سہارا دیا، جب ہم تباہی کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ اب اگر ہم انسانوں کی طرح زندہ رہنا سیکھیں، اور ہمارے امراء انفرادی خودکشی کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے متحد اور منظم ہو کر اجتماعی بقا کے لیئے جدوجہد کریں، ت وہم کسی دقت کا سامنا کیے بغیر اس ملک کو انگریزوں کی ہوس ملک گیری سے نجات دلا سکتے ہیں۔

قوم کی موت وحیات کے مسائل سے ہماری قسمت کے ناخداؤں کی بے حسی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ انگریز بنگال کی آزادی پر چھاپہ مارتے ہیں، تو ان میں سے کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا، کہ جو بے رحم ہاتھ بنگال کے حریت پسندوں کا گلا گھونٹ چکے ہیں، وہ کسی دن ان کی شہ رگ تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ اگر جاٹ اور مرہٹے دلّی یا روہیل کھنڈ کے علاقوں میں تباہی مچاتے ہیں۔ تو اودھ، دکن، لاہور یا ملتان کے صوبے دار یہ سمجھ لیتے ہیں، کہ آگ ابھی ان کے اپنے گھر کی چار دیواری سے بہت دور ہے۔

اسی طرح جب دکن یا اودھ پر کوئی مصیبت آتی ہے، تو دوسروں کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ برسوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس ملک کے چند امراء ایک اجتماعی خطرہ سے خوف زدہ ہو کر جھنڈے تلے جمع ہوئے تھے۔ اور اس اتحاد کے شاندار نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا خطرہ دور ہو چکا ہے۔ اب اگر ہم فرنگی تاجروں کو اس ملک سے نہ نکال سکے، یا اگر ہم نے مرہٹوں کو دوبارہ ابھرنے کا موقع دیا تو ہماری اس ناکامی کا باعث ہمارے اکابر کی نا اہلیت اور کوتاہی ہو گی۔

احمد شاہ ابدالی کے لئے ہر سانس کے ساتھ میرے دل سے ایک دعا نکلتی رہے گی۔ انھوں نے مجھے ایک باعزت اور باوقار قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے زندہ رہنے کا موقع عطا کیا ہے۔ لیکن اس احسان عظیم کے بعد میں ان سے یہ مطالبہ نہیں کرونگا، کہ آیئے اب آپ ہندوستان کے ساحلی علاقے پر بھی پہرہ دیجیے، اور اس بات کا بھی خیال رکھیے کہ مرہٹے جو پانی پت کی جنگ کے بعد نیم جان ہو چکے ہیں۔ کہیں دوبارہ اٹھ کر ہمارے مقابلے پر نہ آ جائیں۔ میں ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اپنی مرکزیت قائم رکھنے کے لئے ایک برائے نام شہنشاہ کی ضرورت ہے۔ اور جس شخص کو دلّی کا تخت سونپا جا رہا ہے۔ اسے امراء کی سازشوں یا دشمن کے حملے سے محفوظ رہنے کے لئے بھی آپ کے پہرے کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن میں ان لوگوں سے کچھ کہنے کا حق رکھتا ہوں، جو اپنے اپ کو قوم کی کشتی کا ناخدا سمجھتے ہیں، اور میں ان سے یہ مطالبہ کرنے میں بھی حق بجانب ہوں، کہ خدا کے لئے ماضی کے واقعات سے سبق سیکھو۔ اگر تمھاری کوتاہ اندیشی، عافیت پسندی، اور رہتھل انگاری کے باعث قوم کی نیا ڈوب گئی تو تم بھی اس کے ساتھ ڈوب جاؤ گے۔

آپ میں سے کسی کو اس بات پر پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ میں پانی پت کی جنگ میں حصہ لینے والے روہیلہ جانبازوں کی تعریف کرتا ہوں، میں روہیل کھنڈ کا دوست ہوں نہ اودھ کا دشمن۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت میں، میں ان سب کو اپنے ملی وجود کا حصہ سمجھتا ہوں۔ پانی پت کی جنگ میں شہید ہونے والے افغان، مغل، بلوچ اور ہندی مسلمان سب میرے محسن تھے۔ ان کا مقدس خون میری عزت میری آزادی اور میری سربلندی کے لئے بہا ہے۔ اور میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اس خون کی روشنائی سے میرے اور میری قوم کے مستقبل کی

تاریخ کے بہترین صفحات لکھے جائیں۔

جب یہ محفل برخاست ہو رہی تھی۔ تو لکھنو کا ایک عمر رسیدہ آدمی معظم علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے میزبان کے گھر سے نکلا، اور اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ آپ کو معلوم ہے، کہ آپ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ شجاع الدولہ کے کان تک پہنچایا جائے گا۔ معظم علی نے اطمینان سے جواب دیا۔ خدا شاہد ہے میں نے یہ تمام باتیں شجاع الدولہ کے لئے ہی کہی ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا نیک اقدام قوم کے لئے خیر و برکت کا باعث ہوسکتا ہے، اور جن کی کوتاہیوں سے لاکھوں انسانوں کے لیے تباہی و بربادی کے راستے کھل سکتے ہیں۔

☆

لکھنو میں معظم علی کی بڑھتی ہوئی عزت اور شہرت کے ساتھ اس کے خلاف وہ حاسد اور رعیب جو بھی بیدار ہو چکے تھے جو کسی انسان کی تعریف کو اپنی مذمت کے مترادف سمجھ لیتے ہیں۔ وہ اُمرا جو ابتدا میں اس کے ساتھ محبت اور احترام سے پیش آتے تھے۔ اب اپنے طرز عمل سے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ مسند نشینوں یا کورنش بجا لانے والوں یا خواجوں اور خواجہ سراؤں کی دنیا میں ایک حق گو اور بیباک انسان کے لئے کوئی جگہ نہیں، ابتدا میں معظم علی اودھ کی حکومت پر نکتہ چینی کرنے سے اجتناب کر تا تھا، لیکن وقت کے ساتھ، ساتھ اس کی تلخی بڑھتی گئی، تجارت کا رہا سہا کاروبار عملی طور پر شیر علی کے سپرد کرنے کے بعد وہ اپنا بیشتر وقت قوم کے مستقبل پر سوچنے میں صرف کرتا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر یہ خیال بری طرح حاوی ہو رہا تھا کہ **ملک** کے امراء اگر نئے حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں، ت و بنگال کو انگریزوں کے پنجہ استبداد سے نجات دلائی جا سکتی ہے، اور کرناٹک میں ان کی سازشوں کا سد

باب ہوسکتا ہے۔ مرہٹوں کے متعلق بھی وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ انھیں دوبارہ سر اٹھانے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ ادھر پنجاب میں سکھوں کے حوصلے مسلمانوں کے لئے ایک نیا خطرہ بن چکے تھے، اور معظم علی کے نزدیک ہر الجھن ہر پریشانی کا واحد علاج یہ تھا کہ سلطنت کے تمام صوبیدار اور امراء منظم اور متحد ہو کر قوم کے حال اور مستقبل کے مسائل پر غور کریں۔ اور ان مسائل سے عہدہ بر آہونے کے لئے عوام میں ایک اجتماعی احساس بیدار کریں، پانی پت کی جنگ اس کے نزدیک ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کے ایک نئے دور کا پیش خیمہ تھی۔ لیکن یہ تلخ حقیقت اس کے لئے نا قابل برداشت ہوتی جارہی تھی کہ امراء کی بے حسی بتدریج عوام کے اٹھتے ہوئے حوصلوں اور ولولوں پر غالب آرہی تھی، وہ لکھنو کے امراء سے ملتا اور انھیں یہ سمجھاتا کہ اگر ہم نے ان حالات سے فائدہ نہ اٹھایا تو اندیشہ ہے کہ قوم ایک بار پھر مایوسی اور بے حسی کے دلدل میں جاگرے گی۔ اگر ہمارے اکابر اپنی سیاسی سودا بازیوں اور محلاتی سازشوں پر اعتماد کرنے کی بجائے عوام کے جذبہ مدافعت پر اعتماد کریں، تو ہم چند ماہ کے اندر مٹھی بھر انگریزوں کو خلیج بنگال کے گہرے پانیوں کی طرف دھکیل سکتے ہیں۔ مرہٹوں کے لئے ایسے حالات پیدا کرسکتے ہیں، کہ وہ ہمیشہ کے لئے سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ اگر صرف اودھ اور دکن کی حکومتیں صرف چند ہفتوں کے لئے اتحاد کرلیں، تو جنوبی ہندوستان کو انگریزوں اور فرانسیسوں کی چیرہ دستیوں سے ہمیشہ کے لئے نجات دلائی جاسکتی ہے۔

معظم علی کبھی، کبھی آدھی، آدھی رات تک گھر میں بیٹھ کر دکن، لاہور، ملتان اور سرہند کے صوبیداروں، دلّی کے وزیروں اور امیروں اور روہیل کھنڈ کے سرداروں کے نام اس قسم کے خطوط لکھتا۔

ہم وقت ضائع کر رہے ہیں، احمد شاہ ابدالی
بار، بار ہماری اعانت کیلئے نہیں آئیں گے ۔ اگر
آپ متحد ہو جائیں تو گئی گزری حالت میں بھی اس
ملک کی کوئی طاقت آپ کے مقابلے میں نہیں ٹھہر
سکتی ۔آپ اس ملک کےیمسلمانوں کی عزت اور
آزادی کے محافظ ہیں ۔اگر اپ نے موجود حالات
سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی تو اپ خدا کے
سامنے کیا جواب دیں گے، پانی پت کی فتح کے بعد
اس ملک کے مایوس اور بد دل مسلمانوں میں جو
حوصلے اور ولولے بیدار ہوئے تھے ۔ وہ اب سرد
پڑتے جا رہے ہیں ۔آپ کو اس وقت کا انتظار نہیں
کرنا چاہیے، کہ وہ اپنے حال سے مایوس اور مستقبل
سےبے پرواہ ہو جائیں ۔ ہماری سب سے بری بیماری
لامرکزیت ہے، اگر آپ متحد اور منظم ہو جائیں تو
دلّی کے تخت کا کھویا ہوا وقار بحال کیا جا سکتا ہے،
لیکن اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں، کہ شاہ عالم ثانیجو
ابھی تک جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے، قوم کی
ڈھال اور تلوار نہیں بن سکتا، تو خدا کے واسطے
سلطنت کا بوجھ اٹھانے کے لئے کسی ایسے آدمی
کو آگے لانے کی کوشش کیجیے، جس کی صلاحیتوں پر

اعتماد کیا جا سکے، میں یہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہو
ں، کہ ایک قوم کا مستقبل، کسی نا اہل حکمران کی ذاتی
خواہشات پر قربان کیا جا سکتا ہے۔ میں اس ملک
کے کروڑوں مسلمانوں کی عزت، آزادی اور بقا کا
واسطہ دے کر آپ سے التجا کرتا ہوں، کہ آپ
اپنے فرائض کا احساس کریں، اور اگر اپ یہ سمجھتے
ہیں، کہ آپ ان ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے،
جو قوم کی آزادی کا پاسبان ہونے کی حیثیت سے
آپ پر عائد ہوتی ہے، ت ومیری آخری در
خواست یہ ہے کہ آپ قوم کے راستے سے ہٹ جا
ئیں، اور ایسے لوگوں کو آگے آنے کا موقع دیں، جو
قوم کا بوجھ اٹھانے کی اہلیت رکھتے ہوں،

○

ایک دن معظم علی اپنے دفتر میں بیٹھا انہماک کی حالت میں کچھ لکھ رہا تھا، اکبر خاں کمرے میں داخل ہوا، اور دبے پاؤں آگے بڑھ کر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا، صابر دروازے پر کھڑا بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کرر ہا تھا۔ اکبر خاں دیر تک چپ چاپ بیٹھا ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ معظم علی کی طرف دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد معظم علی لکھا ہوا کاغذ رکھ کر دوسرا کاغذ اٹھانے لگا، تو اچانک اس کی نگاہ اکبر خاں پر جا پڑی۔

بھائی جان اسلام علیکم! اکبر خاں نے اٹھ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے

ہوئے کہا۔

معظم علی وعلیکم السلام، کہہ کر اٹھا، اور اس سے ہاتھ ملانے کے بعد بغل گیر ہو کر بولا، تم کب سے یہاں بیٹھے ہو۔

میں ابھی آیا ہوں بھائی جان آپ اپنا کام ختم کر لیجیے،

بیٹھو میرا کام کبھی ختم نہیں ہوگا۔

وہ بیٹھ گئے اور اکبر خاں نے قدرے توقف سے کہا، بھائی جان ابھی صابر مجھ سے شکایت کر رہا تھا۔ کہ آپ دن رات لکھتے رہتے ہیں۔

اور اپنی صحت کا کوئی خیال نہیں رکھتے، بھابھی جان کیسی ہیں۔

وہ بالکل ٹھیک ہیں۔میں کئی دنوں سے تمھارے ہاں جانے کا ارادہ کر رہا تھا، تم اتنے عرصہ کہاں تھے۔کم از کم اپنی خیریت کی اطلاع تو بھیج دی ہوتی۔

اکبر خاں نے جواب دیا۔ بھائی جان یقین کیجیے، کہ میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا کرتا تھا، دو ماہ قبل ہمارے علاقے کا ایک آدمی لکھنو آ رہا تھا، اور میں نے اسے خط دیا تھا، پچھلے ہفتے وہ مجھے ملا اور بتایا کہ گھر سے نکلنے کے بعد میرا ارادہ بدل گیا تھا، اور میں لکھنو کی بجائے اپنے کسی رشتہ دار سے ملنے آگرہ چلا گیا تھا۔

معظم علی نے کہا شیخ فخر الدین ہر خط میں تمھارے متعلق پوچھا کرتے تھے۔ میں نے پرسوں ہی انھیں لکھا ہے کہا اکبر خاں نے مدت سے کوئی اطلاع نہیں بھیجی، اور عنقریب اس کے گاؤں جا رہا ہوں۔شیخ صاحب تم سے بہت پیار کرتے ہیں، اور وہ مصر ہیں، کہ میں حیدر آباد آؤں، تو تمھیں ساتھ لے کر آؤں۔وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔میں بھی انھیں بہت یاد کیا کرتا ہوں، اگر آپ حیدر آباد گئے تو میں ضرور آپ کا

ساتھ دونگا۔

معظم علی نے کہا اب مجھے معلوم نہیں کہ مجھے کہاں، کہاں جانا پڑے، بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ میں اب زیادہ عرصہ لکھنو میں نہیں رہ سکوں گا۔نواب شجاع الدولہ کے خوشامدی اور جی حضوری مجھ سے بہت خفا ہیں، پچھلے دنوں ان کے ایک بڑے اہل کار نے مجھ سے گلہ کیا تھا کہ میں لکھنو میں بغاوت پھیلا رہا ہوں۔

اکبر خاں نے کہا، بھائی جان! میں نجیب الدولہ کی دعوت پر پچھلے مہینے چند دنوں کے لئے دلّی گیا تھا، اور انھوں نے مجھ سے یہ کہا تھا، کہ شجاع الدولہ آپ جیسے حق گو آدمی کا زیادہ عرصہ تک لکھنو میں رہنا پسند نہیں کرے گا۔آپ نے انھیں کوئی چٹھی لکھی تھی۔

معظم علی نے جواب دیا۔ان دنوں میرا سب سے بڑا مشغلہ اس ملک کے اکابر کے نام خطوط لکھنا ہے۔اور اس وقت بھی میں میر نظام علی کے نام ایک خط لکھ رہا تھا۔

میر نظال علی کو آپ نے کیا لکھا ہے؟

میں نے مرہٹوں کے خلاف اس کی تازہ فتوحات پر اسے مبارکباد دی ہے، تمھیں معلوم ہے وہ مرہٹوں سے حیدر آباد کے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے چکا ہے۔شیخ فخر الدین کی رائے اس کے متعلق اچھی نہ تھی۔لیکن پچھلے خط میں انھوں نے بھی اس کی تعریف کی ہے۔میں نے نظام کو لکھا ہے آپ اس ملک کے امراء کو اجتماعی خطرے کے مقابلے میں متحد اور منظم کرنے کا بیڑہ اٹھائیں۔تم یہ خط پڑھ سکتے ہو۔ معظم علی نے یہ کہہ کر لکھے ہوئے کاغذ میز پر سے اٹھائے اور اکبر خاں کے ہاتھ میں دے دیے۔

اکبر خان نے خط پڑھنے کے بعد معظم علی کی طرف دیکھا، اور اس سے پوچھا۔

بھائی جان اُپ کے کاروبار کا کیا حال ہے۔اور چچا شیر علی کہاں ہے۔

معظم علی نے جواب دیا۔پانی پت کی جنگ کے بعد میں تجارت میں زیادہ دلچسپی نہیں لے سکا، بیشتر کام چچا شیر علی نے سنبھال رکھا ہے۔اور وہ چند دن سے فیض آباد گئے ہوئے ہیں۔میرا خیال ہے وہ آج یا کل آجائیں گے،

صابر ایک کم سن بچہ اٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہوا، اور اسے اکبر خاں کی گود میں رکھتے ہوئے کہا، بھلا یہ کون ہے؟

اکبر خاں مسکرایا اور بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، یہ میرا ننھا منالاڈلا بھتیجا ہے، اور کسی دن یہ اس ملک کی عظیم ترین فوج کا سپہ سالار بنے گا۔

پانچ دن بعد معظم علی، اکبر خان اور شیر علی ایک کمرے میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے، اچانک باہر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی، اور تھوڑی دیر بعد دلاور خاں انتہائی بد حواسی کی حالت میں کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ جناب شہر کا کوتوال اپ سے ملنا چاہتا ہے اور اس کے ساتھ پانچ مسلح سپاہی ہیں۔ معظم علی نے اطمینان سے جواب دیا۔کوتوال سے پوچھو اگر انھیں ناشتہ کرنا ہے تو یہاں تشریف لے آئیں۔ ورنہ انھیں ملاقات کے کمرے میں بٹھادو اور کہو کہ میں ابھی آتا ہوں۔

دلاور خان نے کہا جناب میں نے کہا تھا کہ آپ ناشتا کر رہے ہیں۔لیکن وہ فوراً آپ سے ملنے پر مصر تھے۔

معظم علی نے ذرا تلخ ہو کر کہا، جاؤ اسے کہہ دو، میں ابھی آتا ہوں، اور میرے لئے ایک گھورے پر زین بھی ڈال دو۔

دلاور خان کمرے سے باہر گیا تو معظم علی نے کہا، اکبر معلوم ہوتا ہے کہ مجھے

شجاع الدولہ نے یاد کیا ہے، اگر مجھے کسی وجہ سے دیر لگ جائے تو تم اپنی بھابھی اور ان کی والدہ کو حیدر آباد پہنچا دینا، میں انشا اللہ وہاں پہنچ جاؤں گا، میں کئی ہفتوں سے شجاع الدولہ کے پیغام کا انتظار کر رہا تھا،

اکبر خاں نے کہا بھائی جان اگر کوئی خطرے کی بات ہے تو آپ کو شجاع الدولہ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ۔حیدر آباد کی نسبت میرا گھر یہاں سے زیادہ نزدیک ہے، اور ہم کسی وقت کے بغیر کوتوال اور اس کے آدمیوں کو کسی کوٹھری میں بند کر کے یہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں ۔

معظم علی مسکرایا یہ آدمی مجھے گرفتار کرنے کی نیت سے نہیں آئے اور نہ ہی میرا قید ہونے کا ارادہ ہے ۔

اکبر خان نے کہا بھائی جان میں آپ کے ساتھ جاؤں گا ۔

نہیں معظم علی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا، تم یہیں رہو تمھیں اس کمرے سے نکلنے کی بھی ضرورت نہیں،

معظم علی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور شیر علی جو سکتے کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا، اپنے حلق میں اٹکا ہوا نوالہ نگلنے کے بعد شکایت کے لہجے میں بولا ۔

انھوں نے کبھی کیرا کہا نہیں مانا، میں ان سے ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ جو لوگ آپ کے پاس قوم اور ملک کے خیر خواہ بن کر آتے ہیں ۔ان میں سے آدھے حکومت کے جاسوس ہوتے ہیں، لیکن خدا معلوم پانی پت کی جنگ سے واپس آنے کے بعد انھیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ بھری محفل میں حکومت کے بڑے، بڑے عہدہ داروں پر نکتہ چینی شروع کر دیتے ہیں ۔

اکبر خان نے اٹھ کر دروازے کے باہر جھانکتے ہوئے شیر علی کی طرف دیکھا،

اور کہ اچھا جانیانی پت کی جنگ کے بعد اس **ملک** کے لاکھوں انسانوں میں زندہ رہنے کی خواہش بیدار ہوگئی ہے۔اور بھائی جان کے منہ سے ان لاکھوں انسانوں کی دبی ہوئی آواز نکلتی ہے۔

لیکن اب کیا ہوگا۔

کچھ نہیں چچا جان آپ پریشان نہ ہوں۔موجودہ حالات میں شجاع الدولہ ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرات نہیں کرے گا۔

صحن میں مسلح سپاہی اپنے گھوڑوں کی باگیں تھامے ڈیوڑھی کے سامنے کھڑے تھے،

معظم علی کوتوال سے باتیں کرتا ہوا ملاقات کے کمرے سے باہر نکلا۔

اکبر خان نے شیر علی سے کہا، چچا جان میں ابھی آتا ہوں،

شیر علی نے کہا خدا کے لئے معظم علی کو یہ ضرور سمجھاؤ کہ شجاع الدولہ ایک تندمزاج آدمی ہے اس سے باتیں کرنے میں احتیاط سے کام لیں۔

چچا جان آپ اطمینان رکھیں، اکبر یہ کہہ کر آگے بڑھا، معظم علی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا، اکبر مجھے نواب اودھ نے کسی ضروری کام سے بلایا ہے، میں جلد واپس آجاؤں گا۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر کوتوال اور اس کے ساتھیوں کے ہمراہ شہر کا رخ کر رہا تھا۔

○

معظم علی نواب شجاع الدولہ کی مسند کے سامنے کھڑا تھا، اور مسند سے آگے دائیں بائیں دو قطاروں میں چند امراء اور عہدہ دار بیٹھے ہوئے تھے۔شجاع الدولہ

نے چند ثانیے اس کی طرف دیکھنے کے بعد کہا۔ مجھے تمہارے دو خط ملے ہیں، اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمہیں سلطنت کے ہر چھوٹے بڑے عہدہ دار کے نام خط لکھنے کا شوق ہے۔ آخر تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ ہمیں حکومت کا کاروبار چلانے کے لیئے تمہارے نیک مشوروں کی ضرورت ہے۔

معظم علی نے جواب دیا اگر مجھے یہ احساس نہ ہوتا کہ آپ کے ساتھ لاکھوں انسانوں کی قسمت وابستہ ہے۔ اور اپ کا صحیح قدم قوم کے لئے خیر و برکت اور آپ کی معمولی کوتاہی قوم کے لئے تباہی کا باعث ہوسکتی ہے تو میں ہرگز آپ کو پریشان نہ کرتا۔

لیکن تمہیں ملک کے سیاسی معاملات میں مداخلت کا حق کس نے دیا ہے، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم صرف اپنی تجارت سے سروکار رکھو، اور لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرو کہ قدرت نے سلطنت کا سارا بوجھ تمھاری گردن پر لاد دیا ہے۔ ہم یہ برداشت نہیں کریں گے، کہ جو لوگ بنگال کو تباہی کے راستے پر ڈال کر وہاں سے بھاگے ہیں وہ ہمارے لئے یہاں آ کر کوئی فتنہ پیدا کریں۔

معظم علی ایک مبلغ کا جذبہ لے کر شجاع الدولہ کے دربار میں داخل ہوا تھا، اسے یہ الفاظ ایک چابک کی طرح لگے، اور اس نے جواب دیا معاف کیجیے۔ مجھے اس سیاست سے کوئی دل چسپی نہیں۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ سلطنت مغلیہ کے کھنڈروں پر اقتدار کی مسندیں آراستہ کرنے والے امراء اپنے آپ کو کبھی مرہٹوں کبھی جاٹوں، کبھی انگریزوں اور کبھی فرانسیسوں کے سامنے بےبس پاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میری آواز اپ کے کانوں کے لئے غیر مانوس ہوگی، لیکن اقتدار کی مسند کسی شخص کو یہ حق نہیں دیتی، کہ وہ اپنی قوم کی عزت اور ازادی پر جان دینے

والوں کا مذاق اڑائے۔ بنگال میں میرا جرم صرف یہ تھا کہ میں اپنی زندگی کی ہزاروں خوشیاں اپنی قوم کی عزت اور آزادی پر قربان کر چکا ہوں

میرا باپ، میرا بھائی میرے عزیز اور میرے دوست سراج الدولہ کے جھنڈے تلے قربان ہو چکے ہیں۔ لکھنؤ پہنچ کر میں نے صرف یہ جرم کیا، کہ جب مجھے اس بات کا احساس ہوا تھا، کہ ابھی تک میری رگوں میں خون کے چند قطرے باقی ہیں جو قوم کے کام آ سکتے ہیں، تو میں ایک رضا کار کی حیثیت میں پانی پت کے میدان میں پہنچ گیا تھا۔

شجاع الدولہ نے جواب دیا پانی پت کی جنگ میں اس ملک کے ہزاروں انسان حصہ لے چکے ہیں، لیکن ان میں سے کسی کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ حکومت کے خلاف باغیانہ تقریریں کرے، تم ہمارے خلاف کئی مہینوں سے نفرت پھیلا رہے ہو، تم نے ہم پر یہ الزام لگایا ہے کہ ہم جنگ کے دوران میں مرہٹوں کے ساتھ ساز باز کرتے رہے ہیں۔ تم نے شہنشاہ کے خلاف انتہائی توہین آمیز باتیں کہی ہیں۔ تم نے دلّی میں احمد شاہ ابدالی کو ہمارے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی ہے۔ کہ پانی پت کی جنگ میں اودھ کی افواج کی حیثیت تماشائیوں سے زیادہ نہ تھی، ہم تمھیں روہیلون کی طرف داری سے منع نہیں کر سکتے، لیکن تمھیں نجیب الدولہ یا حافظ رحمت خاں کے اشاروں پر ہمارے لئے مشکلات پیدا کرنے کی اجازت نہین دی جا سکتی۔ لکھنؤ میں تمھاری خدمات کا احساس نہ ہوتا تو ہم ایک ثانیہ کے لئے بھی تمھارا یہاں رہنا گوارہ نہ کرتے، معظم علی نے ایک ثانیہ کے لئے حاضرین دربار کی طرف دیکھا، اور پھر شجاع الدولہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا، مجھے معلوم نہیں کہ میرے دوستون نے میرے متعلق آپ کو کیسی اطلاعات پہنچائی ہیں۔ لیکن میں یہ تسلیم کرنے

سے انکار کرتا ہوں کہ میں آپ کے خلاف کوئی بغاوت پھیلانے کی کوشش کر رہا ہوں
۔میں یہ مانتا ہوں کہ میں اس ملک کے موجودہ حالات سے مطمئن نہیں ہوں، اور کو
ئی باشعور آدمی ان حالات سے مطمئن نہیں ہوسکتا۔ میں آپ کے سامنے ایک ایسی
قوم کے فرد کی حیثیت سے کھڑا ہوں، جس کا ہر قدم تباہی کی طرف اٹھ رہا ہے۔اور
آپ اس ملک کے چند انسانوں میں سے ایک ہیں جو اسے تباہی سے بچا سکتے ہیں۔
پانی پت کی جنگ کے بعد قدرت نے ہمیں عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کا
ایک اور موقع دیا ہے۔لیکن اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو قدرت
شاید ہماری اس کوتاہی کو قابل معافی نہ سمجھے۔اگر ہمارے امراءاور صوبیدارون نے
متحد اور منظم ہوکر مرکز کو مضبوط نہ کیا، تو مرہٹون کو سر اٹھانے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی
۔ ہمارے اکابر کو اس خوش فہمی میں نہین رہنا چاہیے کہ جب کوئی نیا طوفان اۓ گا تو
قدرت ان کی اعانت کے لئے کسی اور احمد شاہ ابدالی کو بھیج دے گی۔مرہٹون سے بھی
زیادہ خطرناک اس وقت ہمارے لئے انگریز ہیں۔لیکن ہماری اس سے زیادہ بدقسمتی
اور کیا ہوسکتی ہے کہ ہمارے امراء نے بنگال کے واقعات سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔
ہم اس جنگل میں رہتے ہین جس کے چارون طرف آگ لگی ہوئی ہے۔اور میرے
چیخنے چلانے کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں لکھنو سے اس آگ کے شعلے دیکھ رہا ہوں۔
میں اژدھا کی پھنکاریں سن رہا ہوں جو بنگال کو ہڑپ کر چکا ہے۔میں ان بھیڑیوں
کی چیخیں سن رہا ہوں۔جو ایک بار پھر مہاراشٹر سے نکل کر اس ملک میں تباہی پھیلانا
چاہتے ہیں۔پھر جب میں اپنے ان اکابر کو دیکھتا ہوں۔جو اجتماعی خطرات کے مقا
بلے کے لئے عوام کی قوت مدافعت بیدار کرنے کی بجائے اپنی سیاسی چالوں اور سودا
بازیوں کے بل بوتے پر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔تو میں خاموش نہیں رہ سکتا، میں ان

سے یہ کہتا ہوں کہ اگر تم نیا بگریزوں کے جارحانہ عزائم کا سدباب نہ کیا تو وہ کسی دن دلّی پہنچ جائیں گے۔ اگر تم نے مرہٹوں کی جارحیت کو دوبارہ ابھرنے کا موقع دیا تو تمھاری آئندہ نسلیں تم پر لعنت بھیجیں گی، اگر تم نے پنجاب میں سکھوں کی سرکوبی کے لئے افغانوں کا ساتھ نہ دیا۔ تو شمال میں تمھارا دفاعی حصار ٹوٹ جائے گا۔ اگر اس قسم کے خیالات کا اظہار جرم ہے تو میں اس جرم کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ دلّی سے احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد میں نے صرف ایک حوصلہ افزا خبر سنی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نظام کی افواج نے مرہٹوں سے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے لیے ہیں۔ لیکن کاش میں اودھ، دلّی، اور روہیل کھنڈ کی افواج کو بھی دکن کی افواج کے دوش بدوش دیکھ سکتا۔ اور پھر یہی افواج پونا سے آگے ارکاٹ اور مدراس کی طرف بڑھتیں، اور اس ملک سیان فرنگی تاجرون کو نکال کر دم لیتیں، جو ہماری عزت اور آزادی کا سودا کرنے ک یلئے آئے ہیں۔ اس کے بعد شاید بنگال کو آزاد کروانے کے لئے ہمیں لڑنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

شجاع الدولہ نے قدرے نرم ہو کر کہا تم ہمارے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے، کہ ہم نے کسی مرحلہ پر دوسرے امراء سے تعاون نہیں کیا۔ جب مرہٹون کو خطرہ پیش آیا تھا تو ہم پانی پت کے میدان میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ اور اب بھی اگر کسی مشترکہ دشمن کے مقابلے میں اس ملک ک یامراء نے کوئی متحدہ محاذ بنایا تو ہم ان کا ساتھ دینے سے دریغ نہیں کریں گے۔ لیکن ہماری حکمت عملی کسی ایسے حلیف کی خواہشات کے تابع نہیں ہوسکتی، جس کی وفاداری پر ہمیں پورا بھروسہ نہ ہو، تم ہمین نظام الملک کے ساتھ تعاون کا مشورہ دیتے ہو، لیکن تمھارے پاس اس بات کی کیا ضمانت ہے، کہ اگر ہم نظام کی حمایت کے لئے اٹھیں تو وہ مرہٹوں کے ساتھ سودا نہیں کرے گا۔

معظم علی نے جواب دیا، میں آپ کو نظام کے لئے نہیں دکن کے مسلمانوں کی عزت اور آزادی کے لئے مرہٹوں کے خلاف میدان میں آنے کی دعوت دیتا ہوں، میرا مقصد صرف امراء کا اتحاد ہی نہیں، بلکہ عوام میں ایک ایسا اجتماعی شعور اور ایک ایسی قوت محاسبہ پیدا کرنا ہے، جس کا احترام اور خوف کسی رہنما کو بے راہ روی کی اجازت نہ دے۔

شجاع الدولہ نے طنزیہ لہجے میں کہا تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا، کہ تم یہاں وقت ضائع کرنے کی بجائے دکن جا کر وہاں کے عوام کا ضمیر بیدار کرو۔ مجھے آج ہی یہ اطلاع ملی ہے۔ کہ میر نظام علی نے جسے تم شاید قوم کا نجات دہندہ سمجھتے ہو۔ مرہٹوں کے خلاف جنگ سے واپس لوٹتے ہی اپنے بھائی سلابت جنگ کو گدی سے اتار کر قید خانے میں ڈال دیا ہے۔ ان حالات میں تم مجھے صلابت جنگ کی اعانت کا مشورہ دیتے ہو یا میر نظام علی کی اعانت کا؟ معظم علی نے اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے کہا، میرے لئے یہ کھیل نیا نہیں، جب تک چند خاندان سلطنت مغلیہ کو اپنی شکار گائیں سمجھتے رہیں گے، اور جب تک دلّی کی حکومت میں اتنی سکت نہیں ہوگی کہ وہ اقتدار کے بے حیا دعویداروں کا مقابلہ کر سکے، اس ملک کے مختلف صوبوں میں اس قسم کے کھیل ہوتے رہیں گے،

شجاع الدولہ ن یکہا، دلّی کی حکومت کی طرف سے میں تمھیں یہ جواب دے سکتا ہوں، کہ اگر ہم اس وقت دکن کیمعاملات میں مداخلت کریں، ت ومیر نظام علی مرہٹوں یا انگریزوں کے ساتھ سودا کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اور یہی بات صلابت جنگ کے متعلق کہی جاسکتی ہے۔ ہمارے متعلق تمھارا یہ قیاس غلط تھا کہ ہم دکن اور مرہٹوں کی جنگ میں غیر جانب دار رہنا چاہتے ہیں، لیکن کاش دکن میں کوئی ایسی

شخصیت ہوتی، جسے صحیح معنوں میں اپنا حلیف سمجھ سکتے۔ میر نظام علی کے متعلق اب یہ کہا جا سکتا ہے، کہ وہ ایک ہوشیار سپاہی اور ایک کامیاب سیاست دان ہے اور قرائن بتاتے ہیں، کہ دکن پر اس کی سیادت تسلیم کر لی جائے گی، لیکن ابھی ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا، کہ قوم اور ملک کے مستقبل کے متعلق میر نظام علی کے عزائم کیا ہیں۔ اگر تم اپنی سر گرمیاں صرف اودھ کی حکومت تک محدود نہیں رکھنا چاہتے، تو ہماری یہ خواہش ہے کہ تم دکن جاؤ، اور میر نظام کو حال اور مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرو۔ اور اگر اسے تمھاری باتیں متاثر نہ کر سکیں، تو یہ معلوم کرو، کہ دکن کو تباہی سے بچانے کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟۔ دکن کے امراء میں سے کئی تمھیں اپنے ہم خیال مل جائیں گے، اور مجھے یقین ہے کہ اگر میر نظام علی انتہائی کوتاہ اندیش ثابت نہ ہوا، تو تم ایسے لوگوں کی مدد سے اسے اپنا ہم خیال بنا سکو گے، اور ہم تمھارے ساتھ یہ وعدہ کرنے کے لئے تیار ہیں، کہ جب میر نظام ہمارے مشترکہ

دشمنوں کے خلاف کوئی جراٴت مندانہ قدم اٹھائے گا، تو ہم اس کا ساتھ دیں گے، اور اگر تمھیں اس مہم میں ناکامی ہوئی، تو اس کا کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ تم ہر معاملے میں ہمیں موردالزام ٹھہرانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ ہم بخوشی تمھیں اس بات کی بھی اجازت دیتے ہیں کہ تم ملک کے کونے، کونے میں جا کر ہر با اثر آدمی کو ہماری طرف سے یہ پیغام دو کہ مسلمانون کی عزت اور آزادی کے دشمنوں کے خلاف جو متحدہ محاذ بنایا جائے گا، اودھ کے تمام وسائل اس کی فتح اور کامیابی کے لئے وقف ہونگے۔ لیکن اگر تم صرف باتیں بنانا جانتے ہو تو میں تم سے کہوں گا کہ اودھ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے نجیب الدولہ نے کہا تھا کہ تم ایک کارآمد آدمی ہو۔ اور میں تمھیں قوم کی خدمت کا موقع دینا چاہتا ہوں۔ میں اب تم سے یہ نہین پو

چھوں گا کہ تم حیدر آباد جانا چاہتے ہو یا نہیں، لیکن میں تم سے یہ توقع ضرور رکھوں گا کہ جب تک تم لکھنو میں ہو میرے پاس اس قسم کی کوئی شکایت نہیں آئے گی۔ کہ اس ملک کی تمام برائیاں میری ذات کے ساتھ وابستہ کی جارہی ہیں۔تم جاسکتے ہو۔

معظم علی نے چند ثانیے تذبذب کی حالت میں شجاع ال دولہ اور حاضرین محفل کی طرف دیکھا، اور کمرے سے باہر نکل گیا۔اہل دربار پریشانی، تذبذب اور اضطراب کی حالت میں اس شخص کی طرف دیکھ رہے تھے، جس کے سامنے ذرا سی گستاخی موت کو دعوت دینے کے مترادف سمجھی جاتی تھی، معظم علی کے ساتھ گفتگو میں وہ ہر لحہ اس بات کے منتظر تھے کہ شجاع ال دولہ اچانک تالی بجائے گا اور سپاہی ننگی تلواروں کے پہرے میں اس گستاخ آدمی کو کسی تنگ وتاریک کوٹھری کی طرف لے جائیں گے۔اور معظم علی کے کمرے سے باہر نکل جانے کے بعد بھی وہ یہی سوچ رہے تھے کہ شاید شجاع الدولہ پہرے داروں کو آواز دے کر یہ کہہ دے، کہ اس گستاخ آدمی کو محل کے دروازے سے باہر نکلتے ہی گرفتار کرلیا جائے۔لیکن شجاع الدولہ کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، اس نے اہل مجلس کو حیران اور پریشان دیکھ کر کہا۔ تمہیں یہ شکایت تھی کہ ایسے خطرناک آدمی کو لکھنو میں نہیں رہنا چاہیے۔اور مجھے یقین ہے کہ اب وہ لکھنو میں نہیں رہے گا، ایسا آدمی اپنی ذات کے سوا کسی کے لئے خطرناک نہیں ہوسکتا۔

ایک درباری نے اٹھ کر کہا لیکن حضور اس نے آپ کے سامنے بھی انتہائی گستاخی کا مظاہرہ کیا ہے۔

شجاع الدولہ نے جواب دیا تم اس بات پر حیران ہو کہ میں اس کے ساتھ نرمی سے کیوں پیش آیا، سنو وہ نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں جیسے لوگوں کا دوست ہے

۔اگر اس پر سختی کی جاتی، ت و یہ لوگ میرے خلاف طوفان کھڑا کر دیتے ۔احمد شاہ ابدالی سے لے کر نصیر بلوچ تک اسے جانتے ہیں، اورمیری اپنی فوج کے ہزاروں جوان پانی پت کے میدان میں اس ک۔یبہادرانہ کارناموں کے معترف ہیں ۔پھر اس کی باتیں سننے کے بعد تم اسے بدزبان اور گستاخ کہہ سکتے ہو،لیکن اس پر بدنیتی کا الزام عائد نہیں کر سکتے ،وہ ہمارے لئے سر دردی کا باعث تھا۔لیکن میں نے یہ سر دردی نظام کی طرف منتقل کر دی ہے ۔اور مجھے نظام سے پوری توقع ہے کہ وہ اس کا صحیح علاج کر سکے گا۔نظام سے یہ بعید نہیں کہ وہ اسے ہمارا ایک جاسوس سمجھ لے ۔اور یہ حضرت حیدر آباد پہنچتے ہی لا پتہ ہو جائیں ۔

ایک درباری نے سوال کیا لیکن عالی جاہ اگر وہ یہاں سے نہ گیا تو ؟

شجاع الدولہ نے کہا،شہر کا کوتوال اس بات کا پورا خیال رکھے گا، کہ وہ کسی تا کیر کے بغیر لکھنو چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے ۔

معظم علی اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اکبر خاں ڈیوڑھی کے دروازے سے باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا،اس نے آگے بڑھ کر معظم علی کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی، اور کہا بھائی جان میں اُپ کے متعلق بہت پریشان تھا، کہیےوہاں کیا ہوا؟

کچھ نہیں معظم علی نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا، شجاع الدولہ کی خواہش ہے کہ میں لکھنو چھوڑ کر حیدر آباد چلا جاؤں ۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اس نے میرے لئے قید خانے کی کوٹھری منتخب نہیں کی

۔

اکبر خان نے کہا اس نے اپ کو لکھنو سے نکل جانے کا حکم دیا ہے ۔

نہیں اسے اس بات کا یقین تھا کہ میں ایسا حکم نہیں مانوں گا اور اس کی الجھنوں

میں اضافہ ہو جائے گا۔اس لئے اس نےمجھے یہ مشورہ دیا ہے کہ میں لکھنو کی بجائے حیدرآباد جا کر قوم کے مسائل حل کرنے کی کوشش کروں،

اکبر خان نے کہا بھائی جان اگر آپ لکھنو چھوڑ کر میرے ہاں جان قبول کریں تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا،اودھ کی نسبت روہیل کھنڈ میں یون بھی آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔

معظم علی نے جواب دیا ابھی میں نے مستقل طور پر لکھنو چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا ہے، مجھے یقین ہے کہ جب ایسا وقت آئے گا تو تمھارا گھر میری آخری جائے پناہ ہوگی۔

لیکن ابھی میں حیدرآباد جانا چاہتا ہوں۔میں شیخ فخر الدین سے کئی بار وعدہ کر چکا ہوں، اور اب شجاع الدولہ نیاس وعدے کو پورا کرنے کے اسباب پیدا کر دیے ہیں۔رمھاری بھابھی کو بھی حیدرآباد دیکھنے کا شوق ہے۔

اکبر خان نے کہا۔اب آپ کب جا رہے ہیں؟

میں انشاءاللہ ایک ہفتے کے اندر روانہ ہو جاؤں گا۔

اکبر خاں نے کہا بھائی جان میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔

پندرھواں باب

عطیہ دوپہر کے وقت اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھی کہ بلقیس بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی، اور اس نے عطیہ کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا ۔آپا جان، آپا جان وہ آ گئے۔

عطیہ نے بدحواس ہو کر آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی کون آ گئے۔

بھائی معظم علی آئے ہیں آپا جان!

پھر میں کیا کروں؟ عطیہ نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

ٹھہرئے میں آپ کو ایک چیز دکھاتی ہوں۔

بلقیس اسی طرح بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی، اور تھوڑی دیر بعد ایک خوبصورت بچہ اٹھائے ہوئے دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔

بھلا بتائیے آپا جان یہ کون ہے۔اس نے بچے کو عطیہ کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔

اسے کہاں سے اٹھا لائی ہو۔عطیہ نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

آپا جان یہ ان کا بیٹا ہے۔ان کی بیوی اور ان کی ساس ان کے ساتھ آئی ہیں۔ وہ نیچے امی جان اور ممانی جان کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہیں۔دیکھیے آپا جان یہ کتنا پیارا بچہ ہے۔

عطیہ چند ثانیے بے حس و حرکت بیٹھی بچے کی طرف دیکھتی رہی، پھر اچانک اس نے اپنے دل میں جذبات کا طلاطم محسوس کیا، اور بچے کو سینے سے لگالیا، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، اور خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

بلقیس نے کہا، چلیے آپا جان وہ آپ کے متعلق پوچھتی تھیں۔تم چلو میں آتی

ہوں۔

بلقیس نے اس کی گود سے بچہ اٹھالیا اور باہر نکل گئی۔تھوڑی دیر بعد عطیہ جھجکتی ہوئی نچلی منزل کے ایک کمرے میں داخل ہوئی۔فرحت اور اس کی والدہ فخر الدین کے خاندان کی چند عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھیں،عطیہ انھیں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئی،

بلقیس فرحت کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔بھابھی جان یہ عطیہ آپ ہیں۔

فرحت نے مسکرا کر عطیہ کی طرف دیکھا،اور پھر بلقیس کی طرف متوجہ ہو کر تمھیں دیکھنے کے بعد کہا تمھاری بہن کو پہچاننا میرے لئے مشکل نہیں۔تمھاری صورتیں بہت ملتی ہیں۔

عطیہ بڑی عمر کی خواتین اور اپنی ماموں زاد بہنوں کی مجلس میں فرحت کے ساتھ بے تکلفی سے کوئی بات نہ کر سکی۔لیکن غروب آفتاب کے قریب جب فرحت بالائی منزل کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی،اور بلقیس اس کا بچہ اٹھائے ادھر اُدھر گھوم رہی تھی،عطیہ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئی،فرحت نے کرسی سے اٹھ کر کہا آؤ بہن میں تمھیں لکھنو میں بہت یاد کیا کرتی تھی،اور تمھارے بھائی جان بھی بہت یاد کیا کرتے تھے۔

بھابھی جان!عطیہ نے بے اختیار فرحت سے لپٹتے ہوئے ہوئے کہا،میں ہر نماز کے بعد یہ دعا کیا کرتی تھی کہ بھائی جان آپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں،اور پھر جب انھوں نے ماموں جان کو یہ لکھا کہ آپ مل گئی ہیں،تو میں یہ دعا کیا کرتی تھی کہ آپ کسی دن یہاں آئیں۔

فرحت نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔عطیہ تم فرشتہ ہو،

اور مجھے ہمیشہ تمھاری دعاؤں کی ضرورت رہے گی۔ بیٹھ جاؤ!

عطیہ اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی، اور اس نے غور سے فرحت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، بھابھی جان ایک بات کہوں۔

کہو

آپ برا تو نہیں مانیں گی

کبھی نہیں

عطیہ نے ایک شرارت آمیز تبسم لاتے ہوئے کہا، بھابھی جان آپ بہت خوبصورت ہیں۔

فرحت نے ہنستے ہوئے جواب دیا، عطیہ بات یہ ہے کہ تم میرے چہرے میں اپنی آنکھوں کا حسن دیکھ رہی ہو۔

O

اسی مکان کے مردانہ حصے میں فخر الدین، معظم علی اور اکبر خاں کا خیر مقدم کر رہا تھا، ان کے نوکروں اور گھوڑوں کو دوسری حویلی میں ٹھہرانے کا انتظام کرنے کے بعد وہ معظم علی اور اکبر خان کے ساتھ دیوان خانے کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ جب وہ ایک دوسرے کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے تو اس نے معظم علی سے مخاطب ہو کر کہا۔ کہیے راستے میں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔

نہیں راستے میں ہمیں کوئی قابل ذکر حادثہ پیش نہیں آیا۔ لیکن حیدر آباد سے کوئی آٹھ منزل دور ہمیں یہ پتا چلا کہ ڈاکو چار دن پہلے ایک چھوٹا سا قافلہ لوٹ چکے ہیں۔

فخر الدین نے کہا خدا کا شکر ہے، کہ آپ خیریت سے پہنچ گئے ہیں۔ لیکن اگر

مجھے آپ کی آمد کی اطلاع ہوتی، تو میں حیدر آباد کی سرحد سے پہلے آپ کی حفاظت کا انتظام کر سکتا تھا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ اکبر خاں کو بھی ساتھ لے آئے ہیں۔

معظم علی نے کہا یہ محض اتفاق تھا، کہ جب میں نے سفر کا ارادہ کیا تھا، تو یہ میرے پاس آئے ہوئے تھے۔

لکھنو میں آپ کے کاروبار کا کیا حال ہے؟

معظم علی نے جواب دیا۔ پانی پت کی جنگ سے واپس آنے کے بعد میں تجارت میں زیادہ دلچسپی نہیں لے سکا۔ اب وہاں معمولی کاروبار رہ گیا ہے۔ اور وہ میں شیر علی کے سپرد کر آیا ہوں۔ میں کچھ عرصہ سیر و سیاحت سے دل بہلانا چاہتا ہوں
۔

فخر الدین مسکرایا، اور قدرے توقف کے بعد بولا۔ جس معظم علی کو میں جانتا ہوں، وہ سیر و سیاحت کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ آپ یہاں اپنی خواہش سے نہیں آئے ہیں۔

معظم علی نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ میری خواہشات کیا ہیں؟

فخر الدین نے کہا لوگ اپنے مہمانوں سے ایسی باتیں پوچھنا خلافِ تہذیب سمجھتے ہیں، لیکن میں آپ کی ہر پریشانی میں حصہ دار بننا اپنا حق سمجھتا ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ آپ میری حق تلفی نہیں کریں گے۔

معظم علی نے جواب دیا میری پریشانیاں میری اپنی پیدا کردہ ہیں، اور کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اس دنیا میں میرا صحیح مقام کیا ہے؟ لکھنو سے روانہ ہوتے وقت

میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اب ملک کے کسی حصے کی آب و ہوا مجھے راس نہیں آئے گی۔

فخر الدین نے کہا، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اودھ کی حکومت کے ساتھ آپ کے تعلقات خراب ہو گئے ہیں۔

معظم علی نے جواب دیا آپ شاید اسے بزدلی خیال کریں، لیکن اس مرتبہ میں نے قید ہونا پسند نہیں کیا، پچھلے وقتوں کے حکمران جب اپنے کسی گستاخ عہدہ دار یا مشیر پر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتے تھے تو اس سے یہ کہا کرتے تھے کہ آپ حج کر آئیں۔شجاع الدولہ کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ میں ایک گستاخ آدمی ہوں، اور اس نے مجھے قید خانہ کے داروغہ کے حوالے کرنے کی بجائے یہ مشورہ دیا کہ میں میر نظام علی کی خدمت میں حاضر ہو کر قوم کے اجتماعی مفاد کے لئے دکن اور اودھ کے اتحاد کے امکانات معلوم کروں، اور میرے خیال میں آج تک اتنی رعایت اس نے کسی اور کے ساتھ نہیں برتی ہو گی۔

فخر الدین کے استفسار پر معظم علی نے لکھنو میں اپنی سرگرمیوں اور شجاع الدولہ کے ساتھ ملاقات کی تفصیلات بیان کر دیں۔

اس کے بعد فخر الدین نے کہا جب آپ نے مجھے پانی پت کی جنگ کے واقعات لکھے تھے تو مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ آپ لکھنو واپس کیوں آ گئے ہیں۔میرا خیال تھا کہ ایک سپاہی کی حیثیت میں اپنا صحیح مقام تلاش کرنے کے بعد آپ تجارت میں دلچسپی نہیں لے سکیں گے۔احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد آپ دلّی میں نجیب الدولہ کے ساتھ رہ کر بھی بہت کچھ کر سکتے تھے۔

معظم علی نے جواب دیا۔احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد مجھے دلّی اور لکھنو میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، ایک بے جان بادشاہ جس کا کوئی پرسان حال نہیں،

میری آرزوں اور امنگوں کا مرکز نہیں بن سکتا تھا، کاش احمد شاہ ابدالی دلّی کے تخت پر کسی ایسے آدمی کو بٹھا جاتے، جس میں اس دور کے طوفانوں کے ساتھ لڑنے کی جرات اور ہمت ہوتی۔ نجیب الدولہ اپنے تدبر، اپنی قابلیت، اپنی جرات، ہمت اور زہانت کے باوجود گھاس کے تنکوں سے قوم کا دفاعی حصار تعمیر نہیں کر سکتے۔ دلی کے امراء اور دلّی سے باہر سلطنت کے دوسرے عہدہ دار اگر کسی بات سے بے نیاز ہیں، تو وہ قوم کا مستقبل ہے۔ وہ مرکز میں کسی ایسی قیادت کا تصور کرنے پر آمادہ نہیں، جس کا اشارہ ہر چھوٹے بڑے کے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہو۔ انھیں ایک کٹھ پتلی کی ضرورت تھی، اور وہ انھیں مل گئی ہے۔ ان دنوں اس کے تار شجاع الدولہ کے ہاتھ میں ہیں۔ لیکن آگے چل کر یہ معلوم نہیں کہ یہ کٹھ پتلی کس، کس کے ہاتھ میں کھیلے گی۔ میں یہ سمجھتا تھا، کہ یہ لوگ اپنے ماضی سے سبق حاصل کریں گے، لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ دلّی ایک بار پھر ان بھیڑیوں کی شکار گاہ بننے والی ہے، جو بار بار اسے تاخت و تاراج کر چکے ہیں۔

شیخ صاحب میں ایک سپاہی ہوں اور اب زندگی کی اس منزل میں داخل ہو رہا ہوں، جب قویٰ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، اور ہمت عزائم کا ساتھ نہیں دیتی، تاہم میرے حوصلے سرد نہیں ہوئے۔ کاش میں کسی ایسے شخص کی رفاقت میں جان دے سکتا، جس کی نگائیں میری قوم کے مستقبل سے روشن ہوتیں۔ میرے لئے پانی پت کی جنگ کے بعد اس ملک کے کسی صوبیدار کی فوج میں بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کرنا مشکل نہ تھا، لیکن میرے سامنے وہ لوگ تھے، جن کی زندگی کا مقصد قوم کی حفاظت کی بجائے قوم پر حکومت کرنا ہے۔ مجھے اگر صرف اپنی ذاتی خوشی اور سلامتی مطلوب ہوتی، تو میں احمد شاہ ابدالی کے ساتھ بھی جا سکتا تھا۔ لیکن مجھے اس عطن کی مٹی سے

اسلاف کے خون پسینے کی مہک آتی ہے ۔میں اپنے خرمن کی بجھی ہوئی راکھ سے زندگی کی چنگاریاں تلاش کرنا چاہتا ہوں ۔میں اس دور کے رجل عظیم کا متلاشی ہوں لکھنو سے میں یہ ارادہ لے کر نکلا تھا ۔کہ اگر میں دکن اور اودھ کا اتحاد کرا سکا،تو یہ ایک بہت بڑا کام ہوگا ۔لیکن دکن کی حدود میں داخل ہونے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا ۔کہ یہاں کی فضا لکھنو کی نسبت کم متعفن نہیں ،میر نظام علی کے متعلق میں نے جو کچھ سنا ہے ۔اس کے پیش نظر میں ملک وقوم کے لئے اس کی ذات سے کوئی نیک توقع وابستہ نہیں کرسکتا،تاہم میں اس سے ملاقات کی کوشش کروں گا ۔

فخر الدین نے کہا ۔میر نظام علی ان دنوں بیدار ہو گئے ہیں ۔اور شاید چند ہفتوں تک واپس نہ آئیں ۔ان کی واپسی پر آپ کی ملاقات کا انتظام ہو جائے گا ۔ لیکن مجھے اس ملاقات سے کسی اچھے نتیجے کی توقع نہیں ۔میری یہ خواہش ہے، کہ آپ سرنگاپٹم دیکھ آئیں، ہوسکتا ہے یہ شہر کسی دن آپ کے سفر کی آخری منزل بن جائے ۔میں حیدر علی کی آنکھوں میں قوم کے مستقبل کی امیدوں کی روشنی دیکھ چکا ہوں،

معظم علی نے کہا ۔آپ پہلے بھی حیدر علی کی تعریف کر چکے ہیں ۔اور یہ عجیب اتفاق ہے، کہ پانی پت کی جنگ کے بعد مجھے دلّی میں ایک نوجوان ملا تھا ۔اور اس نے بھی مجھے سرنگاپٹم آنے کی دعوت دی تھی ۔

فخر الدین نے کہا، اس زمانے میں میں نے جس حیدر علی کا ذکر کیا تھا، وہ اس قدر مشہور نہ تھا ۔ان دنوں میسور کی ریاست بھی ایک بڑی جاگیر کا درجہ رکھتی تھی ۔ لیکن آج میسور ایک سلطنت ہے اور مغلوں کی سلطنت کے کھنڈروں پر اپنے اقتدار کے محل تعمیر کرنے والے قسمت آزما اپنے وزیروں اور مشیروں سے یہ پوچھ رہے ہیں، کہ حیدر علی کون ہے ۔؟وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے ۔اس کے باپ دادا کیا

کرتے تھے۔آج انگریز مرہٹے اور نظام جن میں سے ہر ایک جنوبی ہندوستان کو اپنی وراثت سمجھتا ہے۔یہ محسوس کر رہے ہیں، کہ قدرت نے ان کے راستے میں ایک ناقابل تسخیر پہاڑ کھڑا کر دیا ہے، اس کی شہرت حیدر آباد، دلّی، لکھنو، مدراس اور کلکتہ سے نکل کر لندن اور پیرس تک پہنچ چکی ہے، مجھے معلوم نہیں کہ احمد شاہ ابدالی جیسی پر شکوہ شخصیت سے متعارف ہونے کے بعد آپ کو حیدر علی کی شخصیت کس طرح متاثر کر سکے گی۔لیکن اس ملک کے حال اور مستقبل کے متعلق اس کے خیالات وہی ہیں جو آپ کے ہیں۔

معظم علی نے کہا۔میں لکھنو میں بھی اس کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔میں وہاں ضرور جاؤنگا۔اگر وہ اس تاریک دور میں قوم کا مشعل بردار بن سکتا ہے، ت ومیں اس ک پیچھے چلنا اپنے لئے باعث سعادت سمجھوں گا۔سر دست میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ برا نہ مانیں، ت ومیں آپ کو دو دن سے زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتا۔شاید مجھے کچھ عرصہ یہاں ٹھہرنا پڑے۔اس لئے اپنے لئے ایک علحدہ مکان کا بندوبست کرنا چاہتا ہوں۔

فخر الدین نے جواب دیا، اگر آپ اس مکان میں اپنے اُپ کو اجنبی محسوس کریں۔تو میں بہتر سمجھوں گا کہ اسے آگ لگا دی جائے۔اگر آپ حیدر آباد آ کر کہیں اور ٹھہریں تو میرے لئے اس کے سوا اور کیا راستہ باقی رہ جاتا ہے، کہ میں یہاں سے ہجرت کر کے کہیں اور چلا جاؤں۔

معظم علی نے مسکراتے ہوئے کہا شیخ صاحب آپ خفا ہو گئے ہیں۔میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔

فخر الدین نے کہا آپ نے بات ہی ایسی کی تھی۔

فخر الدین کا مکان بہت وسیع تھا۔ اس نے اس کی بالائی منزل کا ایک حصہ معظم علی کے سپرد کر دیا۔

○

چند دن حیدر آباد رہ کر معظم علی کو اس تلخ حقیقت کا زیادہ شدت سے احساس ہونے لگا کہ مرہٹوں کے خلاف میر نظام علی کی فتوحات کی خبریں سن کر اس نے دکن کے مستقبل سے جو توقعات وابستہ کی تھیں۔ وہ محض ایک خواب تھا، دلّی کے تمام تکلفات حیدر آباد آ چکے تھے، اور دکن کے امراء دور زوال کے مغل شہزادوں کی طرح عیش ونشاط کی زندگی بسر کرتے تھے، دکن کی بیشتر فوج ان امراء اور جاگیرداروں کے نجی دستوں پر مشتمل تھی، جن کا مرکز وفا بدلتا رہتا تھا، پانی پت کی جنگ کے بعد مرہٹوں کی کمزوری اور انتشار سے فائدہ اٹھا کر میر نظام علی نے دکن کے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے لیے تھے۔ لیکن فوج کی مدد سے صلابت جنگ کو گدی سے اتارنے کے بعد اندرونی خلفشار کے خطرے نے اسے اپنے بیرونی دشمنوں سے سودا بازی پر مجبور کر دیا تھا، ابن الوقت اور مفاد پرست امراء کی اکثریت صلابت جنگ کا ساتھ چھوڑ کر حکومت کے نئے دعویدار کی طرف دار بن چکی تھی، اور جن امراء کی وفاداری مشکوک سمجھی جاتی تھی، ان کی جگہ نئے جاگیردار پیدا کیے جا رہے تھے۔ میر نظام علی سے بغاوت کرنے والے چند امرا اور فوجی افسر حیدر آباد سے باہر پناہ لے چکے تھے۔ اس کے دوسرے بھائی بسالت جنگ کو کافی اثر ورسوخ حاصل تھا۔ اور وہ کسی وقت بھی خطرے کا باعث ہوسکتا تھا۔ نظام علی نے اسے مطمئن کرنے کے لئے ادھونی کی حکومت اس کے سپرد کر دی، اور دریائے کرشنا کے جنوب میں چند اضلاع اس کے حوالے کر دیے۔ بسالت جنگ بظاہر ادھونی کا خودمختار حکمران تھا

لیکن عملاً اس کی سلطنت حیدرآباد کی ایک بری جاگیر کا درجہ رکھتی تھی۔

معظم علی بے کار بیٹھنے کا عادی نہ تھا، وہ کبھی فخر الدین کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا، اور کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر اکبر خان کے ساتھ سیر کی نیت سے شہر سے باہر نکل جاتا

فخر الدین کے دستر خوان پر دونوں وقت شہر کے چند امراء تاجر یا علماء موجود ہوتے، ایک دعوت میں معظم علی کی ملاقات شہر کے ایک ایسے رئیس سے ہوئی، جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ کتابیں جمع کرنے پر صرف کرتا ہے۔اس نے اپنے کتب خانے کی چند نایاب کتابوں کا ذکر کیا۔اور معظم علی اس کا کتب خانہ دیکھنے اس کے ساتھ چلا گیا، اس کے بعد یہ کتب خانہ اس کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔

ایک دن معظم علی چند گھنٹے اس کے کتب خانے میں گزار کر واپس جا رہا تھا، کہ بازار میں کسی نے اچانک اس کا بازو پکڑ کر روک لیا، معظم علی نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا، اجنبی نے کہا میں اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، لیکن اگر میں غلطی پر نہیں تو میں دلّی میں آپ سے مل چکا ہوں،

معظم علی چند ثانیے تذبذب کی حالت میں کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر اچانک اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں، اور اس نے کہا ارے آپ اسد خاں ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا۔آپ حیدرآباد میں کیسے پہنچے، اور یہاں کس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں،؟ میں آپ کو اکثر یاد کرتا تھا۔

معظم علی نے جواب دیا مجھے یہاں آئے ہوئے آٹھ، دس دن ہو چکے ہیں۔

اور میں شیخ فخر الدین کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں، وہ یہاں کے ایک بہت بڑے تاجر ہیں

۔

اسد خاں نے کہا میں انھیں جانتا ہوں۔

آپ یہاں کب تشریف لائے معظم علی نے سوال کیا؟

میں کوئی بیس دن قبل یہاں آیا تھا، لیکن چند دن یہاں رہ کر نظام الملک سے ملنے بیدار چلا گیا تھا۔ پرسوں یہاں واپس پہنچا تھا اور انشا اللہ کل یہاں سے سرنگا پٹم روانہ ہو جاؤں گا، میں شاہی مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا ہوں، چلیے وہاں چل کر اطمینان سے باتیں کرتے ہیں۔

معظم علی اس کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں مختصراً اپنی سرگزشت سنانے کے بعد اس نے اسد خان کے بیدار جانے کی وجہ دریافت کی، تو اس نے جواب دیا میں نظام کے پاس حیدر علی کی طرف سے دوستی کا پیغام لے کر گیا تھا۔

معظم علی نے پوچھا پھر آپ کی ملاقات کا کیا نتیجہ نکلا؟

میری ملاقات کا صرف یہ نتیجہ نکلا کہ اب نظام الملک کے ساتھ آئندہ ملاقاتوں کا راستہ کھل گیا ہے۔ لیکن میں ذاتی طور پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں، کہ میر نظام علی جیسے آدمی سے دوستانہ ملاقاتیں کسی کیلئے سودمند ثابت نہیں ہوسکتیں، وہ اپنے دل کی بات کسی سے نہیں کہتا، اور وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کے ساتھ بغل گیر ہونے والے ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں، لیکن میسور کے لئے یہ ایک مجبوری ہے کہ نظام کو خوش رکھا جائے، اور ایسے حالات پیدا نہ ہونے دیے جائیں، کہ وہ ہمارے خلاف انگریزوں یا مرہٹوں کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو جائے،

معظم علی نے کہا آپ کو یاد ہے کہ جب دلّی میں ہماری ملاقات ہوئی تھی، تو

آپ نے مجھے سرنگا پٹم آنے کی دعوت دی تھی،

ہاں مجھے یاد ہے اور میں اب بھی آپ کو سرنگا پٹم آنے کی دعوت دیتا ہوں، اگر میں کل ہی آپ کو اپنے ساتھ لے جاسکوں تو سمجھوں گا کہ میرا یہ سفر بہت کام یاب تھا، مجھے یقین ہے کہ میسور کے حالات دیکھ کر آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ آپ کے بہترین خواب وہاں پورے ہونگے، آج جب کہ لولے، لنگڑے، اندھے، بہرے اور اپاہج لوگ قوم کی سیادت کے دعویدار بنے ہوئے ہیں۔ میسور کا اولعزم حکمران اپنی تلوار کی نوک سے اس ملک کے نقشے پر نئی نئی لکیریں کھینچ رہا ہے۔

جب میں نے دلّی کی جامع مسجد میں آپ کی تقریر سنی تھی تو میں نے یہ محسوس کیا تھا، کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھی بننے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار حیدر علی کو دیکھ آئیں

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا میرے ساتھ اکبر خاں بھی آیا ہوا ہے وہ دلّی میں آپ سے ملا تھا، اگر آپ ایک دو دن ٹھہر جائیں تو ممکن ہے ہم دونوں آپ کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو جائیں

اسد خاں نے جواب دیا میں ایک دو دن کی بجائے ایک دو ہفتے آپ کے لئے ٹھہر سکتا ہوں۔ سرکارہ مہمان خانے پہنچ کر معظم علی دیر تک اسد خاں سے باتیں کرتا رہا، گفتگو کا موضوع زیادہ تر حیدر علی کی شخصیت تھا قریباً دو گھنٹے بعد معظم علی نے اٹھ کر کہا، اب مجھے اجازت دیجیے۔

اسد خاں نے اٹھ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا، تو اس بات کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ آپ میرے ساتھ جارہے ہیں؟

ہاں معظم علی نے جواب دیا، اور اگر خدا کا فضل شامل حال رہا تو ہم انشا اللہ

پرسوں علی الصباح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔

○

اکبر خاں اپنے کمرے کے سامنے کھڑا تھا، وہ معظم علی کو دیکھتے ہی آگے بڑھا، اور بولا آپ نے بہت دیر لگائی میں بہت پریشان تھا،

معظم علی نے جواب دیا، میں کتب خانے سے نکلا تو راستے میں اچانک اسد خاں سے ملاقات ہوگئی۔ یہ اسد خاں وہی ہے جو ہمیں دلّی میں ملا تھا، ہم پرسوں اس کے ساتھ سرنگا پٹم جا رہے ہیں، تم تیار رہونا؟

اکبر خان نے جواب دیا میں تیار ہوں لیکن ہمیں بہت جلد واپس آنا پڑے گا، مجھے گھر سے نکلے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔

معظم علی نے جواب دیا ہم جلد ہی واپس آجائیں گے۔

اکبر خان نے سوال کیا؟ آپ بھابھی جان کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔

نہیں وہ یہیں رہیں گی، شیخ فخر الدین کہاں ہے؟

وہ اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

میں ابھی ان سے مل کر آتا ہوں، معظم علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا شیخ فخر الدین کے دفتر میں داخل ہوا۔ شیخ فخر الدین اپنے منشی کو کوئی خط لکھوا رہے تھے، انھوں نے معظم علی کو اپنے پاس بٹھالیا، اور منشی کی طرف متوجہ ہو کر کہا، میں تمھیں کچھ دیر بعد بلاؤں گا۔ اس وقت ان سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

جب منشی کمرے سے باہر نکل گیا تو شیخ فخر الدین نے معظم علی کی طرف دیکھ کر سوال کیا، آپ سارا دن کہاں رہے؟

معظم علی نے اس کے جواب میں اسد خان سے اچانک ملاقات کی تفصیل

بیان کردیں، بالآخر جب اس نے سرنگا پٹم جانے کے متعلق اپنا ارادہ ظاہر کیا تو فخر الدین نے کہا، یہ ضروری ہے، کہ آپ یا تو اگلے مہینے جائیں، یا اس ماہ کے اختتام سے پہلے یہاں واپس آجائیں۔ اگلے مہینے کی تین تاریخ کو عطیہ کی برات آنے والی ہے، اور میری یہ خواہش ہے کہ آپ اور اکبر خاں اس موقع پر موجود ہوں۔ میں ضرور پہنچ جاؤں گا لیکن ان کی منگنی کہاں ہوئی ہے۔

ادھونی کے ایک جاگیر دار کے لڑکے کے ساتھ، وہ بسالت جنگ کے رشتے دار ہیں۔ لڑکے کا نام طاہر بیگ ہے اور وہ ادھونی کی فوج میں ملازم ہے۔ عطیہ کی شادی پر آپ کا موجود ہونا اس لئے بھی ضروری ہے، کہ اب بلقیس بھی بڑی ہو چکی ہے، اور میں ایک ہی دن دونوں بہنوں کی شادی کے امکانات پر غور کر رہا ہوں،

بلقیس کا رشتہ کہاں طے ہوا ہے، معظم علی نے سوال کیا؟

فخر الدین مسکرایا بلقیس کے لئے میں نے جس نوجوان کا انتخاب کیا ہے، اسے آپ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔

معظم علی نے غور سے فخر الدین کی طرف دیکھا اور جھجکتے ہوئے کہا، میں جس نوجوان کو جانتا ہوں اس کا نام اکبر خاں ہے، اور اگر آپ نے اسے پسند فرمایا ہے تو میں آپ کے حسن انتخاب کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا، بلقیس اگر میری سگی بہن ہوتی تو بھی مجھے اس سے زیادہ خوشی نہ ہوتی۔

فخر الدین نے کہا بلقیس اور عطیہ دونوں آپ کو سگے بھائی سے زیادہ عزیز سمجھتی ہیں۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے ایک بھائی کا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ میں ابھی اکبر خاں سے اس کا فیصلہ کرتا ہوں۔

فخر الدین نے کہا، اکبر خاں سے فیصلہ ہو چکا ہے، ہمیں صرف ان کے بھائی جان کی رضامندی کی ضرورت تھی، آج صبح جب آپ باہر گئے تھے تو ہمارے گھر میں یہ مسلئہ پیش ہوا تھا، پھر جب میں نے اکبر خاں سے کہا تو اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا تھا، اور آپ کا یہ کہنا غلط ہے، کہ آپ نے ایک بھائی کا فرض ادا کرنے میں کو تاہی کی ہے، میں یہ ماننے کیلئے تیار نہیں کہ اُپ اسے بلا وجہ لائے تھے،

معظم علی نے مسکراتے ہوئے کہا، بات یہ ہے کہ مجھے یہ جوڑا ابتدا ہی سے بہت بھلا معلوم ہوتا تھا، بارہا میرے دل میں یہ خیال آیا کہ آپ کو خط لکھوں، لیکن جرات نہ ہوئی، اور اب میرا خیال تھا کہ سرنگا پٹم سے آ کر یہ مسلہ آپ کے سامنے پیش کروں گا، اور پیش کرنے سے پہلے اپنے گھوڑوں پر زینیں ڈلوا دوں گا، تا کہ اگر اُپ ہمیں فوراً گھر سے باہر نکالنے کی ضرورت محسوس کریں، تو ہمیں پریشانی نہ ہو۔

فخر ایدین نے کہا میرے دوست میں پتھر اور ہیرے میں تمیز کر سکتا ہوں،

تھوڑی دیر بعد معظم علی، اکبر خاں کے کمرے میں داخل ہوا، اکبر خاں اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

معظم علی نے کہا، اکبر تمھیں گھر سے آئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں، میرا خیال ہے کہ ہم سرنگا پٹم جانے کی بجائے آج ہی لکھنو روانہ ہو جائیں۔

تم نوکروں کو گھوڑے تیار کرنے کا حکم دو، ہم شام سے پہلے پہلے ایک منزل طے کرنا چاہتے ہیں

اکبر خاں کے چہرے پر اچانک مایوسی کے بادل چھا گئے۔

معظم علی نے پھر کہا۔ جاؤ اکبر دیر نہ کرو۔ میں شیخ فخر الدین سے اجازت لے چکا ہوں۔

لیکن بھائی جان......

کیا ہے اکبر؟

کچھ نہیں بھائی جان، اس نے بد دلی سے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا

۔

ارے ٹھہرو کیا بات ہے، تم واپس نہین جانا چاہتے؟

اکبر خاں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور معظم علی نے ایک قہقہ لگانے کے بعد آگے بڑھ کر اسے گلے لگالیا۔

نالائق تم بہت خوش قسمت ہو۔ بیٹھ جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ شیخ صاحب کے ساتھ تمھاری کیا باتیں ہوئی تھیں۔

اکبر خاں کا دل دھڑک رہا تھا، اور اس کے چہرے پر حیا کی سرخی چھا رہی تھی۔

تیسرے دن علی الصباح معظم علی اور اکبر خاں، اسد خاں کے ہمراہ سرنگا پٹم کا رخ کر رہے تھے،

○

ایک روز دوپہر کے وقت معظم علی اور اس کے ساتھی سرنگا پٹم میں داخل ہوئے، اسد خاں انھیں اپنے مکان میں ٹھہرا کر حیدر علی کے پاس چلا گیا، شام کے وقت اس نے واپس آکر معظم علی کو اطلاع دی، کہ نواب حیدر علی کل صبح آپ سے ملاقات کریں گے

اگلے دن صبح کی نماز کے تھوڑی دیر بعد معظم علی اور اکبر خاں اپنے میزبان کے ساتھ شاہی محل کی طرف چل دیے۔ وہ پائین باغ میں داخل ہوئے تو

اسد خان نے باغ کے درمیان ایک سائبان کے قریب پہنچ کر کہا، آپ یہاں

تشریف رکھیں، اس وقت وہ عام طور پر یہیں ملاقات کیا کرتے ہیں۔

وہ سائبان کے نیچے کرسیوں پر بیٹھ گئے کچھ دیر بعد انھیں دو نوکر اور ایک کم سن لڑکا باغ میں بھاگتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان کے آگے آگے ایک شیر کا بچہ تھا، کم سن بچہ نوکروں سے چند قدم پیچھے تھا تھوڑی دور جا کر نوکروں نے شیر کے بچے کو گھیر لیا۔ ایک نوکر اس کی زنجیر پکڑنے کے لئے جھکا، لیکن اس نے غرا کر اپنے دونوں پنجے اٹھا لیے، اور نوکر بدحواس ہو کر پیچھے ہٹ گیا،

دوسرے نوکر نے اپنی جگہ سے ہلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ۔ کمسن لڑکا ہنستا ہوا آگے بڑھا، اور اس نے اطمینان سے شیر کے جسم پر ہاتھ پھیرنے کے بعد اس کی زنجیر پکڑ لی،

اب اسے لے جاؤ! لڑکے نے نوکر کی طرف زنجیر بڑھاتے ہوئے کہا

حضور یہ کاٹتا ہے۔

تم یونہی ڈرتے ہو۔ دیکھو لڑکے نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ شیر کے بچے کے منہ کے سامنے کر دیا۔

جب شیر کا بچہ لڑکے کا ہاتھ چاٹنے کے بعد اس کے پاؤں پر لیٹ گیا، تو اس نے فاتحانہ انداز سے نوکروں کی طرف دیکھا، اور کہا تم اگر اس سے ڈرو گے تو یہ خواہ مخواہ کاٹے گا۔

ایک نوکر نے کہا نہیں حضور اگر ہم نہ بھی ڈریں، تو بھی یہ کاٹتا ہے۔

یہ کون ہے؟ معظم علی نے اسد خاں سے سوال کیا۔

یہ شہزادہ فتح علی ٹیپو ہیں انھیں شیروں کا بہت شوق ہے۔

معظم علی نے کہا ایک شہزادے کے لئے شیروں سے بہتر کیا کھلونے ہو سکتے

ہیں ۔انھیں بلائیے ۔

اسدخان نے اٹھ کرآواز دی ۔شہزادہ صاحب ادھرتشریف لائیے!

ٹیپوشیر کا بچہ نوکروں کے حوالے کر کے اطمینان سے قدم اٹھاتا ہوا سائبان کی طرف بڑھا۔

معظم علی اور اکبر خاں اٹھ کر کھڑے ہو گئے ۔ٹیپو نے اسلام علیکم کہہ کر یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ مصافحہ کیا اور معظم علی اور اکبر خاں کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھ گیا،

اسدخاں نے کہا شہزادہ صاحب، یہ معظم علی خاں ہیں ۔آپ مرشد آباد کے رہنے والے ہیں ۔ پلاسی کی جنگ سے پہلے آپ سراج الدولہ کی فوج میں عہدہ دار تھے، اور یہ روہیل کھند کے سردار اکبرخاں ہیں ۔آپ پانی پت کی جنگ کے متعلق بہت سوال کیا کرتے ہیں، اور یہ دونوں اس جنگ میں حصہ لے چکے ہیں ۔

شہزادہ ٹیپو نے کہا، مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی، اگر آپ کو تکلیف نہ ہو،تو آپ مجھے جنگ کا نقشہ بنا دیں، پھر میں آپ سے چند سوالات پوچھوں گا؟

ٹیپو کی عمر گیارہ سال سے زیادہ نہ تھی لیکن اس کا چہرہ اس کی عمر کے مقابلے میں بہت سنجیدہ تھا، اس کی بڑی، بڑی سیاہ چمک دار آنکھوں سے غیر معمولی ذہانت مترشح تھی ۔تاہم معظم علی کے نزدیک وہ ایک کم سن بچہ تھا،

اس نے کہا بہت اچھا میں آپ کو نقشہ بنا دونگا ۔

ٹیپو نے کہا اگر آپ کو فرصت ہو تو میں ابھی کاغذ قلم منگواتا ہوں ۔

حیدر علی محل کی طرف سے نمودار ہوا، اور اسدخان نے جلدی سے اٹھ کر کہا، وہ آ رہے ہیں۔

معظم علی اور اکبر خاں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

شہزادہ ٹیپو نے کہا آپ ابا جان سے ملاقات کے بعد کہیں غائب نہ ہو جائیں

۔

اسدکان نے کہا شہزادہ صاحب آپ مطمئن رہیں

یہ میرے مہمان ہیں، اور جب تک یہ نقشہ نہیں بنائیں گے میں انھیں غائب نہیں ہونے دونگا

تھوڑی دیر بعد حیدر علی سائبان میں داخل ہوا، اور اسد خان اور اس کے ساتھیوں سے مصافحہ کرنے کے بعد بے تکلفی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

آپ معظم علی ہیں۔اس نے سوال کیا

جی ہاں

اور آپ اکبر خان ہیں؟

جی ہاں، اکبر خان نے جواب دیا

معظم علی اور اکبر خاں کی نگائیں رعب وجلال کے اس پیکر مجسم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

حیدر علی کی آنکھیں اور اس کے چہرے کے خدوخال یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ حکم دینے کے لئے پیدا ہوا ہے۔

حیدر علی نے کہا، اسد خان تمھاری میزبانی ختم ہو چکی، اور آج سے یہ میرے مہمان ہیں، پھر وہ معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔ میں اسد خان کی زبانی تمھاری سر گزشت سن چکا ہوں، اور میری یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ نے یہاں تک آنے کی تکلیف گوارہ کی۔اسد خان نے مجھے بتایا ہے کہ آپ بہت جلد واپس جانا چاہتے

ہیں، لیکن مجھے یقین ہے، کہ اگر اُپ کو اس ملک کے مسلمانون کے لئے کسی مضبوط قلعے کی تلاش ہے، تو آپ دوبارہ یہاں آئیں گے۔ جو تڑپ آپ کو پانی پت کے میدان میں لے گئی تھی، اور جو ولولہ آپ کو حیدر آباد لایا ہے، وہ کسی دن آپ کو یہاں آنے پر مجبور کر دے گا۔ کاویری کے پانی کے بغیر آپ کی پیاس نہیں بجھے گی، اگر آپ ایک اچھے سپاہی ہیں تو میسور کی فوج میں آپ کی جگہ خالی ہے، اگر آپ مدبر اور سیاست دان ہیں، تو آپ یہ محسوس کریں گے کہ آپ کی یہاں ضرورت ہے، اگر آپ کو تجارت کا شوق ہے تو میسور میں اُپ کی ترقی کے راستے کھلے ہیں، اور اگر آپ ایک بلند پایہ عالم ہیں، تو یہاں آپ کے قدر دان موجود ہیں۔ اسد خان نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کے سفر کا مقصد مسلمان حکمرانوں میں اتحاد اور تعاون کے امکانات معلوم کرنا ہے۔ آپ میری طرف سے ان سب کو یہ پیغامات دے سکتے ہیں، کہ جب وہ کسی اجتناعی خطرے کی مدافعت کے لئے متحد ہوں گے تو مجھے سب سے اگلی صف میں پائیں گے،

میرے نزدیک ہندوستان کے مستقبل کے لئے سب سے بڑا خطرہ انگریز ہیں، اور جب تک جنوب میں ان کے جھنڈے سرنگوں نہیں ہو جاتے، میں چین سے نہیں بیٹھوں گا، میں جنوبی ہندوستان کو انگریزوں کی ہوس ملک گیری سے بچانے کے لئے نظام کی دوستی کا طلب گار ہوں، اگر مرہٹے پر امن رہے تو میں ان کے ساتھ بھی الجھنا پسند نہیں کروں گا،

معظم علی نے کہا، خدا آپ کے ارادوں میں برکت دے، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ نظام انگریزوں کے خلاف آپ کا ساتھ دینے کی بجائے انگریزون کی مدد سے میسور پر قبضہ جمانے کی کوشش کرے گا، اور مرہٹے بھی آپ کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا

کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے، پانی پت کی شکست کے بعد وہ جنوبی ہندوستان میں ایک طاقت ور مسلم حکمران کا عروج برداشت نہیں کریں گے، آپ ک و بیک وقت ان تین طاقتوں کے کلاف جنگ لڑنا پڑے گی، اور مجھے یہ بھی یقین نہین کہ اودھ اور دلّی کے مفلوج اور بے بس امراء آپ کو کوئی مدد دے سکیں گے ۔میرا مقصد آپ کی حوصلہ شکنی نہیں، لیکن بنگال کے واقعات نے مجھے بہت زیادہ حقیقت پسند بنا دیا ہے۔

حیدر علی مسکرایا، ایک حقیقت پسند آدمی کی گفتگو میری حوصلہ شکنی یا دل آزاری کا باعث نہیں ہو سکتی۔ میں جانتا ہوں کہ ایک دن مجھے تنہا ان بھیڑوں اور گیدڑوں کی افواج کے سامنے سینہ سپر ہونا پڑے گا۔لیکن مجھے خدا کی اعانت پر بھروسہ ہے، اگر مجھے کام کرنے کہ مہلت مل گئی تو میں میسور کو ایک نا قابل تسخیر قلعہ میں تبدیل کر دونگا، میں وہ فوج تیار کروں گا، جو ہر میدان میں ان حریص طالع آزماؤں کے دانت کھٹے کر سکے گی ۔میرے جھنڈے تلے کرائے کے سپاہی نہیں ہونگے، بلکہ وہ لوگ ہونگے، جنھیں اس وطن کی خاک اپنی جانوں سے زیادہ عزیز ہو گی۔ جب تک میرے ہاتھ تلوار اٹھا سکیں گے میں لڑتا رہوں گا، ور آپ جیسے لوگ حیدر آباد، دلّی اور اودھ کے مسلمانوں کو یہ بتا سکیں گے کہ میسور کی جنگ تمھاری بقا اور تمھاری عزت اور آزادی کی جنگ ہے۔

حیدر علی کی گفتگو کے دوران معظم علی یہ محسوس کر رہا تھا، کہ وہ برسوں بے آب و گیاہ صحراؤں میں گھومنے کے بعد اپنے سپنوں کی وادی میں پہنچ گیا ہے۔اس کا دل حیدر علی کے لئے عقیدت اور محبت کے جذبات سے لبریز تھا۔

اس نے کہا مجھے یہاں آنے کا فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگے گی، میں ابھی سے

کاویری کے پانی کی مٹھاس محسوس کر رہا ہوں

حیدر علی نے اٹھ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا، مجھے آپ کا انتظار رہے گا، لیکن جتنے دن آپ یہاں ہیں، میں آپ کی موجودگی سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ اب انشاءاللہ شام کے وقت ملاقات ہوگی۔

سائبان سے تھوڑی دور محل کے دروازے کے سامنے چند سپاہی اور افسر گھوڑے کی باگیں تھامے ہوئے کھڑے تھے۔ حیدر علی نے معظم علی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد اکبر خاں سے ہاتھ ملایا، اور شہزادہ ٹیپو کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ آؤ فتح علی!

ٹیپو نے کہا ابا جان مجھے ان سے ایک کام ہے۔ میں تھوڑی دیر تک پہنچ جاؤں گا

۔

حیدر علی نے جواب طلب نظروں سے اسد خان کی طرف دیکھا اور اس نے کہا! عالی جاہ شہزادہ ٹیپو ان سے پانی پت کے میدان کا نقشہ بنوانا چاہتے ہیں۔

حیدر علی نے مسکرا کر معظم علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ دیکھا میں نہ کہتا تھا، یہاں آپ کی ضرورت ہے؟

تھوڑی دیر بعد حیدر علی گھوڑے پر سوار ہو کر سپاہیوں کے ساتھ باہر نکل گیا، اور معظم علی، اکبر خاں، اسد خاں اور شہزادہ فتح علی ٹیپو کے ساتھ شاہی مہمان خانے میں داخل ہوا۔ شہزادہ ٹیپو کے حکم سے ایک سپاہی قلم اور کاغذ لے آیا۔ اور معظم علیقالین پر بیٹھ کر نقشہ بنانے میں مصروف ہوگیا۔ معظم علی کا خیال تھا کہ ایک کم سن لڑکے کو مطمئن کرنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ لیکن شہزادہ ٹیپو کے غیر متوقع سوالات کے جواب میں اسے میدان جنگ کی تمام تفصیلات اور جزئیات پر تبصرہ کرنا

پڑا۔کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد کاغذ ان بے شمار نشانات اور لکیروں سے بھر چکا تھا، جن سے فریقین کے پڑاؤ، ان کے رسد اور کمک کے راستوں، ان کی افواج کی صفوں اور ان کے توپ خانوں اور مختلف معرکوں کی نشان دہی کی گئی تھی۔

نقشہ ختم کرنے کے بعد معظم علی یہ محسوس کر رہا تھا، کہ وہ پانی پت کی جنگ کی پوری تاریخ بیان کر چکا ہے۔جب کمسن شہزادہ نقشہ لے کر معظم علی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہاں سے چلا گیا تو اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔خدا اس لڑکے کو نظر بد سے بچائے۔بعض اوقات اس کے سوالات سے مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنے سپہ سالار سے باتیں کر رہا ہوں۔شہزادہ کی عمر کتنی ہے؟

اسد خان نے جواب دیا، ان کی عمر بارہ سال سے کم ہے۔لیکن حیدر علی کے بیٹے کے منہ سے ایسی باتیں عجیب معلوم نہیں ہونی چاہیے، قدرت نے اسے ایک غیر معمولی ذہانت عطا کی ہے۔کل اگر آپ اس کا امتحان لیں تو یہ نقشہ اسے اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح یاد ہوگا۔

معظم علی نے کہا۔پہلے میرا خیال تھا کہ بچے کو بہلانے کے لئے چند الٹی، سیدھی لکیریں کھینچ دونگا، لیکن خدا کا شکر ہے میں نے یہ غلطی نہیں کی، اس لڑکے سے باتیں کرنے کے بعد میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ کسی دن میرے جیسے ہزاروں انسان اس کی رفاقت میں جینا، مرنا اپنے لئے باعث سعادت سمجھیں گے۔اسد خاں تم درست کہتے تھے۔مجھے بہت جلد دوبارہ یہاں آنا پڑے گا۔ممکن ہے کہ میں حیدر آباد سے لکھنو جانے کا خیال ترک کر دوں۔

اگلی صبح اسد خان، معظم علی اور اکبر خان کو شہر میں اسلحہ سازی کا کارخانہ دکھانے لے گیا، جہاں تلواریں، بندوقیں اور توپیں بنائی جارہی تھیں، بندوقوں کے کارخانے

کی نگرانی ایک فرانسیسی ماہر کے سپرد تھی، کارخانے کے منتظم نے معظم علی کو چند بندوقیں دکھانے کے بعد کہا۔ یہ بندوقیں ولایت کی بہترین بندوقوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں، اور ہمیں امید ہے کہ ہم اگلے سال تک توپیں بنانے کا کام بھی شروع کر دیں گے۔

اسلحہ سازی کا کارخانہ دیکھنے کے بعد اسد خاں اپنے مہمانوں کو فوجی مستقر لے گیا، جہاں ہزاروں سپاہی پریڈ کرنے اور دفاعی مورچے تعمیر کرنے میں مصروف تھے ۔وسیع میدان میں کہیں نیزہ بازی اور کہیں چاند ماری ہو رہی تھی۔ حیدر علی اور شہزادہ ٹیپو گھوڑوں پر سوار ہو کر مختلف فوجی کھیلوں میں حصہ لینے والے سپاہیوں کی کارکردگی دیکھ رہے تھے۔

اسد خاں نے معظم سے کہا، اگر آپ میسور کا دورہ کریں تو آپ کو یہاں کے ہر شہر میں اسی طرح کا جوش اور ولولہ دکھائی دے گا۔ حیدر علی **ملک** کے ہر باشندے کو سپاہی بنانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔

معظم علی نے سوال کیا؟

انھوں نے شہزادہ ٹیپو کی تعلیم کا کیا انتظام کیا ہے۔ اسد خان نے جواب دیا۔ حیدر علی کے سامنے اہم ترین مسئلہ ٹیپو کی تعلیم ہے ۔ٹیپو کے استاد اپنے وقت کے بہترین عالم ہیں ۔نواب حیدر علی کہا کرتے ہیں، کہ قدرت نے میرے ہاتھ میں صرف تلوار دی ہے ۔لیکن میرے بیٹے کے ہاتھ میں قلم بھی ہوگا

ٹیپو کی ذہانت کا یہ عالم ہے کہ انھیں ایک سبق دوبارہ پڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی ۔

○

فرحت کی ماں اپنے رشتہ داروں کے ہاں گئی ہوئی تھی، اور فرحت اپنے کمرے میں بیٹھی عطیہ سے باتیں کر رہی تھی۔ننھا صدیق ایک جھولے میں سو رہا تھا ۔بلقیس بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور کہا بھابھی جان، بھابھی جان! بھائی جان آ گئے!

فرھت کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا، عطیہ نے ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ بلقیس کی طرف دیکھا، اور کہا بلقیس تم اتنی بدحواس کیوں ہو رہی ہو، بھائی جان کے ساتھ تمھارے دولھا میاں بھی آئے ہیں یا نہیں؟

بلقیس پریشانی کی حالت میں یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔فرحت نے مسکرا کر کہا۔عطیہ دیکھو میری بہن کو مت چھیڑو۔آؤ بلقیس بیٹھ جاؤ۔

بلقیس آگے بڑھ کر بیٹھ گئی، عطیہ اسے دوبارہ کہا۔ بھابھی جان سچ کہتی ہوں، بلقیس کئی دن سے پریشان تھی اور آج صبح ہی بدحواس تھی۔

بلقیس اٹھ کر کھڑی ہو گئی، اور سراپا احتجاج بن کر بولی۔ بھابھی جان آپا مجھے تنگ کرتی ہیں۔

نہ بھئی عطیہ میری ننھی بہن کو تنگ نہ کرو۔

عطیہ نے کہا، بھابھی جان یہ بالکل مصنوعی غصہ ہے، ہم پر خواہ مخواہ رعب ڈالا جا رہا ہے، ورنہ یہ دل میں ہنس رہی ہے۔

فرحت نے کہا۔ہاں بھئی تم سچ کہتی ہو یہ تو واقعی ہنس رہی ہے۔

بلقیس تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔لیکن دروازے کے باہر پہنچ کر وہ اچانک رکی، اور مڑ کر کمرے کی طرف جھانکتے ہوئے بولی۔بھابھی

جان، بھابھی جان! وہ اوپر آرہے ہیں۔

عطیہ بدحواس ہوکر اٹھی اور بھاگتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔

جب وہ برآمدے سے گزرکر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی، تو بلقیس نے اچانک قہقہ لگاتے ہوئے کہا۔ٹھہریئے اپا جان آپ کیوں بھاگ رہی ہیں، وہ تو ماموں جان کے دفتر میں گئے ہیں۔

بڑی چڑیل ہوتم عطیہ نے مڑکرکہا۔

چند دن بعد اسی مکان کے نچلے حصے کے ایک کمرے میں عطیہ اور بلقیسدلھنون کے لباس اور قیمتی زیور پہنے بیٹھی تھیں۔عطیہ کی برات دو دن شیخ فخر الدین کے یہاں قیام کرنے کے بعد واپس جانے کی تیاریاں کررہی تھی۔فرحت دلھوں کے گرد جمع ہونے والی عورتوں کو ادھر اُدھر ہٹاتی ہوئی آگے بڑھی، اوراس نے عطیہ اور بلقیس دونوں کے گلوں میں موتیوں کا ایک ایک ہار ڈالتے ہوئے کہا۔یہ تمھارے بھائی جان کا تحفہ ہے۔

عطیہ کی برات بڑی دھوم دھام سے آئی تھی۔فخر الدین نے اپنی بہن کو یہ احساس نہ ہونے دیا، کہ اس کی بیٹیاں یتیم ہیں۔اس نے دونوں لڑکیوں کو جہیز میں بیش قیمت زیور کے علاوہ دو، دو، ہاتھی اور تیس، تیس گھوڑے جہیز میں دیے۔

عطیہ کا شوہر ایک خوش وضع نو جوان تھا۔اور معظم علی اس کے ساتھ پہلی ملاقات میں ہی بےتکلف ہو چکا تھا۔رخصت ہوتے وقت اس نے بڑے اسرار کے ساتھمعظم علی کو ادھونی آنے کی دعوت دی۔عطیہ کی سواری رخصت کرنے کے بعد معظم علی مہمان خانے کے اس کمرے میں داکل ہوا، جہاں اکبرکاں شادی کے لباس میں بیٹھا تھا،

کیوں بھئی کیا سوچ رہے ہو؟ اس نے کہا

کچھ نہیں بھائی جان، مجھے بار، بار یہ خیال آتا ہے کہ میری وجہ سے شیخ فخر الدین کی سبکی ہوئی ہوگی ۔ حیدر آباد کے امرا میری طرف دیکھ کر ہنستے ہونگے ۔ میں رسومات کا قائل نہیں ۔ لیکن شیخ فخر الدین کی خاطر ہمیں روہیل کھنڈ سے برات کے ساتھ آنا چاہیے تھا۔

معظم علی نے کہا ارے میں سمجھا تھا، کہ تم پانی پت کی جنگ کے متعلق سوچ رہے ہو۔ شیخ فخر الدین تم سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔ اگر وہ دکھاوے کی ضرورت محسوس کرتے تو اسی شہر سے دس بارہ ہزار آدمی تمھاری برات میں جمع ہو سکتے تھے ۔ تم بہ تخوش قسمت ہو اکبر! میں نے تمھارے لئے اس لڑکی کو اس دن منتخب کیا تھا۔ جب حیدر آباد کے راستے میں ان لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی تھی ۔ شیخ فخر الدین تمھیں کم از کم ایک ہفتہ اور یہاں ٹھہرانے پر مصر ہیں، اور اتنے دن مجھے بھی یہاں رکنا پڑے گا۔ اس کے بعد تمھاری منزل روہیل کھنڈ ہوگی اور میرا رخ سرنگا پٹم کی طرف ہوگا۔ میں لکھنؤ جانے کا خیال ترک کر چکا ہوں ۔ وہاں میری جائیداد میں شی رعلی اور تم برابر کے حصے دار ہو، میں نے انھیں یہ لکھ دیا ہے کہ وہ آئندہ تجارت میں میرے حصے کا منافع تمھیں بھیجتے رہیں۔ آج تمھاری سیر و سیاحت کا زمانہ ختم ہوتا ہے ۔ شادی کے بعد تمھیں گھر پہنچ کرنئی، نئی ذمہ داریوں کا احساس ہوگا۔ اکبر خان نے آب دیدہ ہو کر کہا، بھائی جان یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ہمارے رستے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے ۔ مجھے آپ کی جائیداد کی قطعاً ضرورت نہیں ۔ لیکن اُپ کی رفاقت سے محروم ہونا میرے لئے نا قابل برداشت ہوگا۔ اگر وٗپ سرنگا پٹم جانا ضروری سمجھتے ہیں، تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے

چلیے ۔ورنہ روہیل کھنڈ میں میرے گھر کے دروازے آپ کے لئے ہر وقت کھلے ہیں ۔آپ وہاں کیوں نہیں چلتے؟ میں آپ کو کبھی یہ احساس نہیں ہونے دونگا، کہ آپ وہاں ایک اجنبی ہیں۔"

معظم علی نے شفقت سے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔" اکبر میں اپنی منزل دیکھ چکا ہوں، میں کسی جائے پناہ کی تلاش میں نہیں ہوں ۔بلکہ مجھے صرف اپنے فرائض کا احساس سرنگا پٹم لے جا رہا ہے۔"تو پھر میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔

نہین اکبر تمھارے فرائض تمہیں روہیل کھنڈ بلا رہے ہیں ۔تم میری طرح تنہا نہیں ہو تم ایک قبیلے کے سردار ہو اوران لوگوں کے تم پر کچھ حقوق ہیں ،میرے ساتھ رہ کر تم نے جو تجربات حاصل کیے ہیں وہ تمھاری رہنمائی کریں گے، میں تمھیں روہیل کھند کا بہترین سردار دیکھنا چاہتا ہوں ۔میں چاہتا ہوں کہ جب کبھی وہاں جاؤں تو تمھارے قبیلے کے ہر فرد کے چہرے پر مسرت کی مسکراہٹیں دیکھوں ۔میری سب سے بری آرزو یہ ہی ہے کہ تم روہیل کھنڈ کے مسلمانوں کی آزادی کے پاسبان بنو۔اور تمھارے بعد تمھارے بیٹے یا پوتے اپنے وطن کی آزادی کا پرچم سربلند رکھیں ۔

اگلے ہفتے یہاں سے ایک قافلہ لکھنو جا رہا ہے۔شیخ فخر الدین کی خواہش ہے کہ تم اس قافلے کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔پہلے وہ تمھیں یہاں رکھنے پر مصر تھے۔لیکن میرے ساتھ بحث کرنے کے بعد وہ یہ محسوس کرنے لگے۔کہ تمھیں اپنے گھر جانا چاہیے۔

شادی سے دس دن بعد اکبر خاں حیدر آباد سے لکھنو کا رخ کر رہا تھا۔بلقیس

اپنی دو خادماؤں کے ساتھ ایک بہلی میں سوار تھی ۔جہیز کے ہاتھیوں، گھوڑوں، اور دوسرے ساز و سامان کی حفاظت کے لئے فخر الدین نے قافلے کو نا کافی سمجھ کر ان کے ساتھ اپنے پچاس مسلح نوکر ساتھ روانہ کر دیے تھے ۔اکبر خاں شہر سے باہر نکلتے ہی معظم علی سے رخصت ہونا چاہتا تھا، لیکن معظم علی کچھ دور اس کا ساتھ دینے پر مصر تھا ۔شہر سے ایک کوس دور آنے کے بعد اکبر خاں نے کہا ۔ بھائی جان آپ بہت دور آ گئے ہیں ۔معظم علی نے جواب دیا نہیں اکبر خاں میں کچھ دور اور تمھارے ساتھ چلوں گا ۔کچھ فاصلہ اور طے کرنے کے بعد اکبر خان نے ایک بار پھر خدا حافظ کہنے کی کوشش کی ۔لیکن معظم علی نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا ۔یہاں تک کہ شام ہو گئی ۔قافلے نے ایک بستی سے باہر پڑاؤ ڈالا ۔نوکروں نے بلقیس کا خیمہ نصب کر دیا ۔

عشاء کی نماز کے بعد بلقیس اپنے خیمے میں سو رہی تھی ۔اور معظم علی اور اکبر خاں تھوڑی دور کھلی ہوا میں ایک چٹائی پر بیٹھ گئے، اور دیر تک باتیں کرتے رہے ۔اگلے دن جب صبح کی نماز کے بعد قافلہ دوبارہ روانہ ہونے لگا، تو اکبر خاں نے کہا ۔بھائی جان آپ نے بہت تکلیف اٹھائی ہے ۔اب آپ اس سے آگے نہیں جائیں گے ۔ورنہ آپ کو روہیل کھنڈ تک ہمارا ساتھ دینا پڑے گا ۔

معظم علی نے جواب دیا نہیں اب میں اس سے آگے نہیں جاؤں گا ۔اب تم اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ، او ر دیکھو میں تمھاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتا ۔۔۔خدا حافظ معظم علی نے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا ۔

اکبر کان مصافحہ کرنے کی بجائے بے اختیار اس کے ساتھ لپٹ گیا ۔اور اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا ۔ بھائی جان آج ت و میں آپ کی آنکھوں میں بھی آنسو دیکھ رہا ہوں ۔

جاؤ نالائق! معظم علی کی آواز اس کے حلق میں بیٹھ گئی۔

اکبر خاں کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی، وہ جلدی سے پیچھے ہٹا، اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ قافلہ چند قدم آگے جا چکا تھا۔ اکبر خان نے گھوڑے کو ایڑ لگانے سے پہلے ایک ثانیہ کے لئے مڑ کر معظم علی کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ اس نے اپنے دل میں کہا خدا حافظ میرے دوست، میرے رفیق، میرے بھائی، میرے باپ، خدا حافظ!

معظم علی کچھ دیر اپنے گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا رہا۔ پھر اس نے رکاب میں پاؤں رکھا اور گھوڑے کی باگ موڑ لی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ٹیلے پر گھوڑا روک کر درختوں میں روپوش ہوتے ہوئے قافلے کی آخری جھلک دیکھ رہا تھا۔

تیسرے دن معظم علی ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ میسور کا رخ کر رہا تھا

۔

سولھواں باب

سرنگا پٹم میں حیدر علی کی رفاقت کے ایام معظم علی کے لئے قدرت کا بہترین انعام تھے،میسور کی سرزمین اس کے خوابوں کی جنت تھی،اور زندگی کی کوئی خوشی ایسی نہ تھی، جو اسے میسر نہ تھی،وہ ایک ایسے قافلے کے ساتھ زندگی کی شاہراہ پر قدم رکھ چکا تھا۔جس کے مسافروں کے دل ذوق یقین سے لبریز تھے۔وہ اپنی منزل دیکھ چکا تھا۔اور اسے اپنے راستے کے متعلق کوئی پریشانی نہ تھی۔اسے زندہ رہنے کے لئے ایک مقصد کی ضرورت تھی،اور سرنگا پٹم میں آباد ہونے کے بعد وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی زندگی کا ہر سانس ایک مقصد کے لئے وقف ہے۔اس نے حیدر علی کی فوج کے پانچ سو کمان دار کی حیثیت سے سرنگا پٹم میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔اور پانچ سال کے عرصہ میں اپنی محنت،قابلیت اور فرض شناسی کی بدولت سرنگا پٹم کی محفوظ فوج کے تین ہزار جوانوں کا سالار اعلیٰ بن گیا تھا۔نظم وضبط اور مستعدی کے لحاظ سے اس سے تربیت حاصل کرنے والے سپاہیوں کو حیدر علی کی فوج میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔سرنگا پٹم پہنچنے کے پہلے اور تیسرے سال اس کے ہاں دو لڑکے اور پیدا ہوئے،جن میں سے ایک کا نام مسعود علی اور دوسرے کا نام انور علی رکھا گیا۔اکبر خان کے ساتھ کچھ عرصہ تک اس کی خط و کتابت جاری رہی۔لیکن آہستہ،آہستہ نامہ و پیام کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ان تھک مصروفیت کے باوجود اسے فرحت کی رفاقت میں زندگی کے ماہ وسالا ایک خواب معلوم ہوتے تھے۔اسکا مکان سرنگا پٹم کے چند بہترین مکانوں میں سے ایک تھا۔میسور کی فوج کے بڑے،بڑے آزمودہ کار جرنیل اور آفیسر اس کو اپنا دوست اور رفیق سمجھتے تھے۔حیدر علی اہم ترین قومی اور سیاسی معاملات میں اس

سے مشورہ لیا کرتا تھا۔اور وہ کمسن شہزادہ ٹیپو جس کی روشن پیشانی پر ایک قوم کی تقدیر لکھی ہوئی تھی۔اپنی فرصت کے لحات اس کی صحبت میں بسر کیا کرتا تھا۔معظم علی اپنی رفیقہ حیات سے اکثر یہ کہا کرتا تھا۔فرحت مجھے قدرت سے اب صرف ایک گلہ ہے، اور وہ یہ کہ جب مجھ میں دشوار گزار راستوں پر چلنے کی ہمت تھی۔تو میرے سامنے تاریکیاں تھیں۔اور جب میں صبح کی روشنی میں اپنی منزل دیکھ رہا ہوں،تو مجھے یہ محسوس ہوا، کہ میرے پاؤں زیادہ دیر میرا بوجھ نہیں سہار سکیں گے۔کاش میں اس ماضی کو واپس لا سکتا، جس کی ہر آن زندگی کی دھڑکنوں سے لبریز تھی۔صدیق،مسعود اور انور خوش نصیب ہیں، جب یہ بڑے ہوں گے تو ان کا قافلہ سالار فتح علی خاں ٹیپو ہو گا۔

جن ایام میں سلطنت خداداد میں حوصلوں اور ولولوں کی ایک نئی دنیا آباد ہو رہی تھی۔ہندوستان کے باقی حصوں میں نئے، نئے انقلاب آرہے تھے۔

بنگال کا نام نہاد حکمران میر قاسم،جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے میر جعفر کی جگہ گدی پر بٹھایا تھا۔۱۷۶۳ء تک اپنے انگریز سرپرستوں کو اپنی رعایا کا خون مہیا کرتا رہا۔یہاں تک کہ بنگال کے عوام روتی تک کے محتاج ہو چکے تھے۔لیکن انگریزوں کے مطالبات بڑھتے گئے۔اور میر قاسم کو اپنا خزانہ خالی کرنے۔۔۔اپنی بیگمات کا زیور بیچنے۔۔۔۔ملک کے تاجروں اور زمینداروں کو لوٹنے کے بعد اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ اسکے پاس ایسٹ انڈیا کمپنی کی بھوک کا کوئی علاج نہیں ہے۔

انگریزوں نے اس سے بنگال کی حکومت کی گدی چھین کر دوبارہ میر جعفر کے حوالے کر دی۔میر قاسم نے بھاگ کر اودھ میں پناہ لی،نواب وزیر اودھ اور مغل شہنشاہ،شاہ عالم،جو ان دنوں الہ آباد میں بے چارگی کی زندگی گزار رہا تھا۔میر قاسم کو

مدد دینے پر آمادہ ہو گئے۔

۱۵ ستمبر ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں انھیں شکست ہوئی۔ میر قاسم نے فرار ہو کر جان بچائی۔ اور شہنشاہ جسے ابھی دلی کے تخت پر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے جا ملا۔ انگریزوں کی فوج نیلکھنو کا رخ کیا، اور شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ کو مجبوراً انگریزوں سے صلح کرنا پڑی، انگریزوں نے نواب وزیر اودھ سے پچاس لاکھ روپیہ تاوان وصول کیا۔ اور الہ آباد اور کورہ کے علاقے چھین کر شاہ عالم کے حوالے کر دیے۔ الہ آباد کا قلعہ بھی انھوں نے شہشاہ سے خالی کروالیا۔ اور اس کی حفاظت پر انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ متعین کر دیا، بالفاظِ دیگر دلّی کا برائے نام شہنشاہ الہ آباد میں انگریزوں کا دست نگر اور وظیفہ خوار ہو کر رہ گیا۔ اور اودھ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازشوں کے دروازے کھل گئے۔

۱۷۶۵ میں میر جعفر نے وفات پائی، اور انگریزوں نے اس کے پندرہ سالہ بیٹے نجم الدولہ کو بیس لاکھ روپے بطور نذرانہ اور اس کے علاوہ پانچ لاکھ روپے بطور خراج پیش کرنے کی شرط پر گدی پر بٹھا دیا، اس کے بعد بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کیلوٹ کھسوٹ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

شمال میں احمد شاہ ابدالی اور اس کے گورنر کی سرگرمیاں اب زیادہ تر سکھوں کی بغاوتوں کو فرو کرنے تک محدود تھیں، اور پنجاب کے دوسرے شہروں کے علاوہ، چہار محل، لاہور، جالندھر، دواب، سرہند اور ملتان کے علاقے سکھوں کے ہاتھوں بار بار تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ احمد شاہ ابدالی، نصیر خان بلوچ، اور نجیب الدولہ کی افواج انھیں کئی میدانوں میں عبرت ناک شکست دے چکی تھیں۔ لیکن بدقسمتی سے ان شاندار فتوحات کے باوجود سکھوں پر دائمی غلبہ رکھنے کے لئے پنجاب میں مستقل

طور پر کوئی بڑی فوج موجود نہ رہ سکی۔ جب احمد شاہ ابدالی کا لشکر پیش قدمی کرتا، تو سکھ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتے۔ لیکن ان کی واپسی کے ساتھ ہی وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل کر پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ قتل و غارت شروع کر دیتے۔

جنوب میں مرہٹے دوبارہ سر اٹھا رہے تھے۔

انھوں نے پانی پت کی جنگ میں جو زخم کھائے تھے، وہ مندمل ہو رہے تھے۔ لیکن ان کی توجہ شمال کی بجائے جنوب کی طرف تھی۔ یہاں نظام اور انگریز ان کے حریف تھے۔ لیکن یہ تینوں طاقتیں اب ایک دوسرے سے نظریں ہٹا کر حیدر علی کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ میسور کی خوش حالی اور ترقی اور میسور کے حکمران کی شخصیت ان سب کی آنکھوں کا ناسور بن چکی تھی۔ حیدر علی کی طاقت کچل کر میسور کی بندر بانٹ کرنے کے لئے ۱۷۶۷ء میں ان گدھوں، بھیڑوں، اور گیدڑوں کے درمیان سمجھوتہ ہوا۔ میر نظام علی نیا پنے انگریز اور مرہٹہ حلیفوں کے ساتھ حملے کی تفصیلات طے کرنے کے بعد بنگلور کی طرف پیش قدمی کی، اور وہاں سے کوئی تیس میل دور چینا پٹنا کے مقام پر ڈیرے ڈال دیے۔

ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میر نظام علی کے وسیع خیمے میں محفل رقص و سرود آراستہ تھی۔ وزراء اور فوج کے بڑے، بڑے افسر اس کے دائیں، بائیں رونق افروز تھے۔ ایک فوجی افسر خیمہ میں داخل ہوا۔ اور اس نے کورنش بجالانے کے بعد کہا۔ حضور انگریز فوج کا ایک کپتان اسی وقت باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔

نظام نے جواب دینے کی بجائے قہر آلود نگاہوں سے اپنے سپہ سالار تہور جنگ کی طرف دیکھا۔ اور وہ قدرے توقف کے بعد اٹھ کر خیمے سے باہر نکل گیا۔ نظام علی نے مشیر الملک کی طرف دیکھتے ہوئے شکایت کے لہجے میں کہا، یہ لوگ ایسی

بارش میں بھی ارام نہیں کرتے۔ میں انھیں بار، بار یہ کہہ چکا ہوں کہ یہ موسم جنگ کے لئے موزوں نہیں۔

مشیر الملک نے جواب دیا لیکن حضور مدراس کے گورنر کا خیال تھا کہ برسات کا موسم شروع ہونے سے پہلے ہمیں سرنگا پٹم کا محاصرہ کرلینا چاہیئے۔ اگر مرہٹون کی طرف سے تاخیر نہ ہوتی تو اب تک جنگ کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔

نظام نے جواب دیا، مرہٹے ہماری نسبت زیادہ ہوشیار ہیں، وہ اس وقت تک میدان میں نہیں آئیں گے جب تک آدھی جنگ ختم نہیں ہو جاتی۔ نظام کے محافظ دستوں کے سالار اعلیٰ شمس الامراء نے کہا، حضور یہ بھی ت وہوسکتا ہے کہ وہ مزید ہوشیاری کا ثبوت دیں، اور جنگ میں شریک ہی نہ ہوں۔

مشیر الملک نے برہم ہوکر کہا، آپ کو حضور نظام کے اتحادیوں کے متعلق ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیں۔

شمس الامراء نے جواب دیا، معاف کیجیے، میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ کہ حضور نظام کی وفاداری می کوئی مجھ سے آگے ہے۔ لیکن جب تک مرہٹے میدان میں نہیں آجاتے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

مشیر الملک کی توقع کے خلافنظام نے شمس الامراء کی تائید کرتے ہوئے کہا تم درست کہتے ہو۔ ہم نے مرہٹون کے متعلق اطمینان کیے بغیر پیش قدمی کرنے میں غلطی کی ہے۔

شمس الامراء نے مشیر لا ملک کی طرف فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور پھر نظام کی طرف متوجہ ہوکر کہا۔ حضور میں شروع ہی سے اس پیش قدمی کے خلاف تھا۔

خدا معلوم اگر ہم مرہٹوں کی فوری اعانت کے بھروسے پر بنگلور پر حملہ کر دیتے تو اس وقت ہماری کیا حالت ہوتی!۔

تہور جنگ دوبارہ خیمہ میں داخل ہوا۔ اور اس نے نظام کے قریب پہنچ کر آہستہ سے کہا۔ ایلچی مدراس کے گورنر کی طرف سے کوئی اہم پیغام لایا ہے۔ اور وہ اسی وقت قدم بوسی کی اجازت چاہتا ہے۔

بہت اچھا یہ محفل برخاست ہوتی ہے بلاؤ اسے۔

نظام کے اشارے سے رقاصائیں اور سازندے خیمے کے دوسرے دروازے سے نکل کر ساتھ والے خیمے میں چلے گئے۔ اور تھوڑی دیر بعد ایک انگریز افسر خیمے میں داخل ہوا۔ اس نے فوجی طریقے سے سلام کرنے کے بعد ایک تھیلا جو اس کی کمر سے لٹک رہا تھا، کھولا اور ایک مراسلہ نکال کر نظام کو پیش کیا۔ نظام نے مراسلہ پڑھ کر مشیر الملک کو دے دیا۔

انگریز افسر نے کہا، یور ہائینس مجھے کرنل سمتھ کا حکم ہے، کہ میں کسی تاخیر کے بغیر اس خط کا جواب لے کر پہنچ جاؤں۔

نظام نے جواب دیا۔ ہم کرنل اسمتھ کو لکھ چکے ہیں کہ ہم مرہٹوں کی طرف سے اطمینان کیے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔

انگریز افسر نے کہا۔ ہز ایکسیلینسی گورنر مدراس اس مکتوب میں آپ کو یہ یقین دلا چکے ہیں کہ مرہٹے سرنگا پٹم کی طرف آپ کی پیش قدمی کی اطلاع پاتے ہی میدان میں آ جائیں گے۔ ان کی فوج کا ایک حصہ آپ کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔ اور دوسرا ملیبار میں ہمارے ساتھ تعاون کرے گا۔

نظام نے کہا لیکن اگر بارش کا یہی حال رہا تو آپ کی کوئی تجویز ہمارے لئے

قابل عمل نہیں ہو گی ۔ایسا موسم صرف حیدر علی کی پنڈارہ فوج کے لئے موزوں ہو سکتا ہے ۔اب تک ہم نے جو اسلحہ، بارود اور رسد کا جو سامان یہاں جمع کرنے کی کوششیں کی ہیں ۔اس میں سے نصف دشمن کے قبضے میں جا چکا ہے ۔اس وقت ہماری جتنی فوج اس پڑاؤ میں ہے قریباً اتنی ہی رسد و کمک کے راستوں پر پہرہ دے رہی ہے ۔لیکن اس کے باوجود ہماری رسدو کمک کا کوئی دستہ صحیح سلامت یہاں نہیں پہنچا، اگر مرہٹے ہمارا ساتھ دیتے تو ہمیں اس پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا ۔اس پانی اور کیچڑ میں اگر پیش قدمی شروع کر دیں ۔تو ہمیں دنوں کے سفر کے لئے ہفتے درکار ہو نگے ۔ہمارے آگے پیچھے، دائیں بائیں دشمن کے چھاپہ مار دستے ہو نگے ۔

انگریز افسر نے کہا، معاف کیجیے آپ کو دشمن کی طاقت کے غلط اندازے نے پریشان کر دیا ہے ۔ہماری فتح ملیبار کی طرف پیش قدمی کر چکی ہے ۔اور بارش وہاں بھی ہو رہی ہے ۔لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ موسم کی خرابی کے باعث ہم اور ہمارے دشمن کی مشکلات ایک جیسی ہیں ۔

نظام نے جواب دیا ۔ملیبار کے ساحلی علاقے پر آپ کا سہارا آپ کا بحری بیڑہ ہے ۔لیکن مجھے یہاں بیل گاڑیوں سے کام لینا پڑے گا۔

تو میں آپ کی طرف سے کیا جواب لے جاؤں

لیکن اس خط میں گورنر نے یہ لکھا ہے کہ آپ کرنل اسمتھ کو اپنے ارادے سے باخبر کر دیں،

کرنل اسمتھ کو ہمارا جواب ایک ہفتے تک پہنچ جائے گا

انگریز افسر نے جواب دیا ۔مجھے یقین ہے کہ اس سے قبل آپ کی خدمت میں ہماری طرف سے ایسے لوگوں کا وفد آئے گا، جو آپ کو اپنے رائے تبدیل کرنے پر

آمادہ کرسکیں گے۔

اگر کوئی وفد مرہٹوں کی نیک نیتی کے متعلق مجھے یقین دلا سکا تو مجھے اپنی رائے بدلتے ہوئے خوشی محسوس ہوگی۔ بہتر یہی ہوگا کہ وفد میرے پاس آنے کی تکلیف کرنے سے پہلے مرہٹوں کے ساتھ بات چیت کر آئے۔

انگریز افسر نے کہا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ملے بار میں ہماری کامیابیوں کی اطلاعات سننے کے بعد آپ مرہٹوں کے متعلق سوچنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کریں۔

نظام نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ کرسی سے اٹھ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا، ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے۔

انگریز افسر سلام کرنے کے بعد باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد رقص وسرود کا نیا دور شروع ہو چکا تھا، جب یہ محفل پورے شباب پر تھی اور ایک لونڈی میر نظام علی کے جام میں شراب ڈال رہی تھی۔خیمے سے باہر سپاہیوں کا شور سنائی دیا۔حاضرین مجلس جواب طلب نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، نظام نے ہاتھ سے اشارہ کیا، اور طبلے اور سارنگیوں کی صدائیں اچانک خاموش ہوگئیں۔رقاصائیں تذبذب کی حالت میں کھڑی تھیں، ایک فوجی افسر خیمے میں داخل ہوا اور کورنش بجالانے کے بعد کہا۔عالی جاہ ایک آدمی اسی وقت قدم بوسی کی اجازت چاہتا ہے۔

کون ہے وہ؟ نظام نے جھنجھلا کر کہا۔

عالی جاہ وہ کہتا ہے میں حیدر کا ایلچی ہوں۔

مشیر الملک نے کہا تم نے اسے پڑاؤ سے باہر کیوں نہیں روکا۔وہ یہاں تک

کیسے پہنچ گیا؟

جناب وہ سرپٹ آرہا تھا۔اوراس نے پہرے داروں کی کوشش کے باوجود اپنا گھوڑا نہیں روکا۔

مشیرالملک نے کہا، جاؤ اسے قید میں رکھو

افسر نے کہا لیکن حضور اس نے دھمکی دی ہے۔

کیا دھمکی دی ہے؟

حضور اگر آپ کا حکم ہو تو اس کی زبان کھینچ لی جائے۔

نظام نے تلملا کر کہا بے وقوف پہلے یہ بتاؤ وہ کہتا کیا ہے؟

''عالی جاہ! وہ کہتا ہے کہ اگر میں اسی وقت حضور کے ساتھ بات نہ کر سکا تو کل شام تک اس پڑاؤ کا صفایا ہو جائے گا۔''

سپہ سالار تہوار خاں نے اٹھ کر اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔''وہ کوئی پاگل ہو گا، میں دیکھتا ہوں!''۔

نظام نے کہا۔''نہیں ٹھہرو اسے اندر بلاؤ!''

افسر باہر نکل گیا اور چند ثانیے بعد معظم علی کیچڑ اور پانی سے لت پت نظام کے خیمے میں داخل ہوا۔اس نے اسلام علیکم'' کہہ کر مجلس پر ایک نظر دوڑائی اور پھر نظام کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔''اس بے وقت مداخلت کے لیے میری معذرت قبول فرمایئے لیکن میرے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا اشد ضروری تھا۔''

مشیرالملک نے کہا۔''حیدر علی نے اپنے ایلچیوں کو معذرت پیش کرنے کے جو طریقے سکھائے ہیں وہ ہمارے لیے بالکل نئے ہیں۔تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

معظم علی نے جواب دیا۔''حیدر علی کے ایلچی کو آپ کے آداب سیکھنے کی

ضرورت نہیں ۔ میں اُن کو ان کی طرف سے یہ پیغام دینے آیا ہوں کہ اگر آپ مرہٹوں کی اعانت کے بھروسے پر یہاں آئے ہیں تو وہ اس جنگ میں حصہ نہیں لیں گے ۔انھوں نے حیدر علی سے صلح کر لی ہے۔"

مشیر الملک نے کہا۔"حیدر علی کی گیدڑ بھبکیاں ہمیں متاثر نہیں کر سکتیں ۔اگر مرہٹوں کی علحدگی کی خبر درست ہو تو بھی ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔"لیکن یہ بات آپ کو یقیناً متاثر کرے گی کہ اس وقت آپ ہمارے مکمل محاصرے میں ہیں، کل تک آپ کا یہ پڑاؤ چاروں طرف سے ہماری توپوں کی زد میں ہوگا ۔ مجھے حیدر علی نے آپ کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے لیے نہیں بھیجا ہے، بلکہ میں ان کی طرف سے دوستی کا ہاتھ بڑھانے آیا ہوں ۔حیدر علی کے اس اقدام کو آپ کمزوری یا بزدلی سے تعبیر نہ کریں ۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ ہمیں اس ملک کا مستقبل عزیز ہے ہم یہ نہیں چاہتے کہ آنے والی نسلیں ہماری غلطیوں کی سزا بھگتیں، ہمیں آپ کی فوجی طاقت کا اعتراف ہے لیکن کاش آپ یہ قوت ہندوستان کی عزت اور آزادی کے دشمنوں کی سرکوبی کے لیے کام میں لا سکتے ۔اگر آپ قوم کے رہنما بنیں تو حیدر علی آپ کی قیادت میں اس ملک کے دشمنوں کے ساتھ لڑنا اپنے لیے باعث فخر سمجھیں گے ۔ میں آپ کو انگریز کے خلاف اتحاد کی دعوت دینے آیا ہوں لیکن آپ انگریزوں کے ساتھ جنگ کرنے سے کتراتے ہیں تو مرہٹوں کی طرح الگ ہو جائیں اور ہمیں ان سے نپٹنے دیں۔"

نظام نے کہا۔"اگر ہم انگریزوں کا ساتھ چھوڑنا پسند نہ کریں تو؟"

معظم علی نے جواب دیا۔"تو پھر ہمیں افسوس ہوگا۔ ہمیں اس بات کا افسوس ہوگا کہ ہم اپنی انتہائی کوشش کے باوجود اپنے بھائیوں کو اپنے ساتھ نہ ملا سکے۔ ہمیں

آپ کے اس لشکر کی تباہی کا افسوس ہوگا جو اس وقت محاصرے کی حالت میں ہے۔ مرہٹے میدان سے نکل چکے ہیں اور انگریز ملیبار کا محاذ چھوڑ کر آپ کی مدد کے لیے نہیں آ سکتے یہ سوچنا آپ کا کام ہے کہ آپ کتنی دیر ہمارے لشکر کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور پسپائی کی حالت میں آپ کو کس تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حیدر علی کو اس تباہی کا افسوس ہوگا لیکن مستقبل کے مورخ اسے قصوروار نہیں گردانیں گے۔"

نظام نے کہا۔ "تمھیں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہم حیدر علی کی دھمکیوں سے مرعوب ہو جائیں گے!"

"یہ دھمکی نہیں، آپ کے سوال کا سیدھا سادہ جواب ہے لیکن آپ اگر اسے دھمکی سمجھتے ہیں تو اپنے کسی سمجھ دار افسر کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دیجیے۔ میں اسے ہر محاذ کی سیر کرانے کے لیے تیار ہوں۔ پھر وہ آپ کو بتا سکے گا کہ آپ کی فوج کے بچ نکلنے کے کیا امکانات ہیں۔ حیدر علی اپنی نیک نیتی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا دے سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنے ولی عہد شہزادہ فتح علی ٹیپو کو آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ میر نظام علی نے حیران ہو کر سوال کیا۔ "شہزادہ فتح علی ٹیپو کہاں ہے؟"

"وہ یہاں سے آٹھ کوس کے فاصلے پر میری واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر آپ مصالحت پر آمادہ ہیں تو وہ کل صبح آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے لیکن اگر میری معروضات آپ کو متاثر نہ کر سکیں تو بھی وہ کل یہاں ضرور پہنچیں گے۔ میں آپ کو اس وقت بھی یہ ثبوت دے سکتا ہوں کہ دکن سے آپ کی رسد اور کمک کے راستے بند ہو چکے ہیں۔ آج آپ کے سامان رسد کی جو پچاس گاڑیاں آ رہی تھیں وہ اس وقت ہمارے قبضے میں ہیں اور سپاہیوں کا جو دستہ ان کے ساتھ تھا وہ ہماری قید میں ہے۔ اس دستے کے افسر کا نام صولت خاں ہے۔"

محفل پر تھوڑی دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔نظام نے یکے بعد دیگرے اپنے وزیروں اور افسروں کی طرف دیکھا اور معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔"ہم شہزادہ ٹیپو کے ساتھ مصالحانہ گفتگو کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جب ہم یہاں سے کوچ کریں گے تو میسور کی فوج ہمارا تعاقب نہیں کرے گی؟"

"میسور، شہزادہ ٹیپو کے الفاظ سے بڑی ضمانت اور کیا دے سکتا ہے اور اگر آپ کو نقصان پہچانا ہی مطلوب ہوتا تو یہ ہمارے لیے بہترین موقع تھا۔"

میر نظام علی نے کہا۔"تم شہزادہ ٹیپو کو ہماری طرف سے یہ پیغام دے سکتے ہو کہ ہم مصالحت کی گفتگو کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

شمس الامراء نے کہا۔"عالی جاہ اگر اجازت ہو تو میں ان کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔"

"ہاں آپ کو اجازت ہے۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی اور شمس الامراء گھوڑوں پر سوار ہو کر شہزادہ ٹیپو کی قیام گاہ کا رخ کر رہے تھے۔

اگلے دن نظام کے کیمپ میں شہزادہ فتح علی ٹیپو کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور تیسرے دن سرنگا پٹم میں اس خبر پر خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ حیدر علی کے ہونہار بیٹے نے اپنی پہلی سیاسی مہم میں ایک شاندار کامیابی حاصل کی ہے اور نظام کی افواج چینا پٹنا سے واپس حیدرآباد کا رخ کر رہی ہیں۔

مرہٹوں اور نظام کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد حیدرآباد کی افواج آندھی اور طوفان انگریزوں پر ٹوٹ پڑیں۔۱۷۶۹ء تک حیدر علی ملیبار کے ساحلی علاقوں پر قبضہ کر چکا تھا اور انگریز ہر محاذ سے پسپا ہو کر مدراس میں پناہ لے رہے تھے

۔حیدر علی فتوحات کے پرچم لہراتا ہوا مدراس کی طرف بڑھا۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایوانوں پر زلزلہ طاری ہو چکا تھا۔انگریز صلح کے طالب ہوئے۔

شیر میسور نے جواب دیا۔"صلح کی بات چیت اب مدراس میں ہو گی۔

"مدراس سے پانچ میل دور حیدر علی نے صلح کی شرائط پیش کیں اور انگریزوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔

انگریز حیدر علی کے رحم و کرم پر تھے۔اگر وہ چاہتا تو مدراس کے قلعے پر قبضہ کرنا اس کے لیے چند گھنٹوں کی بات تھی۔مورخ اس بات کا صحیح جواب نہیں دے سکتے کہ صلح نامہ کے اصلی محرکات کیا تھے۔یہ اس فاتح کی بلند حوصلگی اور عالی ظرفی تھی۔جس کے نزدیک گرے ہوئے دشمن پر ہاتھ اٹھانا باعث عار تھا یا حیدر علی کو پیچھے سے نظام اور مرہٹوں کے حملے کا خطرہ تھا۔بحر حال جب اس صلح کے عملی نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ ایک بڑی آدمی کی غلطی تھی۔ایسٹ انڈیا کمپنی اس معاہدے کی شرائط کے نبھانے کے متعلق اس وقت بھی نیک نیت نہ تھی جب مدارس کا گورنر اس معاہدے پر دستخط کر رہا تھا۔

آٹھ ماہ بعد مرہٹوں نے ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ دریائے تنگ بھدرا عبور کر کے میسور پر حملی کر دیا۔عہد نامہ مدارس کی رو سے انگریزوں پر حیدر آباد کی مدد فرض تھی لیکن انھوں نے مرہٹوں کے خلاف حیدر علی کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور اس انکار کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریز مرہٹوں کی فتح پر میسور کی بندر بانٹ میں حصہ دار بننا چاہتے تھے۔

حیدر علی قریباً اڑھائی سال مختلف محاذوں پت مرہٹوں کی ٹڈی دل افواج سے برسر پیکار رہا۔اس عرصہ میں اس کے سرحدی علاقے تباہ ہو چکے تھے۔مرہٹے شدید

نقصان اٹھانے کے باوجود تازہ دم افواج میدان میں لا رہے تھے۔ جولائی ۱۷۷۲ء میں حیدر علی نے مرہٹوں کی پیش کردہ شرائط پر صلح کر لی لیکن انگریز افسروں کی بد عہدی اور مرہٹوں کی جارحیت نے اس پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ میسور کی آزادی کے دشمن اسے زیادہ دیر آرام سے نہیں بیٹھنے دیں گے:۔

جنگ سے فارغ ہوتے ہی معظم علی نے اکبر خاں کے حالات معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ حیدر علی کی فوج میں روہیل کھنڈ کے چند نوجوان ملازم تھے اور جنگ کے بعد ان میں سے بعض چھٹی پر جا رہے تھے۔ معظم علی نے ایک طویل خط لکھا اور ان میں سے ایک نوجوان کے حوالے کر دیا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:۔

''عزیز بھائی! تمھارے آخری خط کا جواب شاید ابھی تک میرے ذمے ہے۔ میں پچھلے چند برس بے حد مصروف رہا ہوں۔ تاہم مجھے احساس ہے کہ میں نے تمھارے متعلق اپنے فرض میں کوتاہی کی ہے لیکن تمھارے دل میں یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ میں تمھیں بھول گیا ہوں۔ گذشتہ دس سال میں زندگی کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب میں تمھاری یاد سے غافل تھا۔

تمھیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ انگریزوں اور اس کے بعد مرہٹوں کے خلاف ہماری جنگ کا ایک دور ختم ہو چکا ہے۔ وہ تاریک بادل جو میسور کے آسمان پر چھائے ہوئے تھے، چھٹ گئے ہیں لیکن

میسور میں میرے حصے کا کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ابھی ہمارے راستے میں کئی اور مراحل باقی ہیں۔ میسور کی آزادی اور بقا اور میسور کے علاوہ تمام ہندوستان کو انگریزوں کی جارحانہ عزائم سے بچانے کے لیے ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ سلطان حیدر علی جیسے بیدار مغز انسان کی قیادت اور شہزادہ فتح علی ٹیپو جیسے اولوالعزم مجاہد کی رفاقت میں لڑنا میرے نزدیک ایک بہت بڑی سعادت تھی وہ کم سن لڑکا جسے تم نے کئی برس پہلے ایک شیر کے بچے سے کھیلتے دیکھا تھا۔ اب میسور کی فوج کا جرنیل بن چکا ہے۔ میں اپنی زندگی میں اس سے زیادہ کسی نوجوان کی ذہانت اور عزم و استقلال سے مرعوب نہیں ہوا۔ شہزادہ ٹیپو کے سپاہیانہ جوہر ان کی علمی قابلیت اور ذہانت اور ان کی پاک بازی اور تقویٰ ہماری مٹی ہوئی قوم کی سب سے بڑی پونجی ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ شہزادہ ٹیپو کی رفاقت میں میری زندگی کا ہر سانس عبادت ہے۔

سلطان حیدر علی نے جنگ سے فارغ ہوتے ہی مجھے سرنگا پٹم کی فوجی تربیت گاہ کا ناظم اعلیٰ مقرر کر دیا تھا اور میرے لیے اس سے بڑا

اطمینان اور کیا ہو سکتا ہے کہ مجھ سے تربیت حاصل کرنے والے نوجوان کسی دن میسور کے اُجلعظیم کی قیادت میں مردانگی کے جوہر دکھائیں گے۔ جس کے نصب العین نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کا اتحاد ہے۔

قریباً چار سال ہوئے شیر علی نے مجھے لکھا تھا کہ میں حج پر جا رہا ہوں۔ اس کے بعد اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ آج میں ان کو بھی خط لکھ رہا ہوں۔ تمھارے بڑے بھتیجے، صدیق علی خان کو میسور کے سب سے بڑے جنگی جہاز کا کپتان بننے کا شوق ہے اور میں نے اس کی تربیت کے لیے ابھی سے ایک فرنسیسی اتالیق مقرر کر دیا ہے۔

مسعود اور انور اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ ہم بڑے ہو کر اپنے چچا اکبر خاں کے پاس جائیں گے اور وہاں شیر مارا کریں گے۔ تمھارے سب سے چھوٹے بھتیجے کا نام مراد علی ہے اور وہ اگلے مہینے دو سال کا ہو جائے گا۔ فرحت کی والدہ پچھلے سال وفات پا گئیں تھیں۔ صابر اور دلاور خان ابھی تک میرے ساتھ ہیں اور تمھیں بہت یاد کرتے ہیں۔

اگر کبھی فرصت ملے تو چند دن کے لیے سرنگا پٹم آ
جاؤ۔ تمھیں دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے اور تمھاری
بھابھی بلقیس کو بہت یاد کرتی ہے ۔بچوں کی یہ
حالت ہے کہ جب ان سے کوئی میسور کی فوج کے
کسی جوان کی بہادری کا ذکر کرتا ہے تو وہ بڑے فخر
کے ساتھ کہتے ہیں کہ تم نے ہمارا چچا اکبر خاں نہیں
دیکھا ۔خدا معلوم صابر انھیں تمھارے متعلق کتنی
فرضی داستانیں سنا چکا ہے کہ وہ تمھیں اس دور کا
سب سے زیادہ شہ زور اور بہادر آدمی سمجھتے ہیں ۔
اگر ممکن ہو تو ضرور آنے کی کوشش کرو ۔''

تمھارا بھائی معظم علی

تین ماہ بعد معظم علی کو اکبر علی کی طرف سے جواب موصول ہوا۔''

''بھائی جان! میرا خیال تھا کہ آپ مجھے
بھول چکے ہوں گے ۔کئی بار میں نے سرنگا پٹم آنے
کا اردا ہ کیا مگر حالات نے گھر سے نکلنے کی اجازت
نہ دی ۔مرہٹوں نے چند برس سے ہماری سرحدوں
پر طوفان برپا کر رکھا ہے ۔میرے علاقے پر تین
حملے ہو چکے ہیں پچھلے سال انھوں نے ہمارے دو
گاؤں جلا کر راکھ کر دیئے تھے ۔اس کے بعد میں
نے پڑوس کے سرداروں کی مدد سے ان کا تعاقب

کیا اور سرحد کے قریب تین سو لٹیروں کے ایک گروہ کا صفایا کر ڈالا۔ اس کے بعد ہمارے علاقے پر کوئی حملہ نہیں ہوا لیکن روہیل کھنڈ کو ہمیشہ مرہٹوں کی یلغار کا خطرہ رہتا ہے۔ حافظ رحمت خاں کی قیادت میں ہم کافی منظم ہو چکے ہیں لیکن ہمارے وسائل محدود ہیں اور ہم تنہا کسی بیرونی طاقت کے ساتھ ٹکر نہیں لے سکتے۔ ہم دلی کے حالات سے مایوس ہو چکے ہیں، پچھلے دنوں حافظ رحمت خاں نے نواب وزیر اودھ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہے جس کی رو سے مرہٹوں کے حملے کی صورت میں اودھ کی افواج ہماری مدد کرے گی لیکن کاش ہم نواب وزیر اودھ پر اعتماد کر سکتے۔ میسور کے متعلق سوچتے ہوئے بار بار میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش حیدر علی اور شہزادہ ٹیپو جیسے رہنما شمالی ہندوستان میں پیدا ہوتے۔

شیر علی حج کے بعد مدینہ شریف میں آباد ہو گئے ہیں۔ اپنے ایک ساتھی کی معرفت انھوں نے مجھے یہ پیغام بھیجا تھا کہ میں واپس نہیں آؤں گا۔ حج پر جانے سے پہلے وہ اپنا تجارتی کاروبار ختم کر چکے تھے۔ مکان فروخت کرنے کے بعد ان کے پاس

اتنا سرمایہ تھا باقی زندگی بڑے آرام سے گزار سکیں
۔پچھلے سال بلقیس کی والدہ حیدرآباد سے عطیہ کے
پاس چلی گئی تھیں ۔چند ماہ بعد ہمیں شیخ فخر الدین
کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ وہیں پر وفات پا گئی ہیں
۔بلقیس چند دن کے لیے اپنی بہن کے پاس جانے
پر مضر ہے۔اگر حالات نے مجھے گھر سے نکلنے کی
اجازت دی تو ہم ادھونی سے ہو کر آپ کے پاس
آئیں گے۔

بھائی جان! میں ہر وقت آپ کو یاد کرتا رہتا
ہوں اور نماز کے بعد میری پہلی دعا آپ کے لیے
ہوتی ہے۔میرا بڑا لڑکا داؤد خان نو سال کی عمر میں
گر کر فوت ہو گیا تھا۔اس کا چھوٹا بھائی شہباز خان
چوتھے سال میں ہے۔پچھلے سال ہمیں خدا نے
ایک لڑکی عطا کی ہے،بلقیس نے اس کا نام تنویر رکھا
ہے۔بلقیس آپ کو اور بھابھی جان کو سلام کہتی ہے:
"۔

آپ کا بھائی اکبر

○

معظم علی کو سرنگا پٹم کی فوجی تربیت گاہ کے ناظم کے عہدے پر فائز ہوئے چند مہینے
گزرے تھے کہ پونا میں مرہٹوں کے پیشوا مادھو راؤ کے انتقال اور اس کی جانشینی

کے دعویداروں کے درمیان خلف شار کی اطلاع ملی ۔حیدر علی خاں کے دل پر مرہٹوں کے زخم ابھی تازہ تھے۔اس نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور میسور کے چھنے ہوئے علاقے واپس لینے کے لیے چڑھائی کر دی۔شہزادہ ٹیپو آزمودہ کار افسروں اور سپاہیوں کی ایک فوج لے کر سرا کی طرف بڑھا اور اس نے تین ماہ کے اندر اندر سرا کے تمام علاقے پر قبضہ کرلیا۔اس کے بعد مرہٹے ابھی سنبھلنے نہ پائے تھے کہ اس نے مدھاگڑی اور گرم کنڈہ پر یلغار کر دی۔اس عرصہ میں حیدر علی ہوسکوٹ کا محاصرہ کر چکا تھا۔

ایک دن معظم علی سرپٹ گھڑا دوڑاتا ہوا سکوٹ کے باہر میسور کی فوج کے کیمپ میں داخل ہوا۔وہ گھوڑے سے اترتے ہی حیدر علی کے خیمے کی طرف بڑھا۔محافظ دستے کے سالار نے اسے سلام کرنے کے بعد کہا۔آپ کا صبح سے انتظار ہو رہا ہے۔ میں ابھی اطلاع دیتا ہوں۔" افسر خیمے کے اندر داخل ہوا اور چند ثانیے بعد اس نے باہر آ کر کہا۔"تشریف لائیے!"

معظم علی خیمے کے اندر داخل ہوا۔ل واب حیدر علی، شہزادہ ٹیپو اور پنڈارہ فوج کے سپہ سالار غازی خان چٹائی پر بیٹھے ایک نقشہ دیکھ رہے تھے۔حیدر علی نے معظم علی کی طرف دیکھ کر کسی تمہید کے بغیر کہا۔"معظم علی تم سفر کے لیے تیار ہو کر آئے ہو نا؟"

"جی ہاں میں تیار ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ چند دن سے میں ایک اہم مہم کے لیے کسی موزوں آدمی کا متلاشی تھا فتح علی کو اصرار ہے کہ اس مہم کے لیے تم سے زیادہ موزوں آدمی اور کوئی نہیں ہوسکتا میں تمھیں نواب وزیر اودھ کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔اب مرہٹوں کے مظالم کا بدلہ

لینے کا وقت آ گیا ہے۔ہم انشاءاللہ ایک ہفتے کے اندر اندر ہوسکوٹ فتح کر لیں گے۔اس کے بعد میں دریائے کرشنا تک ان کا تعاقب کرنے کا تہیہ کر چکا ہوں ۔اس وقت نواب شجاع الملک کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ مرہٹوں پر ضرب کاری لگانے کے لیے اس سے بہتر وقت پھر کوئی نہیں ملے گا۔اگر وہ اودھ سے پیش قدمی کریں اور ادھر سے ہم آگے بڑھیں تو اس ملک کو مرہٹوں کی چیرہ دستیوں سے ہمیشہ کے لیے نجات مل سکتی ہے۔دلی کے دربار میں مرہٹوں کے اثر ورسوخ کے باعث اس ملک کے ہر مسلمان حکمران کے لیے ایک خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔مجھے یقین ہے کہ شجاع الملک اگر بے وقوف نہیں تو وہ تمھاری باتوں سے ضرور متاثر ہوگا۔اس کے بعد تم روہیل کھنڈ میں حافظ رحمت خاں کے پاس جاؤ۔مجھے یقین ہے کہ ہمارے اتحاد کے بعد دلی کے بے بس امراء بھی جاگ اٹھیں گے اور نظام بھی یہ محسوس کرے گا کہ غیر جانبداری اس کے لیے سود مند نہیں ہوگی۔مرہٹوں سے نپٹنے کے بعد ہم چند ہفتوں میں انگریزوں کو سمندر کی طرف دھکیل دیں گےتم نواب اودھ کو یہ سمجاؤ کہ اس وقت اودھ اور شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی جنگ میسور میں لڑی جا رہی ہے۔۔۔سرنگا پٹم میں بھی تمھاری خدمات کی ضرورت تھی لیکن یہ کام زیادہ اہم ہے۔"

معظم علی نے کہا۔"مجھے اس کی اہمیت کا پورا احساس ہے اور اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آج ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں؟"

"نہیں تم کل صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔میں آج شام تک نواب شجاع الملک اور حافظ رحمت خاں کے نام خطوط لکھوا کر تمھارے حوالہ کر دوں گا لیکن تمھیں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔جب تک ہمارے مابین تعاون کا کوئی معاہدے طے نہیں پا جاتا اس وقت تک ہمارے ارادوں کی کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔شہزادہ ٹیپو تمھیں

لکھنؤ تک پہنچانے کا بندوبست کر دیں گے۔“

اگلے دن معظم علی علی الصباح پانچ سواروں کے ہمراہ لکھنؤ کا رخ کر رہا تھا۔:

نواب وزیر اودھ اپنے محل کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔اس کا بیٹا آصف الدولہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔”ابا جان یہ وہی معظم علی ہے جو دس بارہ سال قبل یہاں تجارت کرتا تھا اور جس نے پانی پت کی جنگ میں بھی کافی شہرت حاصل کی تھی۔

میں نے اس سے کہا کہ اس وقت آپ ملاقات نہیں کر سکتے لیکن وہ مصر ہے اور کہتا ہے کہ میں میسور سے حیدر علی کا ایک اہم پیغام لے کر آیا ہوں اور میری ملاقات کا اودھ کے مستقبل سے گہرا تعلق ہے۔آپ اگر اجازت دیں تو میں اسے بلاؤں ممکن ہے کوئی اہم بات ہو سپاہی اسے ملاقات کے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے پہلے یہ تسلی کر چکے ہیں کہ وہ مسلح نہیں ہے۔“

نواب شجاع الدولہ نے کہا۔”اگر یہ وہی معظم علی ہے تو ہم اس سے ضرور ملیں گے،اسے بلاؤ!“

آصف الدولہ کمرے سے باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد معظم علی کے ساتھ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔معظم علی کے سلام کے جواب میں شجاع الدولہ نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن معظم علی نے اس کے ہاتھ کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔آصف الدولہ نے اپنے باپ کے قریب بیٹھتے ہوئے مسند کے سامنے خالی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا تشریف رکھیے۔“لیکن اس نے کہا ۔”میں بیٹھ کر آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔مجھے افسوس ہے کہ میں نے بے وقت آپ کو تکلیف دی ہے۔میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔اس کے لیے مجھے صرف

چند منٹ درکار ہیں۔ میں نے لکھنو پہنچتے ہی ایک وحشت ناک خبر سنی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے انگریزوں کے ساتھ مل کر روہیل کھنڈ پر چڑھائی کر دی ہے؟"

شجاع الدولہ نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور پھر معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے تمھیں یہاں آنے کی ضرورت نہ تھی۔"

معظم علی نے کہا۔ "اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے میں وارن ہیسٹنگز کے دربار میں نہیں جا سکتا۔ میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ اودھ کے مستقبل کے امین ہیں اور ایک مسلمان ہونے کی وجہ سے اودھ کی رعایا اور اودھ کی حکومت کے ساتھ دلچسپی ہے۔"

شجاع الدولہ نے جواب دیا۔ تو تمھیں اودھ کے مستقبل کے لیے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ چند دن تک تم یہ سنو گے کہ ہم اودھ کی مملکت میں ایک وسیع علاقہ شامل کر چکے ہیں۔"

معظم علی نے کہا۔ "اگر وسیع علاقے سے آپ کی مراد روہیل کھنڈ ہے تو وہ دن دور نہیں جب اودھ کا ہر بچہ بوڑھا آپ کے اس فیصلے کی مذمت کرے گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ روہیل کھنڈ آپ کی مملکت کا حصہ بننے کی بجائے ان بھیڑیوں کی شکارگاہ بن جائے گا جن کے ہاتھ پلاسی اور بکسر کی جنگ کے شہیدوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ خدا کے لیے روہیل کھنڈ کو تباہی سے بچائیے ورنہ شرافت اور انسانیت کے دشمن کسی دن دلی اور اودھ پر چڑھ دوڑیں گے!"

شجاع الدولہ نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "تمھیں معلوم ہے کہ حافظ رحمت خاں نے ہمارے ساتھ بد عہدی کی ہے؟ اس نے ہمارے ساتھ معاہدہ کیا تھا

کہ اگر ہم مرہٹوں کے خلاف اسے مدد دیں گے تو وہ ان کے عوض ہمیں چالیس لاکھ روپیہ ادا کرے گا۔ گزشتہ سال جب مرہٹوں نے روہیل کھنڈ پر حملہ کیا تھا تو ہم نے معاہدے کے مطابق رحمت خاں کی اعانت کے لیے فوج بھیجی تھی لیکن مرہٹوں سے نجات حاصل کرنے کے بعد وہ ہمیں چالیس لاکھ روپیہ ادا کرنے سے منحرف ہو گیا ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "لیکن میں نے سنا ہے کہ حافظ رحمت خاں نے جنگ کی صورت میں یہ رقم دینے کا وعدہ کیا تھا اور مرہٹے جنگ کیے بغیر واپس چلے گئے تھے۔ پھر بھی اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ روہیلیوں کو یہ رقم ضرور ادا کرنی چاہیئے تو اس کے لیے روہیل کھنڈ پر چڑھائی کرنا کسی صورت مناسب نہیں۔ خدا کے لیے اپنی افواج کو روکیے ورروہیلیوں کو انگریزوں کے ساتھ نپٹنے دیجیے۔ میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ آپ کو چالیس لاکھ روپیہ ادا کر دیا جائے گا۔ میں رحمت کے پاس جانے کو تیار ہوں اور مجھے یقین ہے کی وہ چالیس لاکھ روپیہ کے بدلے آپ سے لڑائی مول لینا گوارا نہیں کریں گے۔ اگر مجھے وہاں سے مایوسی ہوئی تو بھی میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی ایک ایک کوڑی ادا کر دی جائے گی۔ میں حیدر علی کے پاس جاؤں گا اور اگر میں نے باری سال کی رفاقت کے بعد انھیں غلط نہیں سمجھا تو مجھے یقین ہے کہ وہ دو مسلمان طاقتوں کا تصادم روکنے کے لیے چالیس لاکھ روپیہ قربان کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔"

شجاع الدولہ نے کہا تم بہت دیر سے آئے ہو ہم چالیس لاکھ روپیہ انگریزوں کو ادا کر چکے ہیں۔ ہماری افواج روہیل کھنڈ میں داخل ہو چکی ہے اور دو تین دنوں کے اندر اندر میراں پور کڑہ پر ہماری فتح کا جھنڈا لہرا رہا ہو گا۔ اب ہم کچھ نہیں کر سکتے

۔تیر کمان سے نکل چکا ہے اور اس جنگ کی تمام تر ذمہ داری حافظ رحمت خاں پر عائد ہوتی ہے۔"

معظم علی نے کہا مجھے معلوم نہیں کہ مستقبل کے مورخ اس جنگ کی ذمہ داری کس پر عائد کریں گے لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ آج انگریز روہیل کھنڈ کو چالیس لاکھ کے عوض آپ کے ہاتھ فروخت کر رہے ہیں تو کل وہ لکھنو کی آزادی کوڑیوں کے مول کسی اور کے ہاتھ فروخت کریں گے۔ اگر آپ کو اس ملک کے خلاف انگریزوں کے عزائم کے متعلق کوئی غلط فہمی تھی تو وہ پلاسی اور بکسر کے واقعات کے بعد دور ہو جانی چاہیئے تھی۔ روہیل کھنڈ پر آپ کی فتح نہیں ہوگی بلکہ اس بیرونی سامراج کی فتح ہوگی جو دلی تک اپنا راستہ صاف کرنا چاہتا تھا۔"

آصف الدالہ غصہ سے کانپ رہا تھا اور نواب شجاع الدولہ کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس نے کہا ہمیں ان معاملات میں تمھارے مشوروں کی ضرورت نہیں۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ تم نواب حیدر علی کی طرف سے کوئی ضروری پیغام لے کر آئے ہو!"

معظم علی نے جواب دیا۔ "اب آپ کو حیدر علی کی طرف سے کسی پیغام کی ضرورت نہیں۔ اب آپ کو یہ سمجھانا حیدر علی کے بس کی بات نہیں کہ اس ملک میں آپکے دوست اور دشمن کون ہیں۔ حیدر علی وحشت اور بربریت کی جس آگ کو سات سمندر دور رکھنا چاہتے ہیں وہ لکھنو کی چاردیواری تک پہنچ چکی ہے۔"

آصف الدولہ نے کہا۔ "آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" معظم علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب میں صرف یہ دعا کرتا ہوں کہ خدا اس قوم کو اس کے اکابر کی کوتاہیوں اور غلط اندیشیوں کی سزا نہ دے۔

مجھے اجازت دیجئے۔۔۔!'' معظم علی یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

آصف الدولہ نے اپنے باپ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔''ابا جان اس کے متعلق آپ کا کیا حکم ہے اگر اجازت ہو تو اسے گرفتار کر لیا جائے؟''

شجاع الدولہ نے جواب دیا۔''نہیں اسے گرفتار کرنے سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ حیدر علی نے اسے کس مقصد سے یہاں بھیجا تھا اور لکھنو میں اس کے ساتھی اور کون ہیں۔ہم نے روہیل کھنڈ فوجیں روانہ کرتے وقت انتہائی روزداری سے کام لیا تھا لیکن میں حیران ہوں کہ شہر کے لوگوں کو کس نے باخبر کیا ہے۔تم اس نوجوان پر کڑی نگرانی رکھو!''

معظم علی نے محل سے نکل کر اس سرائے کا رخ کیا جہاں اس کے ساتھی ٹھہرے ہوئے تھے سرائے کے دروازے پر اس کا ایک ساتھی اس کا انتظار کر رہا تھا۔اس نے معظم علی کو دیکھتے ہی سوال کیا۔''کہیے کچھ کامیابی ہوئی؟''

معظم علی نے کہا ہمیں چند منٹ کے اندر اندر یہاں سے نکل جانا چاہیئے''۔

معظم علی کے تیور دیکھ کر اس کے ساتھی کو کوئی اور سوال پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی اور تھوڑی دیر بعد یہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر روہیل کھنڈ کا رخ کر رہے تھے۔

ایک گھنٹہ بعد آصف الدولہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اپنے باپ کے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔''ابا جان میں نے جو جاسوس اس کے پیچھے روانہ کیا تھا وہ واپس آ گیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ معظم علی اور اس کے پانچ ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر شہر سے نکل گئے ہیں اور ان کا رخ روہیل کھنڈ کی طرف تھا۔اگر آپ کو حکم ہو تو ان کے پیچھے سپاہیوں کا ایک دستہ روانہ کر دیا جائے!''۔

شجاع الدولہ نے جواب دیا۔''نہیں اب روہیل کھنڈ پہنچ کر وہ ہمارے لیے کسی

پریشانی کا باعث نہیں ہو سکتے ۔ جنگ ایک دو دن کے اندر ختم ہو جائے گی ۔ میں صرف لکھنو میں ان کی سرگرمیوں سے باخبر رہنا چاہتا تھا ۔ اگر یہ آدمی چند دن پہلے آتا تو میں یقیناً اسے گرفتار کر لیتا ۔ اب اس کا راستہ روکنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں "۔:؛۔

سترھواں باب

ایک شام معظم علی اور اس کے ساتھی گھنا جنگل عبور کرنے کے بعد اس وادی میں داخل ہو چکے تھے۔ جہاں اکبر خاں کے قبیلے کی بستیاں آباد تھیں۔ اکبر خان کے گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی اک ٹیلے کے اوپر سے گزرتی تھی۔ معظم علی نے ٹیلے پر پہنچ کر اپنے سامنے اچانک وحشت ناک منظر دیکھا اور اپنا گھوڑا روک لیا۔ شام کے دھندلکے میں اکبر خاں کا گاؤں آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ نظر آتا تھا۔ ایک ثانیہ کے لیے معظم علی کی رگوں میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ اکبر خاں کی بستی سے آگے افق پر دو اور بستیوں میں آگ کے شعلے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک لمحہ کے اندر اندر وحشت، بربریت اور مظلومیت کے کئی منظر معظم علی کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ اس کے ساتھی انتہائی پریشانی کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معظم علی نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ اکبر خاں کا گاؤں ہے۔ اب وہاں شاید دشمن کے سوا کوئی اور نہ ہو۔ تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔

معظم علی کے ایک ساتھی نجف خان نے کہا۔ آپ کم از کم ایک آدمی کو ضرور ساتھ لے جائیں۔

بہت اچھا! تم میرے ساتھ آؤ!"

نجف خاں کے ساتھ ٹیلے سے اتر کر کوء ایک کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد معظم علی نے کہا۔ اب گوڑوں کو آگے لے جانا ٹھیک نہیں، تم یہین ٹھہرو اور میرا انتظار کرو! اگر مجھے کوئی خطرہ پیش آیا تو میں بندوق چلا کر تمہیں خبردار کر دوں گا۔ پھر اگر میں صبح تک نہ پہنچوں تو تم باقی ساتھیوں کو لے کر واپس روانہ ہو جانا۔ میرا خیال ہے کہ بستی سے باہر اور دھیا انگریزی فوج کا کوئی دستہ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ ورنہ

یہ ممکن نہیں کہ اکبر خاں کے گھر میں آگ لگی ہو اور علاقے کے لوگ دیوانوں کی طرح اس طرف نہ بھاگ رہے ہوں۔

معظم علی نے اپنا گھوڑا نجف خاں کے سپرد کیا اور بھاگتا ہوا گاؤں کی طرف بڑھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اسے گاؤں کی دوسری طرف آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گاؤں کے درمیانی حصے میں آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ اور اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ آگ کا سارا زور اکبر خاں کی حویلی میں ہے۔ گاؤں سے باہر چند مقامات پر گندم کے کھلیان جل رہے تھے اور بعض کھیتوں میں پکی ہوئی گندم ابھی تک کھڑی تھی۔ معظم علی روشنی سے بچنے کے لئے گندم کے کھیتوں میں جھک جھک کر چلتا ہوا گاؤں کی دوسری طرف بڑھا۔

تھوڑی دیر بعد اسے ایک وسیع میدان میں فوج کا پڑاؤ دکھائی دیا۔ گاؤں سے آگ کی روشنی دور دور پہنچ رہی تھی۔ پڑاؤ کے درمیان چند خیمے نصب تھے اور پیچھے ایک ٹیلے کے نشیب میں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ایک جگہ فوج کے لئے کھانا تیار ہو رہا تھا۔ کچھ سپاہی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں زمین پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اور باقی گاؤں کی طرف جمع ہو کر آگ کا منظر دیکھ رہے تھے یہ اودھ کی فوج تھی۔

معظم علی گندم کے ایک کھیت میں رینگتا ہوا آگے بڑھا اور سپاہیوں کی ایک ٹولی کے قریب جا پہنچا۔ اودھ کے سپاہیوں کے درمیان چند انگریز کھڑے تھے۔ اوران کے چہرے آگ کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ معظم علی ان کی باتیں سننے کے لیے قریب جانا چاہتا تھا لیکن گندم کے کھیت سے آگے کوئی چھپنے کی جگہ نہ تھی سپاہیوں کے گروہ کے پاس معظم علی کو دو توپیں دکھائی دیں۔

پہریداروں کی ایک ٹولی گشت لگاتی ہوئی کھیت کے قریب سے گزری اور معظم علی کھیت کے کنارے سے پیچھے ہٹ کر لیٹ گیا۔ایک سپاہی اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔اب اس علاقے کے لوگ خواب میں بھی کسی انگریز پر گولی نہیں چلائیں گے۔

دوسرے نے کہا! تم انہیں نہیں جانتے۔یہ لوگ مرتے دم تک اپنے دشمن کو معاف نہیں کرتے۔تم نے ان کے سردار کو نہیں دیکھا؟ وہ رسیوں میں جکڑا ہوا بھی انگریز افسر کو گالیاں دے رہا تھا۔

تیسرے نے کہا۔وہ تو نواب اودھ کو بھی گالیاں دے رہا تھا۔اس کے خاندان کے لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ وہ حملے سے پہلے یہاں سے نکل گئے تھے۔ورنہ ان میں سے کوئی زندہ بچتا۔

چوتھے نے کہا۔لیکن مجھے اب بھی یقین ہے کہ جن لوگوں نے انگریزوں پر گولی چلائی تھی وہ صبح تک اپنے سردار کی جان بچانے کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیں گے۔

لیکن اگر انہوں نے اپنے آپ کو پیش نہ کیا تو؟

تو کل اسے پھانسی دے دی جائے گی اور پھر اس قوم کی ہر بستی کا یہی حال ہوگا

۔

لیکن یہ ظلم ہے

ظلم کیا ہے یہ لوگ اپنی تباہی کے خود ذمہ دار ہیں۔

پہرے دار دور چلے گئے ا رمعظم علی اسی طرح رینگتا ہوا واپس لوٹا اور تھوڑی دیر بعد وہ کھیت سے نکل کر بھاگ رہا تھا۔

معظم علی نے پگ ڈنڈی پر پہنچ کر ادھر اُدھر دکھا لیکن نجف خاں اسے کہیں نظر نہ آیا۔ نجف کاں! نجف خاں! اس نے دبی زبان سے آوازیں دیں اور پھر کسی طرف سے جواب نہ پا کر اس نے سوچا شاید میں تاریکی میں راستہ بھول کر کسی اور جگہ آ گیا ہوں۔ وہ پریشانی اضطراب اور تذبذب کی حالت میں پگ ڈنڈی پر کھڑا تھا۔ اچانک اسے کسی کی آواز سنئی دی۔ اپنے ہتھیار پھینک دو تم ہماری بندوقوں کی زد میں ہو!

معظم علی نے اطمینان سے جواب دیا۔ اگر تم انگیریا اودھ کی فوج کے سپاہی نہیں ہو تو مجھے اپنا دوست سمجھو۔

تم اپنے ہتھیار رودو ہم کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے۔

معظم علی نے اپنی بندوق پھینک کر دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ اگر تم اکبر خاں کے ساتھی ہو تو اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔

پانچ آدمی بندوقیں سیدھی کیے کھیت کی مینڈ کی آڑ سے نمودار ہوئے اور انہوں نے آگے بڑھ کر معظم علی کو گھیرے میں لے لیا۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اس کی بندوق اٹھالی۔

معظم نے کہا۔ میں اکبر کا دوست ہوں اور آپ نے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میرا ساتھی کہاں ہے؟

ایک آدمی نے کہا۔ اکبر خاں کے دوست اس طرح مسلح ہو کر رات کو اس علاقے میں نہیں آتے۔ تمہارا ساتھی اگر یہیں تھا تو وہ ہماری قید میں ہے اور اگر جنگل کے قریب ٹیلے پر بھی تم ہی اپنے چار اور ساتھیوں کو چھوڑ آئے تھے تو وہ بھی ہماری قید میں ہیں۔

معظم علی نے کہا۔میرا نام معظم علی ہےاور اگر تم میں سے کوئی شخص اکبر کے گاؤں کا ہے تو میں اس پر یہ ثابت کرسکتا ہوں کہ میں اکبر خاں کا دوست ہوں۔

ہم روہیلاکھنڈ کے لوگوں کے سوا کسی کو اکبر خاں کا دوست نہیں سمجھتے تم ہمارے ساتھ چلو!

میں آپ کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں لیکن اس سے پہلے میں آپ سے اکبر خاں کے خاندان کے لوگوں کا حال پوچھنا چاہتا ہوں۔اس وقت اس کی والدہ بیوی اور بچے کہاں ہیں؟

ایک آدمی نے بستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اکبر خان کی والدہ اور اس کے کاندان کے کئی افراد کی لاشیں اس مکان کے اندر جل رہی ہیں لیکن تم نے اکبر خاں کے متعلق کیوں نہیں پوچھا؟

اکبر خان کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ وہ اس وقت دشمن کی قید میں ہے خدا کے لیے آپ اس کی بیوی اور بچوں کے متعلق بتائیے۔

اس کی بیوی اور بچے سلامت ہیں لیکن تمہارا ساتھی یہ کہتا تھا کہ تم لوگ لکھنو کے راستے آرہے ہو پھر تمہیں اکبر خاں کے متعلق یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ قید میں ہے؟

چلو!

کھیتوں سے آگے قریباً دو میل گھنے جنگل میں چلنے کے بعد یہ لوگ ایک جگہ رکے جنگل کے پہریداروں میں سے کسی نے درختوں کی اوٹ سے آواز دی۔کون ہے؟

معظم علی کے ایک ساتھی نے جواب دیا۔میں نعمت خاں ہوں' ہم نے چند قیدی بھیجے تھے وہ پہنچ گئے ہیں؟

پہریدار نے جواب دیا۔وہ پہنچ گئے ہیں لیکن آپ سے بڑی غلطی ہوئی وہ قیدی نہیں ہیں ان کا ایک ساتھی پیچھے رہ گیا تھا۔وہ کہاں ہے۔

وہ ہمارے ساتھ ہے۔

اسے آگے لے چلو!

تاریک اور گھنے جنگل میں تھوڑی دور اور چلنے کے بعد معظم علی کو ایک جگہ روشنی دکھائی دی ایک آدمی مشعل بلند کیے گھنے درختوں کی آڑ سے نمودار ہوا اور معظم علی کے قریب پہنچ کر بولا۔آپ معظم علی ہیں؟

ہاں!اس نے جواب دیا۔

معاف کیجئے ہمارے آدمیوں سے بڑی بھول ہوئی۔

معظم نے جواب دیا۔آپ کے ساتھیوں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔اکبر خاں کی بیوی اور بچے کہاں ہیں؟

قریب سے آہوں۔سسکیوں اور چیخوں میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ بھائی جان!میں یہاں ہوں۔

اور ایک ثانیہ بعد بلقیس تاریکی سے نکل کر معظم علی کے سامنے کھڑی تھی معظم علی نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔بلقیس اب باتوں کا وقت نہیں۔بھائیو!میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس جنگل میں کتنے آدمی ہیں جو ہتھیار اٹھا سکتے ہیں؟

ایک آدمی نے جواب دیا۔اس جنگل میں آس پاس کی تمام آبادی جمع ہو چکی ہے لیکن جو لڑنے والے تھے،ان میں سے کچھ تو میراں پور کٹرہ کی جنگ میں کام آ چکے ہیں اور کچھ ہمارے گاؤں کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہو گئے ہیں صبح تک

انگریز اور اودھ کے سپاہی ہمیں بھی اس جنگل میں گھیر گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔

معظم علی نے جواب دیا۔ اگر تین چار سو آدمی اس وقت اپنی جانوں پر کھیلنے کے لئے تیار ہو جائیں تو ایسی صبح کبھی نہیں آئے گی۔ میرا اندازہ ہے کہ دشمن کے پڑاؤ میں چار پانچ سو آسامیوں سے زیادہ نہیں ہوں گے۔

ایک آدمی آگے بڑھ کر بے اختیار معظم علی کے ساتھ لپٹ گیا اور اس نے کہا۔ ان شکست خوردہ آدمیوں کو ایک رہنما کی ضرورت تھی۔ قدرت نے ہماری مدد کے لیے آپ کو بھیج دیا ہے۔ یہاں کم از کم دو سو آدمی ایسے ہیں جو پانی پت کی جنگ میں آپ کے ساتھ تھے۔ اگر آپ ہماری رہنمائی کریں تو ایک ہزار آدمی آپ کے ساتھ جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہیں ہم اکبر خاں کو دشمن کی قید میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے۔

معظم علی نے کہا۔ تم فوراً تمام آدمیوں کو جمع کرو ہم آدھی رات کے وقت یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔

چند منٹ کے اندر اندر جنگل کے طول و عرض میں پانی پت کے آزمودہ کار سپاہی کی آمد کی خبر مشہور ہو چکی تھی اور بوڑھے جوان اور نوعمر لڑکے معظم علی کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ ان میں بعض وہ بھی تھے۔ جو تیرہ سال قبل پانی پت کے میدان میں معظم علی کے دوش بدوش داد شجاعت دے چکے تھے۔ معظم علی انہیں ضروری ہدایات دینے کے بعد ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے روہیلکھنڈ کی جنگ اور بستی پر حملے کی تفصیلات سن رہا تھا۔

اکبر خاں کے گاؤں کے ایک آدمی نے اسے بتایا کہ اودھ اور انگریزوں کی

افواج نے مختلف مقامات سے روہیلکھنڈ میں داخل ہو کر میراں پور کٹرہ کی طرف پیشقدمی کی تھی، اکبر خاں اپنے علاقے کے ایک ہزار جوانوں کو لے کر حافظ رحمت خان کی مدد کے لیے روانہ ہا۔اس کی روانگی کے دو دن بعد اودھ سے کمک کے چند دستے اس علاقے میں داخل ہوئے ہمارے پاس بستیوں کی حفاظت کے لئے زیادہ آدمی نہ تھے۔اس لیے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر دشمن ہماری بستیوں کی حفاظت کے لیے زیادہ آمدی نہ تھے۔لیکن اودھ کی فوج اس علاقے کے لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے ارادے سے ہمارے گاؤں میں داخل ہوگئی۔

ان کے ساتھ پانچ انگریز افسر تھے۔گاؤں کے لوگ سر سمیہ ہو کر سردار اکبر خاں کی حویلی میں جمع ہو گئے۔اودھ کے کماندار نے ہم سے مطالبہ کیا کہ اگر گاؤں کے لوگ اپنا اسلحہ ہمارے حوالے کردیں اور ہمیاں سردار کے مکان کی تلاشی لینے دیں تو ان پر کوئی سختی نہیں کی جائے گی دشمن کو یقین تھا کہ ہم اس کی دھکی سے مرعوب ہو جائیں گے لیکن ہم نے یہ جواب دیا کہ اکبر خاں کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے تمہیں ہماری لاشوں پر سے گزرنا پڑے گا۔ایک انگریز نے شیخی میں آکر حویلی کے دروازے پر ہوائی فائر کردیا۔اس کے جواب میں ہم نے گولیاں چلائیں۔اور پلک جھپکنے کی دیر میں دس پندرہ آدمی وہیں ڈھیر وہ گئے۔ہلاک ہونے والوں دو انگریز تھے۔ایک انگریز نے زخمی ہوکر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگادی۔اودھ کے سپاہیوں کے لیے یہ صورتِ حالات غیر متوقع تھی اور وہ بھاگ نکلے۔ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد نہ تھی لیکن ہم نے تعاقب کرنا مناسب نہ سمجھا۔

پھر ہمیں میراں پور کٹرہ کے میدان میں اپنی شکست اور حافظ رحمت خان کی شہادت کی اطلاع ملی۔ہمارے علاقے کے چارسونو جوان شہید ہئے اور باقی اکبر

خاں کے ساتھ واپس آ گئے۔

تین دن بعد ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اودھ کی فوج کے کچھ دستے چند انگریز سپاہیوں کے ساتھ اس گاؤں کا رخ کر رہے ہیں۔سردار نے راتوں رات گاؤں کی عورتوں اور بچوں کو جنگل کی طرف بھیج دیا ہمیں پتہ چلا کہ اس فوج کی رہنمائی وہی انگریز افسر کر رہا ہے جو یہاں سے زخمی ہو کر بھاگا تھا۔اس نے سردار اکبر خان کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر تم انگریز افسروں کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کر دو تو بہتر ورنہ تمہارے مکان کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا جائے گا۔

لڑائی شروع ہو گئی۔انگریزوں نے تین بار حویلی پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار انہیں ہماری گولیوں کی بارش میں پیچھا ہٹنا پڑا۔

اگلے دن ان کی دو توپیں پہنچ گئیں اور انہوں نے گاؤں پر گولہ باری شروع کر دی۔تیسری پہر تک گاؤں ملبے کا ایک ڈھیر بن چکا تھا۔اکبر خاں کے تین چچا زاد اور دو ماموں زاد بھائی مارے جا چکے تھے۔ان کی والدہ جو خاندان کی دوسری عورتوں کے ساتھ جانے کی بجائے اپنے بیٹے کے ساتھ رہنے پر مصر تھیں۔زخمیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہو گئیں۔اکبر خاں کی حویلی کے محافظوں کو باہر سے دشمن محاصرے میں لیے ہئے تھا اور حویلی کے اندر وہ بڑی تیزی سے آگ کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔چند گھوڑے حویلی کے اندر بندھے ہوئے تھے لیکن سردار کے ساتھیوں کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔اس نے ہم میں سے بہترین نیزہ بازوں کو گھوڑوں پر سوار ہو جانے کا حکم دیا۔اس کے بعد حویلی کا دروازہ کھولا گیا۔اور سردار نے سواروں کے ساتھ نکل کر گاؤں کے جنوب کی طرف دشمن کی صفوں پر حملہ کر دیا۔اس کے پیچھے باقی آدمی بھی نکل آئے۔دشمن کی گولیوں سے چار سوار شہید ہو گئے۔اکبر خاں کے

گھوڑے کو گولی لگی اور وہ گر پڑا۔ میرے ساتھ پندرہ آدمیوں نے مڑ کر اسے بچانے کی کوشش کی لیکن وہ بیہوش پڑا ہوا تھا۔ ہم نے اکبر خاں کو اس حال میں چھوڑ کر بھاگنا گوارا نہ کیا اور اپنے ہتھیار پھینک دیئے۔ دشمن نے ہمیں گرفتار کرلیا۔ باقی آدمیوں میں سے چند زخمی اور شہید ہو گئے اور باقی لڑتے بھڑتے نکل گئے۔ اکبر کاں کو تھوڑی دیر بعد ہوش آ گیا اور انگریز افسر نے اس سے کہا کہ اگر تم اپنے قبیلے کے تمام آدمویں کو یہاں جمع کر کے ہماری وفا داری کا یقین دلاؤ اور ان لوگوں کو ہمارے حوالے کر دو جنہوں نے دو انگریز افسروں کو ہلاک کر دیا تھا تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا ۔ورنہ کل تمہیں پھانسی دے دی جائے گی ۔ اکبر خاں نے جواب دیا۔ تم مجھے قتل کر سکتے ہو لیکن ذلیل نہیں بنا سکتے ۔ میں نے انگریز افسر سے کہا۔ اگر آپ مجھے چھوڑ دیں تو میں کل تک اس علاقے کے تمام چیدہ چیدہ آدمیوں کو یہاں حاضر کرنے ذمہ لیتا ہوں ۔اور میں اس بات کا ذمہ بھی لیتا ہوں کہ انگریز افسرون کے قاتلوں کو آپ کے حوالہ کر دی جائے گا۔ انہوں نے مجھے رہا کرتے وقت یہ دھمکی دی کہ اگر تم نے وعدہ خلافی کی تو اکبر خاں کے ساتھ تمہارے باقی ساتھیوں کو بھی پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ اکبر خاں نے مجھے غداری اور بزدلی کے طعنے دیے۔ کاش میں اس کے کان میں اتنا کہہ سکتا کہ میں یہ سب کچھ تمہارے لیے کر رہا ہوں۔

آپ کی آمد سے پہلے میں رات کے وقت دشمن کے پڑاو پر حملہ کرنے کا ارادہ کر چکا تھا اور کوئی تین سو آدمی میرا ساتھ دینے کے لیے آمادہ بھی ہو گئے تھے لیکن ہمیں اپنی کامیابی بے حد مکدوش نظر آتی تھی، اب مجھے یقین ہے کہ قدرت نے آپ کو بلاوجہ نہیں بھیجا ہے آپ کی آمد سے پہلے جب میں نے ان سے درخواست کی تھی تو ان میں سے بہت سے لوگ یہ کہتے تھے کہ ہم اپنی عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر کہاں

جایوں لیکن اب ان کی عورتیں اور بچے بھی آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔

ایک کمسن بچے نے معظم علی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔

معظم علی نے اسے اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ''بیٹا تمہارا نام کیا ہے؟

پیچھے سے بلقیس کی آواز آئی۔ شہباز یہ تمہارے چچا جان ہیں

O

اودھ کے سپاہی اور ان کے انگریز ساتھی رات کے دو بجے پہریداروں کی چیخ و پکار بندوقوں کی آوازیں اور حملہ آوروں کے نعرے سن کر بیدار ہوئے۔ آن کی آن میں پڑاؤ کے اندر افراتفری پھیل گئی۔ حملہ آور تین اطراف سے پڑاؤ میں داخل ہو کر قتل عام شروع کر چکے تھے۔ تاریکی میں اودھ کے سپاہی یہ محسوس کر رہے تھے کہ رو ہیلکھنڈ کی ساری آبادی ان کے پڑاؤ پر حملہ کر چکی ہے۔ افسروں میں سے کوئی صفیں درست کرنے اور کوئی اپنے سپاہیوں کو بھاگنے کا حکم دے رہا تھا۔ سراسیمگی کی حالت میں اودھ کے کئی سپاہی اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ انہیں جنوب مشرق کے سوا ہر سمت حملہ آوروں کا سیلاب نظر آ رہا تھا۔ بیشتر سپاہی بھاگ نکلے۔

تھوڑی دیر میں جنوب مشرق کی طرف ایک عام پسپائی شروع ہو چکی تھی لیکن کوئی دو فرلانگ دور، بھاگنے والوں کو کھیتوں کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ کا سامنا کرنا پڑا اور وہ الٹے پاؤں پیچھے ہٹے، اس کے ساتھ ہی قریباً دو سو آدمیوں نے جو تلواروں اور نیزوں سے مسلح تھے، کھیت سے نکل کر ان پر ہلہ بول دیا۔ بعض سپاہیوں نے عقب کے ٹیلے کی طرف سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن حملہ آور ٹیلے کے نشیب پر بھی قابض ہو چکے تھے۔

اکبر خاں اور اس کے ساتھی قید کی حالت میں پڑاؤ کے درمیان انگریز سپاہیون کے خیموں سے کچھ دور پڑے ہوئے تھے اور اودھ کے جو سپاہی ان کی حفاظت پر متعین تھے انتہائی اضطراب کی حالت میں ان سے پوچھ رہے تھے۔ یہ کون ہیں۔ یہ کہاں سے آئے ہیں۔ یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟

اکبر خاں نے جوبا دیا۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تھوڑی دیر بعد تمہیں یہ معلوم نہیں رہے گا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔

اودھ کی فوج کا ایک افسر بھاگتا ہوا آیا اور اس نے پہریداروں سے پوچھا۔ قیدی کہاں ہیں۔

قیدی یہیں ہیں۔ ایک پہریدار نے جواب دیا۔ ان کے متعلق آپ کا کیا حکم ہے؟

افسر جواب دینے کی بجائے آگے بڑھا اور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر قیدیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ سردار اکبر خاں! اس حملے کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ ہمارے سالار اور انگریز افسروں نے تمہیں فوراً قتل کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

لیکن اگر تم یہ قتل عام بند کرانے کا وعدہ کرو تو میں تمہیں آزاد کرنے کے لیے تیار ہوں۔

اکبر خاں نے جواب دیا۔ میں تمہارے ساتھ کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔

افسر نے جلدی سے اپنا خنجر نکال کر اکبر خاں کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کاٹتے ہوئے کہا مجھے ایک بہادر دشمن سے کوئی وعدہ لینے کی ضرورت نہیں۔ پھر اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا۔ ان سب قیدیوں کو آزاد کر دو جلدی کرو!

سپاہیوں نے قیدیوں کی رسیاں کاٹنی شروع کر دیں۔

اکبر خاں نے اٹھتے ہوئے کہا۔تم اپنے ہتھیار ہمارے حوالہ کر دو اور اسی جگہ بیٹھے رہو۔

نوجوان افسر نے کہا۔اگر آپ یہ وعدہ کریں کہ آپ اودھ کے سپاہیوں کو امان دیں گے تو ہم اپنے ہتھیار آپ کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں۔

اکبر خاں نے جواب دیا۔میں لڑائی ختم ہونے سے پہلے کوئی وعدہ نہیں کرتا۔

افسر نے اپنی تلوار نکال کر اکبر خاں کو پیش کر دی اور باقی پہریداروں نے بھی اپنے اپنے ہتھیار قیدیوں کے سامنے پھینک دیئے۔

قیدی ابھی تلواریں اور بندوقیں اٹھا رہے تھے کہ ایک طرف سے آواز آئی قیدی کہاں ہیں؟

قیدی یہاں ہیں۔اکبر خاں نے جواب دیا۔

نوجوان افسر نے دبی زبان میں کہا۔یہ ہمارے کماندار ہیں۔

کماندار پانچ اور سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھا اور اس نے کہا۔اکبر خاں کے سوا باقی تمام قیدیوں کو رہا کر دو اور ان سے کہو کہ اگر دس منٹ کے اندر اندر انہوں نے حملہ آوروں کو واپس جانے پر آمادہ نہ کیا تو اکبر خاں کی گردن مار دی جائے گی۔

اکبر خاں نے اچانک بڑھ کر حملہ کیا اور کماندار ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔کماندار کے ساتھیوں نے ابھی اپنی بدحواسی پر قابو نہیں پایا تھا کہ اکبر خاں نے دوسرے وار میں ایک اور آدمی کو مار گرایا۔باقی قیدی دوسرے آدمیوں پر ٹوٹ پڑے اور آن کی آن میں انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔اس عرصہ میں پڑاؤ پر حملہ آوروں کا گھیرا بہت تنگ ہو چکا تھا تاہم وہ تاریکی میں غیر ضروری نقصان سے بچنے

کے لیے دشمن کے ساتھ گتھم گتھا ہونے کی بجائے اکا دکا حملوں پا اکتفا کر رہے تھے حملہ آوروں کی ایک ٹولی ایک شدید حملے کے بعد انگریزوں کے خیموں کے قریب پہنچ چکی تھی۔

اکبر خاں اس افسر کی طرف متوجہ ہوا جس نے قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا تھا۔اس نے کہا۔اب تم ہمارے ساتھی ہو۔میں ایک افسر کو اس کے اپنے سپاہیوں کے خلاف لڑنے کے لیے نہیں کہوں گا لیکن تم انہیں ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دے کر بہت سے آدمیوں کی جانیں بچا سکتے ہو۔

افسر بھاگ کر آگے بڑھا اور چاروں طرف سے سمٹی ہوئی فوج کے درمیان کھڑا ہو کر بلند آواز میں چلانے لا۔کماندار مارا گیا،دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے ہتھیار ڈال دو۔

تھوڑی دیر میں اودھ کے سپاہی اس کا یہ پیغام ایک سرے سے لے کر دوسرے سے تک پہنچا چکے تھے۔انگریز سپاہیوں کے خیموں کے آس پاس ابھی تک شدید لڑائی ہو رہی تھی۔اکبر خاں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس طرف بڑھا اور اس نے پیچھے ہٹنے والے سپاہیوں پر عقب سے حملہ کر دیا۔چند آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ اپنا راستہ صاف کرتا ہوا حملہ آوروں سے جا ملا اور بلند آواز میں چلایا۔

میں اکبر ہوں!۔

اکبر خاں کے ایک رشتہ دار نے آگے بڑھ کر کہا۔اکبر خاں تم کہاں تھے؟ ہم تمہیں سارے پڑاؤ میں تلاش کر چکے ہیں۔

اکبر خاں نے کہا۔تمہارے کسی سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ جاننا چاہتا

ہوں کہ اس حملے کی رہنمائی کون کر رہا ہے۔

کوئی تاریکی میں آگے بڑھا اور اکبر خاں سے لپٹ کر بولا۔ بھلا بتاؤ میں کون ہوں؟

اکبر خاں نے کہا۔ اگر آپ معظم علی ہیں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں اپنی زندگی بھیانک رات میں ایک اور عجیب سپنا دیکھ رہا ہوں۔

لڑائی قریباً ختم ہو چکی تھی اور بقیۃ السیف سپاہی جگہ جگہ ہتھیار پھینک کر امان طلب کر رہے تھے۔ معظم علی نے تمام قیدیوں کی ایک جگہ جمع کرنے اور مشعلیں جلانے کا حکم دیا حملہ آوروں کے بیس آدمی زخمی اور ساتھ ہلاک ہوئے تھے۔ اس کے مقابلے میں اودھ کی فوج کے اسی آدمی ہلاک اور کوئی ڈیڑھ سو زخمی ہو چکے تھے اودھ کی یہ فوج پانچ سو سپاہیوں پر مشتمل تھی ہلاک ہونے والوں کے علاوہ ان تیس چالیس آدمیوں کے سوا جو تاریکی میں موقع پا کر ادھر اُدھر بھاگ گئے تھے۔ اور باقی دس انگریز جن میں وہ لیفٹیننٹ بھی تھا جو اپنے دو ساتھیوں کی موت پر اس گاؤں کو سزا دینے کی نیت سے آیا تھا، قید ہو چکے تھے۔

معظم علی نے اکبر خاں سے کہا۔ یہاں میرے حصے کا کام ختم ہو چکا ہے موجودہ حالات میں تمہارے قبیلے کے لوگ یہاں نہیں رہ سکتے۔ ہمیں بہت جلد یہاں سے دور نکل جانا چاہیئے۔ ان قیدیوں کے متعلق فیصلہ کرنا اب تمہارا یا تمہارے قبیلے کے لوگوں کا کام ہے۔

اکبر خاں نے کہا۔ اودھ کے سپاہیوں کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ انگریز میرے حوالے کر دیئے جائیں۔

تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟

یہ میں بعد میں بتاؤں گا اور آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ ان کے متعلق کوئی سفارش نہ کریں۔

معظم علی نے جواب دیا۔ اگر میں انہیں جنگی قیدی سمجھتا تو یقیناً ان کے ساتھ اسی سلوک کا مطالبہ کرتا جو جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے لیکن میں ان بھیڑیوں کو انسان سمجھنے کی غلطی نہیں کروں گا تمہیں ان پر مکمل اختیار ہے۔

اکبر خاں کے حکم سے اس کے آدمیوں نے لیفٹیننٹ اور اس کے ساتھ دوسرے انگریزوں کو پکڑ کر باقی قیدیوں سے الگ کرلیا پھر چند آدمیوں نے خیموں کے رسے کاٹ کر ان کی گردنوں میں ڈال دیے۔ اکبر خاں کے ساتھ چند آدمی انگریزوں کو گھیرے میں لے کر گاؤں کی طرف روانہ ہوگئے۔

انگریز لیفٹیننٹ چلایا۔ ہماری فوج جلد یہاں آئے گی اور اگر تم نے ہمارے ساتھ زیادتی کی تو وہ تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

ایک نوجوان نے بڑھ کر تلوار کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی اور وہ خاموش ہو گیا۔ اکبر اکبر خاں نے کہا۔ ہمیں معلوم ہے کہ تمہاری فوج ضرور آئے گی لیکن وہ صرف ہماری بے بسی کا تماشا ہی نہیں دیکھے گی۔

دوسرا انگریز بولا۔ سردار صاحب! اگر آپ ہمیں چھوڑ دیں تو ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ انگریز اس علاقے پر کوئی زیادتی نہیں کریں گے۔

اکبر خاں نے جواب دیا۔ میں تم لوگوں کے وعدوں کی حقیقت سے واقف ہوں لیفٹیننٹ نے چند قدم اور چلنے کے بعد کہا۔ آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟

اکبر خاں نے جواب دیا۔ میں حیران ہوں کہ تم اب بھی یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہو۔

کوئی آدھ گھنٹہ بعد اکبر خاں کے مکان کے سامنے آم کے ایک درخت کی مضبوط شاخوں کے ساتھ دس آدمیوں کی لاشیں لٹک رہی تھیں اور وہ دروازے کے سامنے کھڑا اس آگ کے انگاروں کو دیکھ رہا تھا جو اس کی زندگی کی بیشتر راحتوں اور مسرتوں کو بھسم کر چکے تھے۔

ایک طرف سے حویلی کی دیوار توپوں کی گولہ باری کے باعث ٹوٹی ہوئی تھی اکبر خاں اور اس کے ساتھی اس کی طرف سے اندر داخل ہوئے۔ صحن میں جگہ جگہ لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اکبر خاں کے ساتھی لاشیں اٹھا کر باہر نکل آئے اور وہ کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا اس کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں ملبے کے ڈھیر سے اب تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کمرے میں اس کی ماں کا لاش دفن تھی۔

اکبر خاں! اکبر خاں! اس کے کسی ساتھی نے آواز دی اور وہ حویلی سے باہر نکل آیا۔

جب صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے تو روہیلے پڑاؤ میں اپنے ساتھیوں کا لاشیں دفن کرنے میں مصروف تھے اودھ کی فوج کا نوجوان افسر جس نے رات اکبر خاں کو قید سے آزاد کیا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر بولا۔ آپ نے ہمارے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟ میں یہ اس لیے نہیں پوچھتا کہ مجھے اپنی زندگی بہت عزیز ہے۔ میں اس دن مر چکا تھا جب میراں پور کٹرہ کے میدان میں میری تلوار ایک بے گناہ مسلمان کے خوں میں آلودہ ہوئی تھی ضمیر کی موت کے بعد جسم کی موت کوئی حقیقت نہیں رکھتی لیکن ان لوگوں میں اکثر ایسے ہیں جنہیں شاید یہ بھی معلم نہ ہو کہ اس **ملک** کے مسلمانوں کے لیے روہیلکھنڈ کے حریت پسندوں کی تباہی کیا نتائج پیدا کرے گی۔ یہ لوگ جنگ میں اس لیے شریک ہوئے تھے کہ اودھ میں پیدا ہوئے تھے اور اودھ کی

فوج میں ملازم تھے۔ اگر یہ روہیلکھنڈ میں پیدا ہوئے تھے تو یہ حافظ رحمت خاں کی طرف سے لڑتے۔ میں نیکی بدی کا شعور رکھتا تھا لیکن میرا ضمیر شاید اس لیے مر چکا ہے کہ میں ایک بے ضمیر حکمران کے ساتھ اپنی زندگی وابستہ کر چکا ہوں۔ تاہم میری سزا ان لوگوں کی نسبت زیادہ ہونی چاہیے۔

اکبر خاں نے معظم علی کی طرف دیکھا اور معظم علی نے نوجوان کی طرف چند ثانیے غور سے دیکھنے کے بعد پوچھا۔ تمہارا نام کیا ہے۔

نوجوان نے جواب دیا۔ میرا نام عبداللہ ہے۔

معظم علی نے کہا۔ پانی پت کی جنگ میں اودھ کی فوج کا ایک سالار ہمارے ساتھ تھا۔ اس کی شکل بالکل تم جیسی تھی۔ شاید اس کا نام محمد عمر تھا۔ جب ہم دشمن کا تعاقب کر رہے تھے تو وہ ہمارے ساتھ تھا اور اس نے بڑی بہادری سے جان دی تھی۔

عبداللہ نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ وہ میرا باپ تھا۔

اکبر خاں نے معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے مجھے اپنی فوج کے کماندار کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچایا تھا۔

معظم علی نے کہا۔ عبداللہ! اگر تم محمد عمر کے بیٹے ہو تو مجھے اپنا دوست سمجھو۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کم از کم دو دن ان سپاہیوں کو اسی علاقے میں ٹھہرانے کی کوشش کرو۔ اس عرصہ میں ہماری عورتوں اور بچوں کو یہاں سے نکلنے کا موقع مل جائے گا اس کے بعد تم لکھنو یہ خبر بھیج سکتے ہو کہ اس علاقے کی بستیاں خالی ہو چکی ہیں۔

عبداللہ نے جواب دیا مجھے لکھنو اطلاع بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑے گی میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ میں واپس نہیں جاؤں گا لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارے جو آدمی

رات کے وقت بھاگ نکلے ہیں ان میں سے بعض لکھنو ضرور پہنچ جائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض لکھنو کا رخ کرنے کی بجائے میراں پور کٹرہ کے پڑاؤ میں پہنچ جائیں گے اور وہاں سے فوج کے چند دستے اس طرف روانہ ہو جائیں گ۔

اس صورت میں بھی تمہارے لیے ان کی توجہ اور طرف مبذ دل کرنا مشکل نہ ہو گا۔ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں یہاں سے زخمیوں،عورتوں اور بچوں کو نکالنے کے لیے دو دن مل جائیں۔

عبداللہ نے کہا۔ میں یہ کوشش کروں گا کہ آپ کو دو دن کی بجائے دو ہفتے مل جائیں لیکن اس کے بعد میری منزل لکھنو نہیں ہو گی۔شاید میرے کئی اور ساتھی بھی لکھنو جانا پسند نہ کریں۔

معظم علی نے کہا۔ میں ان سب کو سرنگا پٹم آنے کی دعوت دیتا ہوں۔میرا نام معظم علی ہے اور تم مجھے سرنگا پٹم میں آسانی سے تلاش کر سکو گے۔اکبر خاں! تم گھوڑے تیار کراؤ، اور ان کا تمام اسلحہ اپنے ساتھیوں میں بانٹ دو۔صرف عبداللہ کے ہتھیار اور گھوڑا اسے واپس دے دو۔

عبداللہ نے کہا۔نہیں، اس وقت آپ کو چیزوں کی زیادہ ضرورت ہے۔

بہت اچھا! لیکن جانے سے پہلے میں تمہارے ساتھیوں سے چند باتیں کہنا چاہتا ہوں معظم علی یہ کہہ کر قیدیوں کی طرف بڑھا اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولا،تم کسی رحم کے مستحق نہیں ہو۔تمہارے ہاتھ ان بے گناہوں کے خون سے رنگین ہیں جن کا گناہ صرف یہ تھی کہ ان کے پاس اودھ کے سفک بے حس اور عیاش حکمران کے خزانے بھرنے کے لیے روپیہ نہ تھا۔تمہارے حکمران نے روہیلکھنڈ کے حریت پسندوں کا گلا گھونٹنے کے لیے چالیس لاکھ روپے کے عوض انگریزوں کی خدمات

حاصل کی تھیں لیکن تمہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انگریز یہاں اس لیے نہیں آئے تھے کہ وہ تمہارے یا اودھ کے حکمران کے دوست تھے۔نواب شجاع الدوالہ نے انہیں ولی کی طرف چند اور منزلیں طے کرنے کا موقع دیا ہے اور انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر مرہٹے یا تمہارا کوئی ورد شمن اودھ کے مسلمانوں کو تباہ ربرباد کرنے کے لیے انہی انگریزوں کو چالیس لاکھ سے زیادہ روپیہ پیش کر دے تو تمہارا کیا انجام ہو گا؟ شجاع الدولہ کا خیال ہے کہ اس نے انگریزوں کی اعانت سے اپنی سلطنت کی حدود وسیع کر لی ہیں لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ وہ تباہی اور بربادی کی سیلاب کو بنگال سے لکھنوتک لے آیا ہے روہیلکھنڈ شمالی ہندوستان کا ایک مضبوط ترین قلعہ تھا اور اودھ کے حکمران نے یہ قلعہ توڑ کران بیرونی حملہ آوروں کا راستہ صاف کر دیا ہے جو مغلوں کی سلطنت کے کھنڈروں پا اپنے اقتدار کی عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔کاش تم سب انگریز ہوتے اور ہم ضمیر کی ملامت محسوس کیے بغیر تم سب کو اسی درخت سے لٹکا کر پھانسی دے سکتے جہاں تمہارے انگریز سر پرستوں کی لاشیں لٹک رہی ہیں لیکن یہ لوگ جن کے گھر تم نے راکھ کے ڈھیر بنا دیئے ہیں، انتہائی غم وغصہ کی حالت میں بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ تم مسلمان ہو۔تم نے چند ٹکوں کے لیے ان کی عزت اور آزادی پر حملہ کرتے وقت یہ نہیں سوچا کہ جو لوگ تمہارے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں وہ مسلمان ماؤں کے بیٹے، مسلمان بیویوں کے شوہر، مسلمان بہنوں کے بھائی اور مسلمان بچوں کے باپ ہیں۔تمہارے دشمن یہ لوگ نہیں جنہوں نے پانی پت کے میدان میں اپنی جانوں پر کھیل کر تمہیں مرہٹوں کی غلامی سے بچایا تاھ۔ بلکہ دشمن وہ کوتا اندیش اور ملت فروش حکمران ہے جو انگریزوں کے ساتھ تمہارے اور تمہارے بعد آنے والی نسلوں کی

عزت اور آزادی کا سودا کر چکا ہے ہم سب جانتے کہ روہیلکھنڈ میں قیامت آچکی ہے لیکن میں تمہیں اس دن کا سے خبردار کرتا ہوں جب تم اس سے بدتر قیامت کے اثرات لکھنو کی گلیوں میں دیکھو گے۔

تم آزاد ہو اور تمہیں اس لیے آزاد کیا جاتا ہے کہ ہم تمہیں اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق سوچنے کا موقع دینا چاہتے ہیں ہم تمہیں اس ابت کا مقع دینا چاہتے ہیں کہ تم ان ملت فروشوں سے نجات حاصل کر سکو۔ جنہوں نے ان بازوؤں کو کاٹا ہے جو خطرے کے وقت تمہاری مدافعت کے لیے اٹھ سکتے تھے اور ان گھروں کو جلایا ہے جو تمہارے دفاعی حصار بن سکتے تھے،

جنگ ختم ہوتے ہی ایک جنگل میں چھپے ہوئے لوگوں کو فتح کی خوشخبری دینے کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ اکبر خاں اور اس کے ساتھی وہاں پہنچے تو چار ہزار عورتیں، بچے اور بوڑھے جنگل سے باہر نکل کر ان کی راہ دیکھ رہے تھے بلقیس نے اپنے شوہر کو دیکھا تو اس کی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں ننھا شہباز خاں! ابا جان ابا جان کہتا ہوا آگے بڑھا۔ اکبر خاں نے گھوڑے سے اتر کر اسے گلے سے لگا لیا۔ پھر اس نے بلقیس کے قریب جا کر سوال کیا۔ تنویر کہا ہے؟

بلقیس اس کے جواب میں ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ ایک نوجوان لڑکی نے آگے بڑھ کر کہا۔ تنویر میرے پاس ہے۔

اکبر خاں نے شہباز کو نیچے اتار کر تنویر کو اٹھا لیا۔

معظم علی اپنا گھوڑا ایک آدمی کے حوالے کرنے کے بعد آگے بڑھا اور اس نے اکبر خاں کے قریب آ کر کہا۔ اب سوچنے یا باتیں کرنے کا وقت نہیں۔ ہمیں فوراً یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے، آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ ان کا کیا ارادہ ہے؟

اکبر خاں نے کہا۔میرا خیال تھا کہ ہمارے پیدل آنے والے ساتھی بھی یہاں پہنچ جائیں تو سب کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا جائے۔

معظم علی نے کہا تو یہ بہتر ہوگا کہ ہم جنگل میں ان کا انتظار کریں۔

بہت اچھا! اکبر خاں یہ کہہ کر قبیلے کے لگوں سے مکاطب ہوا آپ سب جنگل میں اسی جگہ واپس پہنچ جائیں ہمارے باقی آدمی پیدل آرہے ہیں اور وہ ابھی پہنچ جائیں گے۔

تھوڑی دیر بعد قبیلے کے لوگ جنگل میں بیٹھے اکبر خاں کی تقریر سن رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا:۔

بھائیو اور بہنو! میں اب تمہیں یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ اس وقت ہم کتنی بڑی تباہی کا سامنا کرر ہے ہیں۔میراں پور کٹرہ کی جنگ میں ہماری قوم کا بہترین خون بہ چکا ہے۔ ہماری تلواریں ٹوٹ چکی ہیں اور اب ہمارے پاس آنسوؤں اور آہوں کے سوا کچھ نہیں رہا۔کاش الفاظ ان بہنوں اور ماؤں کی تسلی کے لیے کافی ہوتے جن کے بھائی شوہر اور بیٹے اپنے وطن کی حفاظت پر قربان ہو چکے ہیں۔کاش الفاظ ان بھیڑیوں کی خصلت بدل سکتے جنہیں انسانوں کے خون کی پیاس روہیلکھنڈ میں لے آئی ہے۔اب ہمارے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا کہ اس وطن سے نکل جائیں جس کا ی خاک میں ہمارے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا کہ اس وطن سے نکل جائیں جس کی خاک میں ہمارے لیے اسلاف کی ہڈیاں دفن ہیں یہاں اب انسانوں کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی ہے۔نہ معلوم اب روہیلکھنڈ کی کتنی بستیوں میں میری بستی کی داستان دہرائی جائے گی۔اگر صرف میری ذات کے لیے خطرہ ہوتا تو میں یہاں سے ہجرت کرنا گوارا نہ کرتا لیکن

میرے سامنے پورے قبیلے کا مسئلہ ہے میرے سامنے ان یتیم بچوں اور بیوہ ماؤں اور بہنوں کا مسئلہ ہے جن کے باپ اور شوہر جنگ میں شہید ہو چکے ہیں۔ انہیں اس ملک میں سر چھپانے کے لیے کسی جائے پناہ کی ضرورت ہے۔ میرے بزرگ بھائی معظم علی خاں کو اصرار ہے کہ ہم ان کے ساتھ میسور چلے جائیں لیکن جو کچھ میسور کے متعلق میں جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا قلعہ ہے جہاں بہترین سپاہیوں کی ضرورت ہے، حیدر علی کے متعلق میں نے سنا ہے کہ وہ ایک فیاض حکمران ہے لیکن انگریزوں اور مرہٹوں کے خلاف اس کے جنگ کے نتائج کے متعلق کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ ان بے سہارا عورتوں اور بچوں کے لیے میسور ایک اور روہیلکھنڈ بن جائے۔ بھائی معظم علی مجھ سے ناراض ہوں گے لیکن سر دست میرا یہی فیصلہ ہے کہ ہم میسور کی بجائے حیدر آباد جائیں اور وہاں کسی ایسی جگہ آباد ہونے کے امکانات کا جائزہ لیں جہاں ہمیں قابل کاشت زمین مل سکتی ہو۔ قبیلے کے بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ہم یہاں سے دلی، لاہور یا پشاور کا رُخ کریں۔ شمال کی طرف کہیں دور نکل جانا ہمارے لیے یقیناً بہتر ہو گا لیکن کاش مجھے اس بات کا اطمینان ہوتا کہ وہاں کسی علاقے کی حکومت اتنے لوگوں کو سہارا دینے کے لیے تیار ہو گی۔ میری اپنی رائے سر دست یہی ہے کہ ہم حیدر آباد جائیں۔ تاہم میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ متفقہ طور پر کوئی فیصلہ کیا جائے۔

معظم علی پریشانی اور اضطراب کی حالت میں اکبر خاں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب وہ تقریر کر کے بیٹھ گیا تو معظم نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے دبی زبان میں کہا اکبر خاں میرا خیال تھا کہ آپ میسور جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

اکبر خاں نے جواب دیا۔ میں اس موضوع پر آپ کے ساتھ علیحدگی میں بات کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ میں آپ کی ناراضگی دور کرسکوں گا۔

دوسری بستیوں کے چھوٹے چھوٹے سردار اور قبیلے کے عمر رسیدہ لوگ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے پر بحث کر رہے تھے۔ بعض لوگ اکبر خاں کا ساتھ دینے پر آمادہ تھے۔ لیکن بعض انتہائی شدومد کے ساتھ شمال کی طرف ہجرت کرنے کی حمایت کررہے تھے۔ اکبر خاں کا ایک خالہ زاد بھائی منور خاں جو قبیلے میں اکبر خاں کے بعد سب سے زیادہ اثر ورسوخ کا مالک تھا، یہ کہہ رہا تھا کہ اس ملک کی کسی ریاست میں ہمارے لیے عزت اور آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے امکانات ختم ہو چکے ہیں۔ میرا یہی مشورہ ہے کہ ہم اٹک کے پار کوئی جائے پناہ تلاش کریں۔ یہ نااہل، بدطینت اور سفاک حکمران اس ملک کے لیے ایک لعنت ہیں اور میرے نزدیک اودھ، حیدرآباد اور میسور میں کوئی فرق نہیں۔ اگر ہمارے مقدر میں صرف ذلت اور رسوائی ہے تو ہم یہیں رہ کر اودھ کی غلامی کیوں نہ قبول کرلیں۔ آپ یہ کہیں گے کہ یہاں آزادی سے محروم ہونے کے بعد ہماری بقا کو بھی خطرہ ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کسی اور حکمران کی غلامی ہماری بقا کے لیے خطرناک ہوگی،۔

قبیلے کے ایک اور بااثر آدمی نے اٹھ کر کہا۔ بھائیو! میری یہی رائے ہے کہ ہم شمال کا رخ کریں لیکن موجودہ حالات میں آپ سے ہر شخص اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہے جو لوگ میرے بھائی اکبر خاں کا ساتھ دینا چاہیں ہم انہیں نہیں روکیں گے اور مجھے امید ہے کہ اکبر خاں کے طرفدار بھی ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

یہ بحث ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی۔ بالآخر معظم علی اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے

کہا۔ بھائیو! میں آپ کو میسور آنے کی دعوت دے چکا ہوں لیکن اکبر خاں کے لیے میرا مشورہ قابل قبول نہیں ۔ اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ وقت ضائع نہ کریں اور جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچ جائیں ۔

اکبر خاں نے کہا۔ میرا خیال ہے کہ اب بحث کو طول دینے سے کوئی فائدہ نہیں جو لوگ شمال کی طرف جانا چاہتے ہیں، میں انہیں روکنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں ان کے لیے دعا کروں گا کہ خدا ان کا حامی و ناصر ہو لیکن میری پہلی ذمہ داری ان بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی پرورش ہے جو اب بے سہارا ہو چکے ہیں اور مجھے یہ اعتماد ہے کہ میں ان کے لیے حیدر آباد پہنچ کر بہت کچھ کر سکتا ہوں ۔ اگر وہاں کے حالات اطمینان بخش نہ ہوئے تو میری دوسری منزل میسور ہو گی ۔ بہر حال اگر مجھے معلوم ہوا کہ میرے وہ بھائی جو دوسری طرف جانا چاہتے ہیں کوئی تسلی بخش جائے پناہ تلاش کر چکے ہیں تو ہم بھی شاید کسی دن وہاں پہنچ جائیں ۔ ۔منور خاں! تم تیاری کرو اب باتوں کے لیے وقت نہیں میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم یہیں سے اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں۔

تھوڑی دیر بعد منور خاں اور اکبر خاں کی قیادت میں دو قافلے مختلف سمتوں کو روانہ ہو رہے تھے ۔ ایک کا رخ شمال مغرب کی طرف تھا اور دوسرے کی منزل مقصود حیدر آباد تھی ۔ اکبر خاں کے ساتھ بارہ سو افراد تھے ۔جن میں سے نصف سے زیادہ لاوارث بچے اور بیوہ عورتیں تھیں بلقیس اپنی بچی تنویر کو گود میں لیے ایک گھوڑے پر سوار تھی اور شہباز دوسرے گھوڑے پر اکبر خاں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ معظم علی اور اس کے ساتھی قافلے کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں مسلح آدمیوں کو ہدایات دے رہے تھے۔

کوئی دو کوس چلنے کے بعد اکبر خاں نے اپنا گھوڑا معظم علی کے قریب لے جا کر کہا۔ بھائی جان آپ مجھ سے خفا ہیں؟ اگر آپ کا حکم ہے تو میں حیدر آباد کی بجائے میسور جانے کو تیار ہوں۔

نہیں! معظم علی نے جواب دیا۔ میں اب تمہیں میسور جانے کے متعلق نہیں کہوں گا۔

اکبر خاں نے کہا۔ حیدر آباد جانے کے متعلق میرا فیصلہ بلا وجہ نہیں شیخ فخر الدین اور مرزا طاہر بیگ کو ایک مدت سے یہ اصرار تھا کہ میں اپنے خاندان سمیت روہیلکھنڈ چھوڑ کر حیدر آباد میں آباد ہو جاؤں۔ جن دنوں مرہٹوں نے ہمارے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کی تھی۔ حیدر آباد سے شیخ فخر الدین اور ادھونی سے طاہر بیگ کے ایلچی میرے پاس آئے تھے۔ انہوں نے یہ پیغام بھیجے تھے کہ اب روہیلکھنڈ کی بجائے نظام کی سلطنت بہت زیادہ محفوظ ہے۔ اس لیے جب تک ملک کے حالات ٹھیک نہیں ہوتے یہاں آ جاؤ میں نے انہیں یہ جواب دیا تھا کہ میں اپنے قبیلے کر سردار ہوں اور میرا مرنا اور جینا ان کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد مجھے شیخ فخر الدین کا ایک اور خط ملا۔ انہوں نے یہ لکھا تھا کہ اگر تم چاہو تو حیدر آباد یا ادھونی میں تمہارے تمام قبیلے کو آباد کرنے کا انتظام کیا جا سکتا ہے اور میں نے اسے ایک مذاق سمجھا تھا۔ اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے حیدر آباد یا ادھونی کے آس پاس اتنی زمین مل جائے جس میں یہ بے سہارا لوگ امن وچین کے دین گزار سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی بدولت مجھے ایسی جگہ میسور میں بھی مل سکتی ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میسور کا مستقبل حیدر آباد کی نسبت کہیں زیادہ مخدوش ہے۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ میسور کا حکمران حیدر آباد کی نسبت کہیں زیادہ بیدار

مغز، دور اندیش اور بہادر ہے اور اس کے سامنے ایسے مقاصد ہیں جن کے لیے تلوار اٹھانا ایک نیکی ہے لیکن بھائی جان! اگر آپ خفا نہ ہوں تو میں یہ کہوں گا کہ اب میں کسی حکمران کو بھی قابل اعتماد نہیں سمجھتا۔ اب انسانیت سے میرا اعتماد اٹھ چکا ہے حکمرانوں کی قبت اندیشی، نیکی اور شرافت میرے لیے ایک سراب ہے اور شرافت کے لیے ایک سراب ہے اور مجھ میں اس سراب کے پیچھے دوڑنے کی ہمت نہیں رہی۔ آپ بنگال کی آزادی کے محافظ بن کر میدان میں نکلے تھے لیکن آپ کو کیا حاصل ہوا؟ اور جب میں پانی پت کے میدان میں لڑ رہا تھا تو میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اس جنگ کے بعد روہیلہ سپاہیوں کو اودھ دلی اور حیدر آباد کے امراء اپنا محسن خیال کریں گے لیکن ہماری تباہی و بربادی کا تماشا دیکھا ہے۔ میں ان لوگوں کے لیے ایثار و خلوص کے ہر جذبہ سے محروم ہو چکا ہوں جن کی بے حسی کے باعث ہماری بستیاں راکھ کے ڈھیر بن گئی ہیں۔

آپ میرے محسن ہیں آپ نے میری مدد کی ہے اور آپ کے لیے میں اپنے جسم کی بوٹیاں نچوانے کے لیے تیار ہوں لیکن آج سے میں یہ عہد کر چکا ہوں کہ میری تلوار کسی حکمران کے لیے نہیں اٹھے گی۔ میں ایک کسان بنوں گا۔ میں ایک چرواہا بنوں گا میری زندگی کا اب پہلا اور آخری مقصد ان بے بس لوگوں کی حفاظت اور پرورش ہے۔ آپ یہ کہتے ہین کہ حیدر علی نہ صرف میسور بلکہ اودھ اور حیدر آباد کے مسلمانوں کی آزادی اور بقا کی جنگ لڑ رہا ہے لیکن یہی وجہ ہے جو میں میسور جانے سے ڈرتا ہوں۔ میں اور میرے قبیلے کے جانبازوں نے بھی ان لوگوں کی بقا اور آزادی کے لیے جنگ لڑی تھی لیکن ہماری بے لوث قربانیاں ان درندوں کی خصلت نہیں بدل سکیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ یہ احسان فراموش قوم کہیں ہماری طرح حیدر

علی کو بھی اپنا دشمن نہ سمجھ لے۔

بھائی جان! میری پونجی میرے جلے ہوئے گھر کی راکھ اور ان بے سہارا لوگوں کے آنسو ہیں۔ میں نظام کے پاس جا کر یہ کہوں گا کہ اگر تمہیں اچھے کسانوں اور اچھے چرواہوں کی ضرورت ہے تو ہمیں اپنی مملکت میں آباد کر لو لیکن اگر یہاں صرف تمہارے اقتدار کے پرچم اٹھانے والے سپاہیوں کی ضرورت ہے تو ہم واپس جانے کے لیے تیار ہیں۔

معظم علی نے کہا۔ میں تمہارے احساسات سے غافل نہیں۔تم نے ایک بھیانک ترین انقلاب دیکھا ہے لیکن یقین کرو جب میں نے بنگال سے ہجرت کی تھی اس وقت میرے دل میں بھی اسی طرح کے خیالات تھے۔ میں بھی یہ سوچا کرتا تھا کہ میں اب کسی حکمران کے ساتھ سروکار نہیں رکھوں گا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے تجارت شروع کر دی تھی لیکن زمانے کا کوئی انقلاب سلگتی ہوئی آگ سے دھواں اور دہکتے ہوئے انگاروں سے حرارت جدا نہیں کر سکتا۔ میں دعا کروں گا کہ حیدر آباد میں تم امن اور سکون کی زندگی گزار سکو لیکن مجھے یقین ہے کہ تم کسی دن میسور ضرور آؤ گے۔ دکن کا سب سے بڑا زمیندار بن جانے کے باوجود تم کسی دن یہ محسوس کرو گے کہ تمہاری آخری منزل سرنگا پٹم ہے۔

میراں پور کٹرہ کی شکست کے بعد روہیلوں کے سامنے موت یا ہجرت کے سوا کوئی راستہ نہ تھا ایسٹ انڈیا کمپنی اور اودھ کے سپاہی انہیں جنگلی جانوروں کی طرح گھیر گھیر کر قتل کرتے تھے۔ان کی بستیاں جلائی جا رہی تھیں۔آگ اور خون کے اس طوفان سے بچ کر بھاگ نکلنے والے دور دراز علاقوں میں پناہ لے رہے تھے۔

یہ جنگ کسی حکومت یا فوج کے خلاف نہ تھی بلکہ ان انسانون کے خلاف تھی

جن کا سب سے بڑھا جرم یہ تھا کہ وہ کسی میر جعفر کسی شجاع الدولہ یا کسی نظام علی خاں جیسے ملت فروش کے اطاعت گذار نہ تھے۔ روہیلکھنڈ کی سر زمین اس شریف، بہادر اور غیور قوم کے فرزندوں کے خون سے لالہ زار تھی اور روہیلکھنڈ سے باہر اس قوم کی بے بسی کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا مہاجرین کے قافلے اپنی جنم بھوم چھوڑ کر پہاڑوں، جنگلوں اور بیابانوں میں پناہ لے رہے تھے۔ ان کا ماضی اجڑی ہوئی بستیوں، بے گور دکفن لاشوں اور لٹی ہوئی عصمتوں کی داستانوں سے لبریز تھا۔ چند دنوں کے اندر اندر ایک لاکھ لاکھ انسان جلاوطنی کی حالت میں غربت، افلاس قحط اور طرح طرح کی دباؤں کا سامنا کر رہے تھے، نواب وزیر اودھ اس بات پر خوش تھا کہ اس کی سلطنت میں ایک سرسبز و شاداب خطہ زمین کا اضافہ ہو گیا ہے۔ انگریز خوش تھے کہ ہندوستان کا ایک بازوئے شمشیر زن کٹ چکا ہے اور مرہٹے خوش تھے کہ وہ لوگ جو کسی وقت دلی میں ان کے مدمقابل بن سکتے تھے پوری طرح مغلوب ہو چکے ہیں۔

جو قافلہ معظم علی اور اکبر خان کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ ان گنت کا سامنا کرنے کے بعد ایک دن حیدر آباد کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ راستے میں دو مقامات پر ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کیا لیکن قافلے کے محافظوں کے ساتھ معمولی جھڑپوں کے بعد وہ بھاگ گئے معظم علی کو اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ اودھ کی فوج ان کا تعاقب کرے گی لیکن اودھ کی فوج کا سپہ سالار فتح کے جشن میں حصہ لینے کے لیے لکھنو پہنچ چکا تھا اور اس کے سپاہی اکبر خاں کی بستی پر حملہ کرنے والے ساتھیوں کے انجام سے بے خبر روہیلکھنڈ کے طول و عرض میں قتل و غارت اور لوٹ مار میں مصروف تھے۔

چار دن بعد جب انگریزی فوج کے افسروں کو اپنے ساتھیوں کے انجام کا پتہ

چلاتو یہ قافلہ کئی منزلیں دور چکا تھا۔

حیدر آباد کے دارالحکومت سے تین منزل کے فاصلے پر معظم علی نے اکبر خاں سے کہا۔میرے دوست اب تمہاری منزل قریب آ گئی ہے۔مجھے بہت جلد سرنگ پٹم واپس پہنچنا چاہیے تھا۔اب مجھے اجازت دو اور یہ وعدہ کرو کہ اگر حیدر آباد کے حالات تمہاری توقع کے مطابق نہ ہوئے تو تم میرے پاس آ جاؤ گے۔

میں وعدہ کرتا ہوں، اکبر خاں نے جواب دیا۔

معظم علی نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔میں تمہارے خطا کا انتظار کروں گا۔

جب وہ گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا تو بلقیس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔بھائی جان! بھابی جان کو میرا اسلام کہیں۔میں انہیں دیکھنے کے لیے کسی دن سرنگا پٹم ضرور آوں گی۔

معظم علی نے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔بیٹا تم ضرور آنا مجھے ڈر ہے کہ حیدر آباد پہنچ کر تم ہمیں بھول جاؤ گے۔

معظم علی اور اس کے پانچ ساتھی گھوڑوں پا رسوار ہو کر ایک طرف نکل گئے اور اکبر خاں نے قافلے کو کوچ کر حکم دیا۔

سرنگا پٹم پہنچ کر معظم علی نے دوبارہ فوجی تربیت گاہ کا انتظام سنبھال لیا۔مرہٹوں کے ساتھ حیدر علی کی جنگ ابھی تک جاری تھی اور آئے دن میسور کی سلطنت میں نئے نئے مفتوحہ علاقوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ایک سال تک معظم علی کو اکبر خاں کی طرف سے کوئی پیغام نہ ملا۔ایک دن اس نے شیخ فخر الدین کی معرفت اس سے خط لکھا۔قریباً ایک ماہ بعد اسے اکبر خاں کی طرف سے یہ جواب ملا۔

بھائی جان! آپ نے بلقیس کے ماموں جان کی معرفت جو خط لکھا تھا وہ میرے پاس دیر سے پہنچا۔حیدرآباد پہنچنے کے بعد شیخ فخرالدین کی یہ کوشش تھی کہ میں ان کے ساتھ تجارت مٰں شریک ہو جاؤں مگر میرے سامنے اپنے قبیلے کے لوگوں کو بسانے کا مسئلہ تھا۔عطیہ کا خاوند طاہر بیگ میرے لیے ادھونی کی فوج میں ایک عہدے کی پیش کش لے کر آیا تھا لیکن میں اس پر بھی آمادہ نہ ہوا۔اس کے بعد ہمیں شیخ فخرالدین کی کوشش اور طاہر بیگ کے اثر و رسوخ کے باعث دریائے کشنا اور تنگ بھدرہ کے درمیان آباد ہونے کے لیے زمین کا ایک وسیع قطعہ نہایت سستے داموں میں مل گیا ہے۔میرے قبیلے کے لوگ اپنے گھر چھوڑتے وقت جو نقدی اپنے ساتھ لائے تھے،وہ ہمارے کام آئی۔یہ علاقہ مرہٹوں کی مملکت کی سرحد سے صرف چند میل دور ہے ہم نے کچھ زمین ان زمینداروں سے خرید لی ہے جو مرہٹوں کی چھیڑ چھاڑ کے خوف سے ادھونی کے آس پاس آباد ہونا چاہتے تھے۔باقی زمین سرکاری ہے اور ہمیں اس کے لیے ادھونی کی حکومت کو کوئی معاوضہ نہیں دینا پڑا۔صرف یہ شرط رکھی گئی ہے کہ اگر مرہٹوں کی طف سے کوئی خطرہ پیش آیا تو ہم اپنی حفاظت کے ذمہ دار خود ہوں گے۔یہ زمین بہت اچھی ہے لیکن جنگل صاف کر کے اسے قابلِ کاشت بنانے میں ہمیں کچھ عرصہ سخت محنت کرنی پڑے گی۔

شیخ فخرالدین کی کوشش تھی کہ مجھے حیدرآباد کے گردونواح میں کوئی جاگیر مل جائے اور وہ اپنی کوشش میں کسی حد تک اکامیاب بھی ہو گئے تھے لیکن مجھے ایک جاگیردار کی حیثیت سے نظام کی فوج کے لیے کرائے کے سپاہی مہیا کرنا منظور نہ تھا۔ادھونی کی حکومت کے ساتھ میرا یہ معاہدہ ہوا ہے کہ جتنی زمین آباد ہوتی جائے گی اہم اس کا لگان ادا کرتے جائیں گے اور ہم سے کسی وقت سپاہی مہیا کرنے کا مطالبہ

نہیں کیا جائے گا۔

روہیلکھنڈ کے کئی اور قبیلے ابھی تک اس ملک میں سرگرداں پھر رہے ہیں کوئی پانچ سو آدمی مجھ سے دو ماہ بعد حیدر آباد پہنچے تھے اور میں انہیں یہاں لے آیا ہوں۔ اگر حالات نے اجازت دی تو ہم دو تین سال کے اندر اندر اس غیر آباد جنگل کو لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل کر دیں گے۔ بھیلوں کے چند قبیلے اس جنگل میں صرف شکار پر گذارہ کرتے تھے لیکن اب ہماری وجہ سے وہ بھی کھیتی باڑی کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ میں نے پچاس بھیل اپنے پاس ملازم رکھ لیے ہیں۔ اب یہ علاقہ ہماری چھوٹی سی دنیا ہے اور ہم اسے بیرونی طوفانوں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ میرے دل میں اگر سرنگا پٹم آنے کا کوئی خیال تھا تو وہ اب جا چکا ہے اب اگر میں کبھی آؤں گا تو صرف آپ کو دیکھنے کے لیے بلقیس آپ کو اور بھابی جان کو سلام کہتی ہے۔

آپ کا بھائی اکبر۔

اپنی نئی جائے پناہ سے یہ اکبر خاں کا پہلا اور آخری خط تھا اس کے بعد یہ دونوں دوست اپنی اپنی دنیا کی تعمیر میں مصروف رہے اور کسی کو اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ دوسرے کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔

اٹھارھواں باب

چھ سال اور گزر گئے اس عرصہ میں میسور کے سینکڑوں نوجوان سرنگا پٹم کے فوجی مدرسہ سے تربیت حاصل کر کے حیدر علی کی فوج میں شامل ہو چکے تھے۔ معظم علی کے بیٹوں نے تلواروں کی جھنکار میں آنکھ کھولی تھی اور انہوں نے اس ماں کا دودھ پیا تھا جسے اپنے اور اپنے شوہر کے خاندان کی غیرت و شجاعت پر ناز تھا۔ یہ بچے ہوش سنبھالتے ہی جنوں بھوتوں اور سانپوں کی کہانیاں سننے کی بجائے جنگوں کے واقعات سنا کرتے تھے اور بڑے ہو کر وہ اپنے باپ کی مجلس میں حیدر علی کی فوج کے نامور سپہ سالاروں اور بڑے بڑے افسروں کو دیکھا کرتے تھے۔ صدیق علی سترہ سال کی عمر میں سرنگا پٹم کے فوجی مدرسے سے فارغ التحصیل ہو کر جہاز رانی کا تجربہ حاصل کرنے کے لیے اپنے فرانسیسی اتالیق کے ساتھ منگلور جا چکا تھا۔ مسعود علی، انور علی اور مراد علی فوجی درسگاہ میں تعلیم پا رہے تھے معظم علی اپنے تمام بچوں کو بہترین سپاہی اور بہترین عالم دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے گھر پر عربی اور فارسی کے علوم کی تعلیم دینے کی خدمت ایک ایرانی عالم کے سپرد کر رکھی تھی اور وہ خود بھی فرصت کے اوقات ان کی تعلیم و تربیت پر صرف کیا کرتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں میں انگریزوں کے مظالم اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک معمولی کلرک سے لے کر گورنر جنرل تک لوٹ مار میں مصروف تھے۔ بنگال کے شہروں کی تجارت تباہ ہو چکی تھی۔ خوشحال تاجروں کو کوڑی کوڑی کا محتاج بنا کر ترک وطن پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ میر جعفر کی ذلیل خدمات کا اس کے پسماندگان کو یہ صلہ دیا گیا کہ وارن ہیسٹنگز نے ڈرا دھمکا کر ان سے لاکھوں روپے وصول کیے۔ بنگال کے ایک عالی نسب اور جرات مند برہمن نند کمار

نے وارن ہیسٹنگز کی لوٹ مار کے خلاف آواز بلند کی اور وارن ہیسٹنگز نے اس کے بدلے نند کمار کے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ کھڑا کر کے اسے موت کی سزا دلوا دی۔

بنگال کے امرا کو جی بھر کر لوٹنے کے بعد وارن ہیسٹنگز نے بنارس کے راجہ چیت سنگھ کی طرف توجہ کی راجہ چیت سنگھ نے اسے مطمئن کرنے کے لیے اپنے خزانے خالی کر دیے لیکن اس کے پاس وارن ہیسٹنگز اور کمپنی کے دوسرے ملازمین کی بھوک کا کوئی علاج نہ تھا، جوں جوں بنارس کے خزانے خالی ہوتے جا رہے تھے وران ہیسٹنگز کے مطالبات بڑھتے جا رہے تھے۔ بالآخر جب راجہ کے پاس کچھ نہ رہا تو ہسینٹگز اس پر حکم عدولی کا الزام عائد کر کے خود بنارس پہنچا اور اس نے راجہ چیت سنگھ کی گرفاری کا حکم دیا امن پسند راجہ نے اپنی نیک نیتی کا ثبوت دینے کے لیے کسی مزاحمت کے بغیر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا لیکن بنارس کی فوج اور عوام اپنے راجہ کی توہین برداشت نہ کر سکے انہوں نے انگریزوں اور سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور راجہ کو ان کی قید سے چھڑا لیا ہیسٹنگز بنارس سے بھاگا اور اس نے ایک بڑی فوج جمع کر کے دوبارہ چڑھائی کی۔ راجہ چیت سنگھ اپنی جان اور عزت کے خوف سے گوالیار کی طرف بھاگ گیا۔ ورن ہیسٹنگز نے چیت سنگھ کی جگہ اس کے بھتیجے کو گدی پر بٹھا دیا اور اپنا خراج سوا دو لاکھ سے بڑھا کر چار لاکھ پاؤنڈ کر دیا۔

نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد اودھ کی حکومت اس کے بیٹے آصف الدولہ کے ہاتھ آئی۔ روہیلکھنڈ پر قبضہ کرنے کے لیے وران ہیسٹنگز سے مدد لینے کے باعث شجاع الدولہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقروض ہو چکا تھا۔ آصف الدولہ کے گدی پر بیٹھتے ہی وارن ہیسٹنگز نے اس سے پندرہ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا۔ آصف الدولہ کے پاس روپیہ نہ تھا لیکن اس نے برٹش ریزیڈنٹ کی مدد سے اپنی بیوہ ماں اور

دادی سے ساڑھے پانچ لاکھ پاؤنڈ کی رقم اس شرط پر حاصل کی کہ اس کے بعد وہ انگریز ان سے کوئی اور مطالبہ نہیں کریں گے لیکن وران ہسینٹگز کے کانون تک بیگمات اودھ کی دولت کے قصے پہنچ چکے تھے۔ اور وہ روپیہ حاصل کرنے کے لیے ہر حربہ جائز سمجھتا تھا چنانچہ اس نے آصف الدولہ اور لکھنو کے انگریز زیڈنٹ کو بیگمان اودھ سے مزید روپیہ حاصل کنے پر مجبور کیا۔ جب آصف الدولہ ایک حد سے آگے جانے کے لیے تیار نہ ہوا تو ہیسنگو نے انگریز ریزیڈنٹ مڈلٹن نے جب بیگمات سے مزید روپیہ حاصل کرنے میں اپنی ناکامی کا اعتراف کای تو وران ہیسٹنگو نے اس مقصد کے لیے اس کی جگہ برسٹوف نامی ایک نیا ریزیڈنٹ بھیج دیا نئے ریزیڈنٹ نے بیگمات کے محل کا محاصرہ کرنے کے بعد ان کے نوکروں کو حراست میں لے لیا اور خفیہ خزانے کا پتہ معلوم کرنے کے لیے چند ماہ تک ان پر بے پناہ مظالم توڑتا رہا۔ چند سال قبل شجاع الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے روہیلکھنڈ کی غیرت، عزت اور آزای پر حملہ کیا تھا اور اب یہی انگریز اس کے اپنے حرم تک پہنچ چکے تھے۔ اس کی بوڑھی ماں اور ااودھ کی شہزادیاں قیدیوں کی سی حالت میں اپنے ان نوکروں اور خادماؤں کی چیخیں سنا کرتی تھیں جنہیں انگریز سپاہی خفیہ خزانے کا راز معلوم کرنے کے لیے صبح وشام زدوکوب کیا کرتے تھے۔ بالآخر جب قریباً ایک سال بدترین اذیتیں برداشت کرنے کے بعد بیگمات نے سب کچھ انگریزوں کے حوالے کردی تو ان کی خلاصی ہوئی۔

شاہ عالم ثانی جو چند سال قبل انگریزوں کی سرپرتی سے نکل کر مرہٹوں کی سرپرتی میں دلی کے تخت پر رونق افروز ہوا تھا اور جسے شاید یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی سلطنت کا نیا حدود اربعہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے، ایک

خاموش، بے بس، تماشائی کی حیثیت میں تمام واقعات دیکھ رہا تھا۔

جنوبی ہندوستان میں کرناٹک کے حالات بنگال اودھ اور بنارس سے بھی بدتر تھے۔محمد ولی والا جاہ بظاہر کرناٹک کا حکمران تھا لیکن درحقیقت وہ ایک ایسا کولھو تھا جس سے انگریز اہل کرناٹک کا خون نچوڑنے کا کام لے رہے تھے والا جاہ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ انگریز میسور فتح کریں اور پھر اس کے بعض حصے ارکاٹ کی سلطنت میں شامل کردیئے جائیں تاکہ انگریزوں کے دسترخوان کے بچے ٹکڑوں سے اس بیگمات اور شہزادوں کی پرورش کا بہتر انتظام ہو سکے جن کی تعداد اب درجنوں تک پہنچ چکی تھی۔

نیکی اور شرافت کا منہ نوچا جا رہا تھا، انسانوں کی تقدیر درندوں کے ہاتھ میں تھی۔کرناٹک کے تباہ حال لوگ کسی نجات دہندہ کی تلاش میں تھے۔قدرت کی انتقامی قوتیں حرکت میں آئیں۔ایک آتش فشاں پہاڑ پھٹا اور کرناٹک میں انا دلاغیری کا نعرہ لگانے والے انگریز اس کے دہانے پر کھڑے تھے۔یہ حیدر علی تھا جو ایک آتشیں سیلاب کے ساتھ میسور سے نکلا اور کرناٹک پر چھا گیا۔ساتھ سمندر پار سے آنے والے وہ تاجر جو اپنی عیاری او مکاری کی بدولت ہندوستان پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔اس سیلاب کے آگے آگے بھاگ رہے تھے۔وہ جو اپنی توپوں کی دھنا دھن کے جواب میں بے بس انسانوں کی چیخیں سننے کے عادی تھے اب ایک ایسی قوم کے جوانوں کی غیرت کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے جو ان کے اندازوں کے مطابق مفلوج ہو چکی تھی اور وہ جو اس ملک کے نا اہل امراء کی ملت فروشی اور ابن اوقتی کو اپنی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت خیال کرتے تھے، حیدر علی کے دائیں بائیں وقت کے بہترین جرنیل دیکھ رہے تھے وہ انگریز سیاست دان جنھوں نے چند

سال قبل صرف اس امید پر معاہدہ راس کی شرائط کی خلاف ورزی کر کے حیدر علی کو مرہٹوں کے خلاف تنہا چھوڑ دیا تھا کہ مرہٹے اپنی بے پناہ قوت کے بل بوتے پر میسور کو فتح کریں گے اور وہ ان سے اپنا حصہ وصل کر سکیں گے، اپنے سامنے ان تو ے ہزار سواروں کی فوج دیکھ رہے تھے جو انہیں سمندر کی طرف دھکیلنے کے ارادے سے میدان میں آ چکی تھی۔ مدارس کے گورنر نے اس صورت حالات کا سامنا کرنے کے لیے کمپنی کے لشکر کی قیادت بکسر کے فاتح سر ہیکٹر منرو کو سونپی اور کرنل بیلی کو حکم بھیجا کہ وہ گنتھور سے اپنی فوج کے ساتھ پیشقدمی کر کے سر ہیکٹر منرو کے ساتھ آ ملے۔

جنرل مزو مدارس سے روانہ ہوا اور کنجی ورم پہنچ کر کرنل بیلی کا انتظار کرنے لگا حیدر علی نے شہزادہ ٹیپو کو کرنل بیلی کر راستہ روکنے کے لیے روانہ کیا اور خود ارکٹ کا محاصرہ چھوڑ کر کنجی ورم کی طرف بڑھا۔ ٹیپو نے کرنل بیلی کے لشکر کو کنجی ورم سے پندرہ میل کے فاصلے پر جالیا اور پلی جھڑپ میں اس کے دو سو سپاہی ہلاک کر دیے۔

اس عرصہ میں ٹیپو کی مدد کے لیے سپاہیون کے چند دستے پہنچ گئے اور کرنل بیلی نے سر مزو کو پیغام بھیجا کہ وہ فوری مدد کے بغیر ٹیپو کا محاسرہ توڑ کر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ۹ ستمبر کو سر مزو نے کرنل بیلی کی مدد کے لیے پہنچ جائے گا لیکن صبح ہوتے ہی ٹیپو کی فوج نے عقب سے اس پر گولہ باری شروع کر دی اس کے ساتھ ہی حیدر علی میں پیش قدمی شروع کی لیکن وہ عقب سے توپوں کی گولہ باری اور بازوؤں سے میسور کے سواروں کے حملوں کے باعث ہر قدم پر سخت تباہی کا سامنا کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے انتہائی مجبوری کی حالت میں کنجی ورم سے چھ میل کے فاصلے پر جم کر لڑنے کا فیصلہ کیا لیکن اتنی دیر میں ٹیپو کی مدد کے لیے حیدر علی کا توپ خانہ بھی پہنچ چکا تھا۔ توپوں کی دو طرف گولہ باری کے باعث انگریزوں کی فوج میں افراتفری مچ گئی۔ ان کی فوج

کے دیسی سپاہی میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے اور یورپین سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

سر ہیکٹر منرو کرنل بیلی کی شکست سے اس قدر بدحواس ہوا کہ وہ اپنی بھاری توپیں ایک تالاب میں پھینک کر مدارس کی طرف بھاگ نکلا ٹیپو کے طوفانی دستے اس کے پیچھے تھے۔ منرو قدم قدم پر لاشیں چھوڑتا ہوا انتہائی بے سروسامانی اور بیچارگی کی حالت میں مدارس پہنچا مدارس کے باشندے کے فاتح کو اس حالت میں دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔

شہزادہ ٹیپو، منرو کی فوج جنگی سامان اور رسد کے ذخیرے چھیننے کے بعد دوبارہ اپنے باپ سے جاملا۔ میسور کا لشکر کرناٹک کے دارالحکومت ارکاٹ کی طرف بڑھا اور محمد علی والا جاہ اپنے انگریز سرپرستوں سمیت وہاں سے بھاگ نکلا اور ماہ اکتوبر ۱۷۸۰ میں ارکاٹ پر حیدر علی کی فتح کا پرچم لہرا رہا تھا۔

حیدر علی ارکاٹ کو اپنا مستقر بنا کر مفتوحہ علاقوں کے انتظامات میں مصروف ہو گیا اور ٹیپو نے دس ہزار سواروں کے ساتھ پیش قدمی کر کے ست گڑھ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا یہ قلعہ بہت مضبوط تھا اور دو ہزار سپاہی جن کے پاس کئی مہینوں کے لیے اسلحہ بارود اور رسد کے ذخیرے موجود تھے۔ اس کی حفاظت پر متعین تھے لیکن قلعہ کے محافظ نے شہزادہ ٹیپو کے پے در پے حملوں سے بدحواس ہو کر ۱۳ جنوری ۱۷۸۱ کو ہتھیار ڈال دیے۔

اس کے بعد ٹیپو نے انبور کے قلعہ پر حملہ کیا۔ اس قلعے کا محافظ ایک انگریز کیپٹن تھا وہ قریباً پندرہ دن تک حملہ آور فوج کا مقابلہ کرتا رہا لیکن جب بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ہتھیار ڈال دیے۔

کرناٹک کے ان دو اہم قلعوں پر قبضہ کرنے کے بعد شہزادہ ٹیپو نے تیار گڑھ کی طرف پیش قدمی کی۔ چار ہفتوں کے محاصرہ کے بعد جب اس کی فوج تیار گڑھ کے قلعے پر فیصلہ کن حملہ کر چکی تھی انگریز کمانڈنٹ نے فصیل پر صلح کے جھنڈے بلند کر دیے۔ ٹیپو نے فوج ی گولہ باری بند کر دینے کا حکم دیا لیکن اگلے دن جب انگریز کمانڈنٹ قلعہ خالی کرنے والا تھا اسے یہ اطلاع ملی کہ سر آئر کوٹ ایک کمک کے ساتھ پہنچنے والا ہے اور اس نے قلعہ خالی کرنے کی بجائے میسور کی فوج پر گولہ باری شروع کدی جنگ دوبارہ شروع ہوگئی لیکن چند دن بعد قلعے کے محافظوں کو معلوم ہوا کہ سر آئر کوٹ چند منازل دور پڑاؤ ڈالے رسد کا انتظار کر رہا ہے انگریز کمانڈنٹ نے دوبارہ قلعہ خالی کرنے کی پیش کش کی لیکن ٹیپو نے اسے کوئی رعایت دینے سے انکار کر دیا اور ایک شدید حملے کے بعد قلعہ فتح کر لیا۔

اب کرناٹک کے مضبوط ترین قلعے فتح ہو چکے تھے اور ٹیپو کی فوج کسی دقت کا سامنا کیے بغیر چھوٹے چھوٹے قلعوں اور چوکیوں سے دشمن کا صفایا کر رہی تھی جون کے مہینے میں شہزادہ ٹیپو شاندار فتوحات کے بعد ارکاٹ پہنچا تو حیدر علی نے شہر سے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا، یہ صرف ایک حکمران کی طرف سے اپنے ولی عہد کے استقبال نہ تھا بلکہ ایک اولوالعزم سپہ سالار کی طرف سے اپنی فوج کے اس نوعمر جرنیل کا خیر مقدم تھا جس کی قابلیت اور بہادری کی داستانیں ساتھ دمندر پار تک پہنچ چکی تھیں۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں حیدر علی اس بوڑھے عقاب کی مانند تھا جو نشیمن سے اپنے نوعمر بچے کی پرواز دیکھ رہا ہو۔ اس نے اپنی تلوار کی نوک سے ہندوستان کے نقشے پر ایک عظیم سلطنت کی حدود کی لکیریں کھینچ دی تھیں اور اس کا ولی عہد اس

سلطنت کے خاکے میں نئے نئے رنگ بھر رہا تھا۔حیدر علی کے آزمودہ کار جرنیل ہر میدان میں ٹیپو کی قیادت کو فتح کی ضمانت سمجھتے تھے۔کرناٹک کی جنگ کے دوسرے سال میسور کے اس اولعزم حکمران کے قویٰ جواب دے چکے تھے۔جس کی جوانی کے بیشتر ایام تلواروں کی چھاؤں میں گزرے تھے۔اب اس کے لیے زندگی کی آخری خوشی یہ تھی کہ کسی حکمران کو ٹیپو سے بہتر جانشین نہیں مل سکتا۔

ٹیپو کرنل بیلی اور جرنیل منرو کے بعد سر آئرکورٹ اور اسٹورٹ جیسے جہاندیدہ جرنیلوں سے اپنا لوہا منوا چکا تھا۔ارکاٹ میں انگریزوں کی قوت مدافعت کچلنے کے بعد وہ تنجور کی طرف بڑھا اور اس کے سامنے انگریزوں کی افواج بھیڑوں کی طرح بھاگ رہی تھیں، کرنل بریتھ ویٹ جسے اپنی توپوں کے بل بوتے پر کئی ہفتے مقابلہ کرنے کی امید تھی ۲۶ گھنٹوں کے بعد اپنی تلوار پھینک چکا تھا۔

بریتھ ویٹ کو شکست دینے کے بعد ٹیپو نے کسی دقت کا سامنا کیے بغیر تنجور کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کر لیا۔فروری ۱۷۸۲ء کے آخری دنوں میں حیدر علی ہدایت پر ٹیپو تنجور سے پوا الونو دی کی طرف بڑھا۔وہاں سے اس نے فرنسیسی دستوں کو ساتھ لے کر پیش قدمی کی اور کڈلور پر قبضہ کر لیا مئی کے مہینے ٹیپو کی فوج اور فرانسیسی دستوں نے حیدر علی کے لشکر کے ساتھ شامل ہو کر پانڈی چری کے شمال مغرب میں موکل کے پہاڑی قلعے پر حملہ کر دیا۔جنرل آئرکوٹ نے قلعے کی محافظ فوج کو مدد دینے کے لیے پیش قدمی کی لیکن وہ ابھی کرنگلی پہنچا تھا کہ اسے یہ اطلاع ملی کہ میسور کی فوج قلعے کی محافظ فوج کو مدد دینے کے لیے پیش قدمی کی لیکن وہ ابھی کرنگلی پہنچا تھا کہ اسے یہ اطلاع ملی کہ میسور کی فوج قلعے پر قبضہ کر چکی ہے۔جنرل آئرکوٹ نے میسور کی افواج کے رسد اور بارود کے ذخائر پر قبضہ کرنے کی نیت سے ارنی کا رخ کیا لیکن

حیدر علی نے انگریزوں کی پیش قدمی کی اطلاع ملتے ہی ٹیپو کو ان کا راستہ روکنے کے لیے روانہ کیا۔ دو جون کی صبح آئر کوٹ کی فوج ایک طرف ٹیپو کے لشکر اور فرانسیسی دستوں کی گولہ باری کا سامنا کر رہی تھی۔ دوسری طرف حیدر علی یلغار کرتا ہوا ان کے عقب سے حملہ آور ہوا۔ جنرل آئر کوٹ کی فوج بھاری اسلحہ اور رسد کی گاڑیاں چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ سر آئر کوٹ جس تیز رفتاری سے میسور کے خلاف قوت آزمائی کے لیے آیا تھا اس سے کہیں زیادہ رفتار سے واپس مدارس کا رُخ کر رہا تھا۔

جنگ کے زمانے میں معظم علی کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ فوجی تربیت گاہ کے نگران کی حیثیت میں سلطنت خداداد کی ایک اہم ضرورت پوری کر رہا ہے۔ فوجی تربیت گاہ کی نگرانی کے علاوہ سرنگا پٹم کے قلعے کی توسیع اور نئے مورچوں کی تعمیر کا کام بھی اسے سونپا جا چکا تھا۔ اس کے پاس ان نوجوانوں کے خطوط آتے جو فوجی مدرسے سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد میسور کی فوج میں شامل ہو کر دشمن کے خالف مختلف محاذوں پر لڑ رہے تھے۔ تاہم وہ بڑی شدت سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ میدان جنگ سے دور ہے، اس کا بڑا بیٹا صدیق علی میسور کے ایک جنگی جہاز کا کپتان بن چکا تھا اور معظم علی کو اس کے متعلق نہایت حوصلہ افزا خبریں مل رہی تھیں۔ اس سے چھوٹا مسعود علی فارغ التحصیل ہونے کے بعد بری فوج میں شامل ہو چکا تھا۔

جنگ کے دوسرے سال معظم علی فارغ التحصیل طلبا کے سامنے الوداعی تقریر کر رہا تھا جن میں اس کے تیسرے بیٹے انور علی کا نام سرفہرست تھا۔ اس نے کہا۔

میرے عزیزو! مجھے تمہاری خوش نصیبی پر رشک آتا ہے تم نے اس سرزمین میں جنم لیا ہے جہاں عزت کی زندگی اور عزت کی موت کے راستے کھلے ہیں تم اس حکمران کی فوج کے سپاہی بننے جا رہے ہو جس کی نگاہیں اپنے دوست اور دشمن میں

تمیز کر سکتی ہیں۔تم اس دور کے بہترین جرنیلوں کی رہنمائی میں جوانمر دی کے جوہر دکھا سکو گے۔میرے بال اب سفید ہو چکے ہیں لیکن ایک زمانہ تھا جب میری رگوں میں خون کی بجائے بجلیاں دوڑتی تھیں، جوانی میں میری سب سے بڑی خواہش تھی کہ میں کسی رجل عظیم کی فتوحات میں حصہ دار بنوں لیکن میں نے ایسی سرزمین میں آنکھ کھولی تھی جہاں آزادی کے پرستاروں کے لیے قید خانوں کی تاریک کوٹھڑیاں تھیں اور محبان قوم کے لیے پھانسی کے پھندے تھے جہاں قوم کے شہیدوں کی لاشوں کو پیروں تلے روندا جاتا تھا اور ملت فروشوں کے لیے حکومت کی مسندیں سجائی جاتی تھیں۔

لیکن تمہیں قدرت نے ان سپہ سالاروں کی قیادت میں لڑنے کا موقع دیا ہے جن کے گھوڑوں کی رکھوالی کرنا بھی میرے نزدیک ایک سعادت ہے میں شہزادہ فتح علی کی فتوحات کے متعلق سنتا ہوں تو میرے دل میں ابر بار یہ خیال آتا ہے کہ کاش میں یہاں پیدا ہوتا۔میرا بچپن میری جوانی اور میرا بڑھاپا ان کے ساتھ گزرتا۔ایک قافلے کی اس سے زیادہ قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا امیر اپنے راستے کے نشیب وفراز نگاہ رکھتا ہے۔اور ایک سپاہی کے لیے قدرت کا اس سے بڑا انعام اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کا سپہ سالار کسی مقصد کے لیے قربانی دینا جانتا ہے۔میں دعا کرتا ہوں کہ تمہاری جرات اور ہمت نواب حیدر علی اور شہزادہ ٹیپو کے بلند عزائم کا ساتھ دے سکے اور اس بات پر فخر کرسکوں کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔

ایک ہفتہ بعد انور علی، حیدر علی کے نامور جرنیل غازی کی قیادت میں محاذ جنگ کو روانہ ہو چکا تھا اور اس کی کمان میں پچاس سوار تھے۔اس کے بعد گھر میں معظم علی اور فرحت کی تمام دلچسپیاں ننھے مراد تک محدود ہو گئیں۔مراد علی اپنے تمام بھائیوں

میں سب سے زیادہ ذہین تھا۔اس کی شوخیاں اوراس کی شرارتیں اس کے والدین بھائیوں نوکروں اور پڑوسیوں کی گفتگو کا موضوع بنی رہتی تھیں لیکن جب تینوں بھائی یکے بعد دیگرے گھر سے چلے گئے تو اسے اپنی مسکراہٹوں اور قہقہوں کی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگا۔ بھائیوں کی موجودگی میں وہ مکتب سے فارغ ہونے کے بعد باقی سارا دن کھیل کود میں گزارتا تھا لیکن وہ فرصت کے لمحات میں ہمیشہ ماں کے پاس رہنا پسند کرتا تھا۔

معظم علی کے بیٹے بڑی باقاعدگی کے ساتھ اسے خطوط بھیجا کرتے تھے۔ان خطوط میں مراد علی کے متعلق اس قسم کی باتیں ہوتی تھیں۔اس کی صحت کیسی ہے۔۔۔اب بھی وہ اسی طرح شرارتیں کرتا ہے۔یا کچھ سنجیدہ ہوگیا ہے۔۔۔۔محلے کے لڑکوں کے ساتھ اس کی جنگیں ہوئیں یا نہیں۔۔۔صابر کے ساتھ اب بھی جھگڑا ہوا کرتا ہے یا نہیں۔۔۔۔وہ بہت یاد آتا ہے"۔اور فرحت اپنے بیٹوں کو جواب میں لکھا کرتی تھی' مراد علی اب بہت بدل گیا ہے۔۔۔اس کی شوخیاں تمہارے ساتھ رخصت ہوچکی ہیں۔۔۔وہ میری تنہائی کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور مکتب سے فارغ ہوکر سیدھا گھر آجاتا ہے۔۔۔فوجی تربیت حاصل کرنے اور کتابیں پڑھنے کے علاوہ اس کی تمام دلچسپیاں جنگ کی خبریں سننے تک محدود ہوچکی ہیں۔

ایک دوپہر معظم علی،فرحت اور مراد مکان کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔اچانک مکان کے مردانہ حصے کی طرف گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔تھوڑی دیر بعد صابر بھاگتا ہوا صحن میں داخل ہوا اور کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں چلایا صدیق خاں آگئے۔

معظم علی اور فرحت کے چہرے مسرت سے چمک اٹھے اور مراد علی بھائی جان، بھائی جان، کہتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس کے بعد معظم علی اور فرحت کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئے۔ صدیق علی مراد کو اپنے ساتھ چمٹائے صحن میں داخل ہوا اور اس نے اپنے والدین کو سلام کیا۔ اس کے سر پر پگڑی کی بجائے سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ فرحت اضطراب اور بدحواسی کی حالت میں چند قدم آگے بڑھ کر بولی۔ بیٹا کیا ہوا تم نے سر پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے۔

امی جان میں زخمی ہو گیا تھا۔ اب ٹھیک ہوں۔ زخم بہت معمولی تھا گولی میری کھوپڑی کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔

مراد علی نے کہا۔ امی جان! آپ نے غور نہیں کیا۔ بھائی جان لنگڑا بھی رہے تھے۔

صدیق علی نے کہا۔ مراد تم بہت شریر ہو۔ امی جان آپ پریشان نہ ہوں۔ گھوڑے پر سفر کرتے کرتے میری ٹانگیں شل ہو گئی ہیں۔

معظم علی نے کہا۔ بیٹا چلو اندر بیٹھو! صابر خادمہ سے کہو ان کے لیے کھانا لے آئے

صدیق علی ان کیا ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور معظم علی نے اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ مجھے توقع نہ تھی کہ آج کل تمہیں گھر آنے کی چھٹی ملے گی۔

ابا جان میں صرف دو دن یہاں ٹھہروں گا۔

تم اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟

ابا جان! میں سیدھا کالی کٹ سے آ رہا ہوں۔ میں ماہی کے قریب بحری جنگ میں زخمی ہو گیا تھا۔ میرے جہاز پر دو انگریزی جہازوں نے حملہ کر دیا تھا۔ ان میں

سے ایک کو ہم نے غرق کر دیا لیکن دوسرے جہاز کی گولہ باری سے ہمارے جہاز کو آگ لگ گئی ایک فرانسیسی جہاز بر وقت ہماری مدد کے لیے پہنچ گیا اور اس نے انگریزی جہاز کو بھگا دیا۔ ہمیں اپنے جلتے ہوئے جہاز سے سمندر میں کودنا پڑا۔ فرانسیسی ملاحوں نے ہمیں سمندر سے نکال کر اپنے جہاز میں کالی کٹ پہنچا دیا، میرے زخم معمولی تھے۔ تاہم مجھے چند دن آرام کرنے کی ضرورت تھی۔ ابھی چھ سات روز گزرے تھے کہ انگریزوں نے اچانک تیلی چری اور ماہی پر قبضہ کر کے کالی کٹ پر حملہ کر دیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی کارگزاری کے متعلق آپ کے لیے کوئی حوصلہ افزا خبر نہیں لایا ہوں۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جن دو آدمیوں نے سب سے آخر میں کالی کٹ کا قلعہ چھوڑا تھا ان میں سے ایک قلعے کا محافظ اور دوسرا میں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری فوج بہت جلد پہنچ جائے گی اور ہم کسی تاخیر کے بغیر انگریزوں کو وہاں سے نکال دیں گے۔ مسعود اور انور کے متعلق کوئی خبر آئی ہے؟

ہاں وہ بخریت ہیں۔ انور ان دنوں تنجور پہنچ چکا ہے اور مسعود حیدر علی کے ساتھ ہے کچھ عرصہ سے میں بھی یہ کوشش کر رہا ہوں کہ مجھے کسی محاذ پر بھیج دیا جائے۔ میں نے شہزادہ ٹیپو کو درخواست بھیجی تھی لیکن ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔

صدیق علی نے کہا۔ نہیں ابا جان! اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔

معظم علی نے کہا۔ مجھ سے زیادہ علی کو آرام کی ضرورت تھی۔

لیکن ابا جان اگر آپ جنگ پر چلے گئے تو یہاں آپ کے حصے کا کام کون سنبھالے گا؟

یہاں میری جگہ لینے والے اب کئی لوگ موجود ہیں۔

تیسرے دن صدیق علی اپنے والدین اور ننھے بھائی کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔

ایک رات آسمان صاف تھا معظم علی، فرحت اور مراد علی نماز مغرب کے بعد کھلے صحن میں بیٹھے خوشگوار ہوا کا لطف اٹھا رہے تھے۔ صابر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اُن کے قریب آیا اور اس نے کہا۔ اسد خاں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

اسد خاں، معظم علی کے انتہائی بے تکلف دوستوں میں تھا اور اسے چند سال قبل ایک لڑائی میں زخمی ہونے کے بعد سرنگا پٹم میں اسلحہ سازی کے کارخانوں کا ناظم بنا دیا گیا تھا۔

معظم علی نے صابر سے پوچھا ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟

جی نہیں۔

معظم علی نے فرحت کی طرف دیکھا اور کہا تم اوپر چلی جاؤ میں انہیں یہیں بلا لیتا ہوں۔

فرحت اٹھ کر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد صابر، اسد خاں کے ساتھ صحن میں داخل ہوا معظم علی نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔ کیا بات ہے آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں؟

اسد خان نے جواب دیا۔ مجھے اسی وقت ارکاٹ پہنچنے کا حکم ملا ہے۔ حیدر علی نے سرنگا پٹم کے چند اور افسر بھی اپنے پاس بلا لیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اہم مسئلہ درپیش ہے۔ پرسوں مجھے برہان الدین کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ نواب صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔

معظم علی نے پوچھا۔ آپ کب جا رہے ہیں؟

میں ابھی روانہ ہو جاؤں گا میں صرف آپ سے الوداع کہنے کے لیے آیا تھا۔

معظم علی نے کہا۔ خدا انہیں صحت دے۔ اس وقت حیدر علی کی صحت سے زیادہ میسور کو

کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

اسد خاں نے کہا۔آپ اپنے لڑکوں کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتے ہیں؟

معظم علی نے کہا۔حیدر علی کے کیمپ میں شاید آپ کو مسعود علی کے سوا کوئی اور نہ ملے ۔صدیق علی ان دنوں منگلور میں ہو گا اور انور علی نے مجھے پچھلے ہفتے یہ اطلاع بھیجی تھی کہ مجھے تنجور بھیجا جا رہا ہے ۔اگر مسعود علی ملے تو اس سے یہ کہیں کہ گھر سب خیریت ہے۔

مراد علی نے کہا۔چچا جان! بھائی جان سے یہ بھی کہیں کہ وہ چھٹی لے کر چند دن کے لیے گھر ضرور آئیں۔امی انہیں بہت یاد کرتی ہیں۔

معظم علی نے کہا۔میں نے شہزادہ ٹیپو کو پچھلے ہفتے ایک خط لکھا تھا انہوں نے مجھے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا۔آپ ان کے ساتھ کافی بے تکلف ہیں اگر ممکن ہو تو میرے خط کا ذکر ضرور کریں۔میں نے ان سے درخواست کی تھ کہ مجھے جنگ میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔

اسد خاں اٹھ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔میں ان سے ضرور کہوں، لیکن یقین ہے کہ شہزادہ ٹیپو اشد ضرورت کے بغیر آپ کو کسی محاذ پر بھیجنا گوارا نہین کریں گے۔وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ سرنگا پٹم میں زیادہ مفید کام کر رہے ہیں۔

اسد خاں باہر نکل گیا تو مراد علی نے کہا۔ابا جان آپ مجھے کب لڑائی پر بھیجیں گے؟

معظم علی نے اسے بازو سے کھینچ کر اپنی گود میں بٹھا لیا اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔بیٹا جب تم سپاہی بننے کے قابل ہو جاؤ گے تو تمہیں مجھ

سے یہ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

مرادعلی نے جواب دیا۔ابا جان میں یہ سوچتا ہوں کہ جب میں بڑا ہوں گا تو جنگ ختم ہو جائے گی پھر ہم لوگ کیا کریں گے؟

معظم علی نے جواب دیا۔بیٹا! جب جنگ ختم ہو جائے گی تو تم ایک آزاد اور با عزت قوم کے معمار بنو گے۔تم ان شہروں اور بستیوں کو دوبارہ آباد کرو گے جو ہماری عزت اور آزادی کے دشمنوں کے ہاتھوں ویران ہو چکی ہیں،تمہارے سامنے نہریں کھودنے اور بنجر زمینیں آباد کرنے کا کام ہو گا۔بیٹا تم یہ دعا کیا کرو کہ تمہارے بھائی فتح کے پھریرے اڑاتے ہوئے گھر واپس آئیں اور تمہارے مقدر میں جنگ کی کلفتوں کی بجائے فتح کے انعامات ہوں

میسور کی افواج ارکاٹ سے چند میل دور شمال کی طرف پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی ۔حیدر علی علالت کے باعث ایک خیمے میں لیٹا ہوا تھا میلبار کی مہم پر روانہ ہونے والے لشکر کی صفوں کا معائنہ کرنے کے بعد اپنے باپ کو خدا حافظ کہنے کے لیے خیمے میں داخل ہوا حیدر علی کے اشارے سے طبیب اور تیمار دار باہر نکل گئے اور اس نے ٹیپو کی طرر متوجہ ہو کر کہا۔فتح علی بیٹھ جاؤ! آج میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ٹیپو اس کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور حیدر علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔بیٹا تم ایک نہایت اہم مہم پر جا رہے ہو۔میلبار کی بندگاہوں کو انگریزوں کے قبضے سے چھڑانا ضروری ہے۔جنگ کے متعلق اب میں تمہین کوئی نصیحت نہیں کر سکتا مجھے تمہاری غیر،تمہاری شجاعت اور تمہاری ذہانت پر فخر ہے۔ ملک کی حکومت اور سیاست کے بارے میں تمہین میری نصویحوتوں کی ضرورت نہیں میں ایک ان پڑھ آدمی ہوں لیکن تم اس ملک کے چوٹی کے علماء کی صفِ اول میں کھڑے ہو سکتے ہو۔

میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میرا بیٹا اپنے زمانے کا بہترین سپاہی بہترین عالم اور بہترین حکمران ثابت ہو اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری یہ خواہش پوری کر دی لیکن میرے دل پر ایک بوجھ ہے۔۔۔۔

حیدر علی یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گیا اور ٹیپو نے کہا۔ ابا جان اگر مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو آپ کو بتانے میں جھجک محسوس نہیں ہونی چاہیے میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنی اصلاح کروں گا۔

حیدر علی نے جواب دیا۔ نہیں بیٹا! تم نے ہمیشہ میری بلند ترین توقعات پوری کی ہیں مجھے صرف یہ افسوس ہے کہ میں اپنے حصے کا کام پورا نہ کر سکا میں اپنی موت سے پہلے ہندوستان کو انگریزوں سے پاک دیکھنا چاہتا تھا لیکن اب شاید میری یہ خواہش پوری نہ ہو۔

ٹیپو نے مغموم لہجے میں کہا۔ ابا جان آپ کی یہ خواہش ضرور پوری ہو گی۔

حیدر علی نے محبت بھری نگاہوں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور کہا۔ ٹیپو! ممکن ہے کہ میں چند دن تک تندرست ہو جاؤں اور تمہاری مدد کے لیے میلابار پہنچوں لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔ اس لیے میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں غور سے سنو، میری زندگی کی دوسری ناکامی یہ ہے کہ میں نظام اور مرہٹوں کو راہِ راست پر نہ لا سکا انگریز ہمارے اس لیے دشمن ہیں کہ ہم ان کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کا سودا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ مرہٹے ہمارے اس لیے مخالف ہیں کہ وہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان کو اپنی شکارگاہ سمجھتے ہیں اور انہیں کسی دوسری طاقت کا ابھرنا گوارا نہیں۔ نظام ہمارا ایک طاقتور حلیف بن سکتا تھا لیکن وہ ان ابن الوقتوں کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے جنہیں ہندوستان کے

مسلمانوں کے مستقبل کے ساتھ کوئی دلچسپی نہین فرنسیسی اس وقت بیشک ہمارے ساتھ ہیں لیکن ہمیں یہ سمجھنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ ہمیشہ ہمارے دوست رہیں گے وہ محض اپنی انگریز دشمنی کے باعث ہمارا ساتھ دینے پر مجبور ہیں لیکن اگر کسی وقت انگریزوں کے ساتھ ان کی مصالحت ہوگئی تو وہ ہمین تنہا رچھوردیں گے ۔محمد علی کی حیثیت اب نہ ہونے کے برابر ہے ۔ میں اس کی دوستی یا دشمنی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا ۔وہ انگریوزوں کی بساطِ سیاست کا ایک پٹا ہوا مہرہ ہے اور اگر ہم نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیا تو ایسے بے ضمیر آدمی کے لیے اس ملک میں کوئی جگہ نہیں ہوگی ۔ میں نے اپنی زندگی کے بیشتر لمحات لڑائی کے میدانوں میں گزارے ہیں لیکن ابھی تک اس جنگ کا فیصلہ نہیں ہوا ہے جس پر اس ملک کی آزادی کا دارو مدار ہے میرے بعد یہ جنگ تمہین لڑنی پڑے گی لیکن میسور میں ابھی اجتماعی خصوصیات کا فقدان جو ایک طویل اور صبر آزما جنگ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہیں ۔تم میسور کو ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری حصار بنانا چاہتے ہو اور یہ امید رکھتے ہو کہ مسلمان عوام تمہاری آواز پر لبیک کہیں گے لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے کہ تمہیں اقتدار کے خلاف اعلان جنگ سمجھتے ہیں ۔

ٹیپو نے جواب دیا ابا جان! اگر ہندوستان کے مسلمان اپنی بے راہ ردی کے باعث مغضوب قوم نہیں بن چکے ہیں اور قدرت انہیں سنبھلنے کا کوئی موقع دینا چاہتی ہے تو وہ ہماری آواز پر لبیک کہیں گے اور ہماری آواز پر وہ غیر مسلم بھی لبیک کہیں گے جو اس ملک کو انگریزوں کی غلامی سے بچانا چاہتے ہیں لیکن اگر وہ خودکشی کا رارادہ ہی کر چکے ہیں تو ہمارے مقدر میں انگریزوں کی غلامی نہیں ہوگی ۔ہم اس مقصد کے لیے قربان ہو جائیں گے جو ہماری ذات سے بہت بلند ہے ہماری فتح انسانیت کی فتح

ہوگی اور ہماری شکست ان لوگوں کی شکست ہوگی جنہوں نے ذلت کا راستہ اختیار کیا ہے،

حیدر علی نے کہا بیٹا میں تمہیں مایوس نہین کرنا چاہتا تھا۔میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ تمہارے راستے میں کتنے دریا اور کتنے پہاڑ ہیں اور تمہیں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے کتنے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔تمہارے لیے حکومت پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا بستر ہوگی۔

ٹیپو نے کہا۔ابا جان! میسور کے حکمران کو خدا سلامت رکھے اس وقت میں آپ کی فوج کا ادنٰی سپاہی ہوں اور یہ اعزاز میرے لیے کافی ہے کہ میں میلبار کے محاذ پر آپ کی توقعات پوری کرسکوں۔

حیدر علی نے کہا۔میں اپنی ہر سانس کے ساتھ تمہارے لیے دعا کیا کرتا ہوں

شہزادہ ٹیپو نے کہا۔ابا جان! آپ کو طبیبوں کے مشوروں پر سختی سے عمل کرنا چاہیے ان سب کی یہی رائے ہے کہ تندرست ہونے سے پہلے آپ کے لیے سفر ٹھیک نہیں ہوگا۔

حیدر علی مسکرایا۔میں نے طبیبوں کے مشوروں پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا لیکن اب اگر وہ یہ مشورہ نہ دیتے تو بھی میرے لیے بستر پر لیٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ابا جان! آپ بہت جلد تندرست ہوجائیں،اب مجھے اجازت دیجئے۔

حیدر علی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔بیٹا جاؤ خدا تمہارے ساتھ ہو!

تھوڑی دیر بعد بیس ہزار آزمودہ کار سپاہیوں کی فوج ملیبار کا رخ کررہی تھی

ماہِ نومبر کے تیسرے ہفتے شہزادہ ٹیپو کی افواج ملیبار میں رام گلی کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں ۔ ہمبر سٹون کی قیادت میں انگریزی فوج ان کی آمد کی اطلاع ملتے ہی رفو چکر ہو چکی تھی۔ ٹیپو نے اس کا پیچھا کیا اور رام گلی سے چند میل کے فاصلے پر اسے جا لیا۔ ہمبر اسٹون نے شیر میسور کا مقابلہ کرنے کی بجائے بھاگنا زیادہ مناسب سمجھا۔ رات کے وقت ہمبر اسٹون کی فوج نے دریا عبور کرنے کے بعد پونانی کا رخ کیا۔ اس عرصہ میں کرنل میکلوڈ کی کمان انگریزوں کی ایک اور فوج ہمبر اسٹون کی مدد کو پہنچ چکی تھی ٹیپو، پونانی کے گرد گھیرا ڈال کر فیصلہ کن حملے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے حیدر علی کی وفات کی خبر ملی۔

اُنیسواں باب

مدارس کا گورنر اپنے دفتر میں جنرل اسٹورٹ سے باتیں کر رہا تھا اس کے سامنے میز پر ایک نقشہ کھلا ہوا تھا۔ گورنر کا سیکرٹری، نواب محمد علی والا جاہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا گورنر اور جنرل اسٹورٹ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ محمد علی نے جھک کر انہیں سلام کا ی اور مسافحہ کرنے کے بعد گورنر کے اشارے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ محمد علی چہرے سے امارت اور سیر چشمی کی بجائے بھوک اور حرص اور مردانہ وجاہت کی بجائے لومڑی کی سی عیاری اور سفلہ پن مترشح تھا۔ اس کا بھاری عمامہ اور قیمتی جُبہ اس کی شان وشوکت میں اضافہ کرنے کی بجائے اس پر ایک غیر ضروری بوجھ معلوم ہوتا تھا۔

اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی گورنر سے مخاطب ہوکر کہا۔ حضور والا! ابھی تک جنرل اسٹورٹ یہیں ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہم یہ موقع کھو بیٹھیں گے۔ خدا کے لیے دیر نہ کیجئے۔ سرنگا پٹم میں ہمارے دوست آپ کی فوج کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ دشمن کو سنبھلنے کا موقع دینا دانشمندی نہیں۔

گورنر نے ایک حقارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ محمد علی کی طرف دیکھا اور کہا نواب صاحب! دشمن کو کمزور یا احمق سمجھ لینا بھی دانشمندی نہیں۔

محمد علی نے جواب دیا۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی اطلاعات غلط ہیں۔ ٹیپو کے خلاف آپ کے دوستوں کی سازش کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ سب گرفتار ہو چکے ہیں اور وہ سلطنت پر قبضہ جما چکا ہے۔

محمد علی پھٹی آنکھوں سے گورنر، اس کے سیکرٹری اور جنرل اسٹورٹ کی طرف

دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ جناب والا اگر آپ کی فوج حیدر علی کی موت کی اطلاع پاتے ہی سرنگا پٹم کی طرف کوچ کر دیتی تو باغیوں کے حوصلے بلند ہو جاتے اور ٹیپو کو تخت پر بیٹھنے کا موقع نہ ملتا۔

جنرل اسٹورٹ نے کہا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم نے ایسی حماقت نہیں کی ورنہ ہماری تباہی یقینی تھی۔

لیکن ٹیپو کو اطمینان سے تیاری کا موقع دینا ایک غلطی ہے۔ اگر آپ سرنگا پٹم کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے تیار نہیں تو کرناٹک کے مقبوضہ علاقوں سے میسور کی فوج کو نکالنے میں آ کو کون سی مشکل درپیش ہے؟

جنرل اسٹورٹ نے جواب دیا۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم فوری حملہ کے لیے تیار نہیں اور میسور کے سپاہی آپ کی خواہشات کا احترام کرنے کی بجائے ہر قسدم پر مزاحمت کریں گے۔

تو پھر آپ کیا کرنا چاہتے ہیں،؟ میں حیران ہوں کہ آپ جیسا بہادر اور تجربہ کار جرنیل، ٹیپو سے اتنا مرعوب ہے۔

جنرل اسٹورٹ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ تاہم اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کاہ۔ نواب صاحب ہم جانتے ہیں کہ آپ ٹیپو کے متعلق بہت پریشان ہیں لیکن وہ ایک طاقت ور اور ہوشیار دشمن ہے اور ہم پوری تیاری کے بغیر میسور پر حملہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اگر وہ آپ کی طرح محض ایک نواب ہوتا تو میں اور میرے سپاہی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر سرنگا پٹم کی طرف یلغار کر دیتے لیکن وہ ایک سپاہی ہے اور اگر آپ کو اپنی سلطنت کا بیشتر حصہ کھو بیٹھنے کے بعد بھی اس کی قابلیت کے متعلق شبہ ہے تو ہمیں مشورہ دینے کی بجائے خود سرنگا پٹم کا رخ کیجئے؟

اسٹورٹ کا خیال تھا کہ محمد علی آپے سے باہر ہو جائے گا لیکن اسے مایوسی ہوئی محمد علی کے چہرے پر ایک فدویانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جنرل اسٹورٹ حیران تھا لیکن انگریز گورنر اور اس کے سیکرٹری کے لیے یہ مسکراہٹ کوئی نئی بات نہ تھی۔ محمد علی کرناٹک کا حکمران بننے کے بعد ہر انگریز کی گالیوں پر مسکرانے کا عادی ہو چکا تھا۔

گورنر نے جنرل اسٹورٹ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ نواب صاحب اس **ملک** میں ہمارے بہترین دوست ہیں اس لیے ان کی پریشانی بلاوجہ نہیں۔

گورنر کے ان الفاظ سے محمد علی کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس کی حالت اس بچے کی سی تھی جس کا باپ اسے تھپڑ مارنے کے بعد سیب دکھا کر خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے کہا۔ جناب جنرل صاحب بہادر! میرا مطلب یہ تھا کہ میسور پر ایک کاری ضرب لگانے کے لیے یہ بہترین موقع ہے اور ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

جنرل اسٹورٹ نے جواب دیا۔ نواب صاحب آپ مطمئن رہین ہم تیاری کر رہے ہین اور ایک ماہ تک ہم میسور پر چڑھائی کر سکیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کو فتح ہو گی۔

گورنر نے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ نواب صاحب! ہمیں آپ کے مشوروں سے زیادہ آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔

تھوڑی دیر بعد نواب محمد علی والا جاہ گورنر کے کمرے سے باہر گورنر کے اردلیوں بیروں، خانساموں اور چپڑاسیوں کو روپے تقسیم کر رہا تھا اور وہ اسے مبارکباد پیش کر رہے تھے۔

ٹیپو نے عنانِ حکومت اس وقت سنبھالی جب مدارس، کلکتہ اور بمبئی میں ایسٹ

انڈیا کمپنی کے حکام اور انگریزوں کی بری و بحری فوج کے جرنیل اس مسئلے پر بحث کر رہے تھے کہ سرنگا پٹم پہنچنے کا آسان ترین راستہ کون سا ہے۔ سلطان ٹیپو حکومت اور فوج کا نظم و نسق درست کرنے میں مصروف تھا کہ اسے ونڈی وش کی طرف جنرل اسٹورٹ کی پیشقدمی کی اطلاع ملی۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ معلوم ہوا کہ پونانی سے جنرل میکلوڈ کی افواج بڈنور کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ انگریزوں کی تیسری فوج جنرل میتھیوز کی کمان میں تھی۔ وہ اونور کے آس پاس میلبار کے چند ساحلی مقامات پر قبضہ کر چکا تھا اور اسے کی تجویز یہ تھی کہ بڈنور کی طرف پیشقدمی کرنے سے پہلے عقب سے رسد اور کمک کے راستے محفوظ کرنے کے لیے ملیبار کے تمام ساحلی علاقوں پر قبضہ کر لیا جائے لیکن مدراس اور بمبئی کی حکومتیں بڈنور کی طرف فوری پیشقدمی کرنے کے لیے مصر تھیں اور اس کی وجہ تھی کہ بڈنور کا صوبہ میسور کی سلطنت کا زرخیز ترین علاقہ تھا اور کمپنی کو یہاں با آسانی رسد کا سامان مل سکتا تھا اور اس کے علاوہ یہ علاقہ ساحل سے زیادہ دور نہ تھا اور انگریز اپنی بحری طاقت سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے تھے بمبئی اور مدراس کی حکومتوں کو یہ یقین تھا کہ بڈنور کا زرخیز علازہ خطرے میں دیکھ کر سلطان ٹیپو کمپنی کی شرائط پر صلح کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے گا۔

سلطان ٹیپو کو بڈنور کی دفاعی قوت پا اعتماد تھا۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے انگریزوں کی ان افواج کی طرف توجہ دی جو جنرل اسٹورٹ کی کمان میں ونڈی وش کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ۱۳ فروری کو سلطان ٹیپو نے جنرل اسٹورٹ کو ونڈی وش کے قریب جا لیا فرانسیسی دستے اس کے ساتھ تھے جن کی رہنمائی کا سگنی کر رہا تھا۔ سلطان کے لشکر کی شدید گولہ باری نے جنرل اسٹورٹ کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ جنرل اسٹورٹ کی گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ اس نے ونڈی وش اور کرنگلی کے قلعے بارود سے

اڑادیے تاکہ میسور کی افواج اسلحہ اور رسد کے ذکائر سے فائدہ نہ اٹھا سکیں، کرناٹک کے میدانوں پر ایک بار پھر دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے اور جنرل اسٹورٹ کی پسپائی سے مدراس میں کمپنی کے ایوانوں میں زلزلہ آچکا تھا۔

لیکن اس عرصہ میں بدنور میں ایک غیر متوقع صورت حالات پیدا ہو چکی تھی۔ سات سمندر پار کے تاجروں کی نگاہیں ایک ایسے ملت فروش کو تلاش کر چکی تھیں جس کی غداری ان کی توپوں اور بندوقوں سے زیادہ موثر ثابت ہوئی یہ غدار حیدر علی کا لے پالک ایاز خاں تھا۔

منگلور کی بندگاہ پر کشتیوں کے ذریعے ایک چھوٹے سے جہاز پر اسلحہ اور بارود لادا جا رہا تھا۔صدیق علی خاں بندرگاہ پر ایک فوجی افسر سے باتیں کر رہا تھا۔ایک خوش پوش آدم جس کی عمر پچاس سال سے اوپر معلوم ہوتی تھی۔ہانپتا ہوا اس کے قریب آیا اور اس نے سوال کیا۔آپ کا نام صدیق علی خاں ہے؟

جی ہاں! فرمائیے۔

آپ اس جہاز کے کپتان ہیں؟

جی ہاں

یہ جہاز کنڈا ور جا رہا ہے؟

جی۔

عمر رسیدہ آدمی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔مجھے ابھی اطلاع ملی تھی۔خدا کا شکر ہے کہ وقت پر پہنچ گیا ہوں۔

صدیق علی نے کہا۔فرمائیے آپ کو مجھ سے کام ہے؟

نووارد نے جواب دیا۔ہم آپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔

معاف کیجئے ی جہاد ایک فوجی مہم پر جا رہا ہے اور مسافروں کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔

نو وارد نے اطمینان سے کہا۔میں فوجدار سے مل چکا ہوں۔وہ خود بھی یہاں آ رہے ہیں۔انہوں نے یہ کہا تھا کہ آپ ان کا انتظار کریں۔

چار کہار ایک خوبصورت پالکی اور ان کے پیچھے چند آدمی سامان کے صندوق اٹھائے نمودار ہوئے۔عمر رسیدہ آدمی صدیق علی کو حیران اور پریشان چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے کشتیوں کے قریب پالکی اور سامان اتروا دیا۔

ایک سیاہ فام عورت جو اپنے لباس سے خادمہ معلوم ہوتی تھی۔پالکی کے قریب کھڑی تھی۔فوجی افسر نے صدیق علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا سفر بہت دلچسپ رہیگا۔

صدیق علی نے کہا۔آپ کا مطلب ہے کہ یہ بڑے میاں اپنے پورے خاندان کے ساتھ میرے جہاز پر سوا ہوں گے؟

جی ہاں! اور مجھے بھی یقین ہے کہ آپ اپنے جہاز کا بہترین حصہ ان کے لیے خالی کرنا پڑے گا۔وہ دیکھیے فوجدار صاحب بھی تشریف لا رہے ہیں۔

لیکن یہ بزرگ ہیں کون؟

یہ یہاں کے ایک مشہور تاجر ہیں ان کا نام ناصر الدین ہے۔پہلے ان کا مرکز کالی کٹ تھا۔وہاں سے انگریزوں کے حملے کے باعث سخت نقصان اٹھانے کے بعد یہاں آ گئے تھے۔بدنور کے صوبیدار کے ستھ ان کے گہرے مراسم ہیں اور پچھلے دنوں میں نے سنا تھا کہ وہاں ان کے بیٹے کو فوج میں کوئی اچھی ملازمت بھی مل گئی ہے۔

منگلور کا فوجدار سیدھا صدیق کی طرف بڑھا فوجی افسر اسے سلام کرنے کے بعد ایک طرف ہٹ گیا۔

فوجدار نے صدیق علی سے مخاطب ہو کر کہا۔ میں آپ کو ایک اور ذمہ داری سونپنے آیا ہوں۔

فرمائیے!

فوجدار نے ناصر الدین کی طرف، جو کہاروں اور مزدوروں کو پیسے بانٹنے میں مصوف تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ آپ ان سے مل چکے ہیں؟

جی ہاں! لیکن میں حیران ہون کہ ان کے خاندان کے لیے میرے جہاز میں کہاں جگہ ہو گی۔

فوجدار نے کہا۔ یہ ایک مجبوری ہے۔ یہ بدنور کے گورنر کے دوست ہیں اور وہاں اپنے لڑکے کے پاس جانا چاہتے ہیں۔ گورنر نے پچھلے ہفتے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ میں انہیں جہاز پر کنڈاپور پہنچانے کا انتظام کر دوں لیکن یہ سواریوں کے جہاز کا انتظار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ میں نے انہین کہا ہے کہ فوجی جہاز پر آپ کو تکلیف ہو گی لیکن یو بضد ہیں اور اگر میں آپ کو یہ بتادوں کہ یہ بضد کیوں ہوں تو آپ یہ نہیں کہیں گے کہ فوجی جہاز پر عورتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

ایک گھنٹہ بعد جہاز کے بادبان کھولے جا چکتے تھے۔ ناصر الدین کے ساتھ اس کی بیٹی کے علاوہ ایک خادمہ اور دو نوکر تھے۔ صدیق علی نے انہیں اپنے کمرے میں جگہ دیتے ہوئے کہا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اس جہاز پر اس سے بہتر جگہ نہیں مل سکتی۔ آپ نے بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ ان دنوں بحری سفر خطے سے خالی نہیں، انگریزوں کے جنگی جہاز ہمارے ساحل کے آس پاس گھوم رہے ہیں۔

ناصر الدین نے بے اعتنائی سے جوب دیا۔ یہ ایک مجبوری ہے ورنہ میں آپ کو تکلیف نہ دیتا۔

اگلے روز شام سے کچھ دیر پہلے ناصر الدین کی لڑکی نے اسے گہری نیند سے جگایا۔ ابا جان! ابا جان!

ناصر الدین نے آنکھیں ملتے ہوئے شکایت کے لہجے میں کہا۔ بیٹی تمہیں معلوم ہے کہ گزشتہ رات مجھے بالکل نیند نہیں آئی اور اب بھی میں آدھ گھنٹہ سے زیادہ نہیں سویا۔

لڑکی نے کہا۔ ابا جان آپ پورے پانچ گھنٹے سوئے ہیں۔ دیکھیے اب شام ہو رہی ہے۔ ابا جان ملاح شور مچا رہے ہیں۔ خادمہ کہتی ہے کہ جہاز کا کپتان آنکھوں سے دوربین لگائے کھڑا تھا۔

ناصر الدین نے برہم ہو کر کہا۔ یہ کون سی نئی بات ہے جہاز کے کپتان ہمیشہ دوربین لگا کر دیکھا کرتے ہیں۔

لیکن خادمہ کہتی ہے، اس نے دور کوئی جہاز دیکھ کر ملاحوں کو خبردار رہنے کا حکم دیا ہے!۔

خادمہ کہاں ہے؟

میں نے اسے دوبارہ پتہ کرنے کے لیے بھیجا ہے خدا کے لیے آپ بھی جا کر پتہ کر آئیں۔

ناصر الدین نے کہا۔ بیٹی اگر کوئی خطرے کی بات ہوتی تو کپتان ہمیں خود آ کر بتاتا۔

صدیق علی دروازے میں نمودار ہوا اور اس نے کہا۔ آپ ذرا باہر تشریف

لائیے!

خیر تو ہے؟ ناصر الدین نے گھبرا کر اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

ناصر الدین کمرے سے باہر نکال اور صدیق علی نے اسے چند قدم دور لے جا کر کہا۔ میں آپ کی صاحبزادی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے دوپہر کے وقت ایک جاہز دیکھا تھا لیکن اس وقت وہ کافی دور تھا اور میرے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ انگریزی ہے یا فرانسیسی۔ اب اس پر انگریزوں کا جھنڈا صاف دکھائی دے رہا ہے رات آ رہی ہے۔ ہمیں چند گھنٹوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں لیکن اس بات کا بہت امکان ہے کہ صبح ہوتے ہی ہم دشمن کی توپوں کی زد میں ہوں۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کو کشتی میں ساحل پر پہنچا دیا جائے۔

نوجوان لڑکی اپنے چہرے پر نقاب ڈالے کمرے سے باہر نکلی اور اس نے کہا۔

ابا جان! کیا بات ہے؟

ناصر الدین نے جواب دیا۔ بیٹی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ جاؤ بیٹھو۔

لڑکی نے کہا۔ اگر کوئی خطرہ ہے تو میں جاننا چاہتی ہوں۔

ناصر الدین نے پریشان ہو کر صدیق علی کی طرف دیکھا اور اس نے کہا۔ دیکھئے مجھے ڈر ہے کہ صبح تک ہمارے جہاز پر انگریزی جہاز حملہ نہ کر دے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو راتوں رات ساحل پر پہنچا دیا جائے۔ ساحل یہاں سے زیادہ دور نہیں اور اس علاقے میں جگہ جگہ ہماری چوکیاں ہیں اور کسی چوکی سے بھی آپ کے لیے گھوڑوں کا بندوبست ہو سکتا ہے۔

لڑکی نے کہا۔ اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ راستے میں رکنا چاہتے ہیں تو

ہمیں اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ہم گھوڑوں پر سفر کرنے کی بجائے آپ کے ساتھ رہیں گے۔

صدیق علی نے جواب دیا میں چند منت کے لیے بھی نہیں رک سکتا۔میرا کام کنڈا پور اسلحہ پہنچانا ہے۔میں اس کشتی کا انتظار بھی نہیں کروں گا۔جو آپ کو ساحل تک پہنچانے جائے گی۔یہ جو ملاح آپ کے ساتھ جائیں گے وہ ساحل کی کسی چوکی سے خشکی کے راستے آپ کے باقی سفر کا انتظام کردیں گے۔

لڑکی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔لیکن ہم کشتی پر نہیں جائیں گے۔میں کشتی پر سوار ہونے کی بجائے جہاز پر رہنا زیادہ سمجھتی ہوں۔

صدیق علی نے کہا۔شاید میں نے آپ کے سامنے صورت حالات کا صحیح نقشہ پیش نہیں کیا۔میں نے آپ کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی ہے۔مجھے اندیشہ ہے کہ انگریزی جہاز جو میں نے دیکھا ہے تنہا نہیں ہے۔ممکن ہے کہ صبح تک ایک دو اور جہاز ہمارے مقابلے پر آجائیں۔اس صورت میں آپ کی حفاظت کا مسئلہ میرے لیے انتہائی پریشان کن بن جائے گا۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر اپنی منزل تک پہنچ جائیں لیکن میں خطرات سے چشم پوشی نہی کرسکتا۔

لڑکی نے کہا۔اس جہاز پر سوار ہوتے وقت ہمیں کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ آپ جب چاہیں ہمیں واپس منگلور پہنچادیجیے!۔

صدیق علی نے کہا۔معاف کیجئے میں آپ کے ساتھ بحث میں نہیں الجھنا چاہتا میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس جہاز میں کسی مسافر کو جگہ دینا میری غلطی تھی۔

ناصر الدین نے صدیق علی کا لب ولہجہ دیکھ کر فوری مداخلت کی ضرورت محسوس کی اور کہا۔رضیہ، کپتان صاحب ہمارے فائدے کی بات کہہ رہے ہیں۔یہ منگلور

سے ہی ہمیں اس جہاز پر جگہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

رضیہ بولی۔لیکن کپتان صاحب کو یہ حق نہیں کہ وہ ہمیں منگلور سے لا کر کسی ویران جگہ پر اتار دیں۔

ناصر الدین نے صدیق علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔کپتان صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ ہم کسی تاخیر کے بغیر بدنور پہنچنا چاہتے ہیں۔ہمارے پاس بدنور کے صوبیدار کے دو پیغامات آچکے ہیں اور انہوں نے منگلور کے قلعہ دار کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ ہمارے سفر کا فوری انتظام کر دیا جائے۔مجھے یقین ہے کہ کنڈا پور کی بندر گاہ پر میرا لڑکا ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔

صدیق علی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ایک ملاح تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔جناب معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی جہاز ہم سے کترا کر جنوب کا رخ کر رہا ہے۔

صدیق علی کچھ کہے بغیر جہاز کے عرشہ کی طرف بڑھا اور دُوربین آنکھوں سے لگا کر انگریزی جہاز کی طرف دیکھنے لگا۔تھوڑی دیر بعد اس نے مڑ کر دیکھا تو ناصر الدین اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

صدیق علی نے کہا۔معلوم ہوتا ہے کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔آپ اپنی صاحبزادی کو تسلی دیں۔

رات کے وقت ناصر الدین رضیہ سے یہ کہہ رہا تھا،۔بیٹی! تمہیں کپتان کے ساتھ اس قدر زیادتی سے پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔وہ سرنگا پٹم کے ایک نہایت معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔میں اس کے والد کا جانتا ہوں وہ میسور کا ایک قابل افسر ہے۔

رضیہ نے کہا ابا جان! میں اسے یہ بتانا چاہتی تھی کہ میں بزدل نہیں ہوں۔ جب وہ آپ کے پاس آیا تھا تو میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔ پھر جب اس نے آپ کے ساتھ علیحدگی میں بات کرنے کو کوشش کی تو میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ شاید میرے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ میں کوئی خطرناک خبر سنتے ہی چیخیں مارنا شروع کردوں گی۔ اگر وہ اپنے اختیارات کا مظاہرہ کرنے کی بجائے ہمیں نرمی سے سمجھاتا تو شاید میں کشتی پر سوار ہونے کے لیے تیار بھی ہو جاتی۔ اس کا طرز گفتگو میرے قابل برداشت تھا۔

ناصر الدین نے کہا۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا مقصد صرف اسے چڑانا تھا ورنہ تمہارا چہرہ یہ بتا رہا تھا کہ جب کشتی اتاری جائے گی تو تم مجھ سے پہلے اس میں سوار ہونے کی کوشش کرو گی اور میں بھی کہوں گا کہ اس کی گفتگو نہایت شائستہ تھی۔ بہر حال میں نے تمہاری طرف سے معذرت کر دی ہے۔

آپ نے یہی کہا ہو گا کہ میں بہت ضدی ہوں؟

نہیں! میں نے یہ کہا تھا کہ تم کشتی پر سوار ہونے سے ڈرتی ہو۔

اس کے بعد راستے میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا اور ایک دن علی الصباح صدیق علی کا جہاز کنڈاپور کی بندرگاہ میں کھڑا تھا۔ قلعے کے سپاہی اور جہاز کے ملاح کشتیوں پر سامان اتارنے میں مصروف تھے۔

رضیہ نے اپنے باپ کو جگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ابا جان! اٹھیے! شاید بندرگاہ آ گئی ہے۔

دیکھو بیٹی! مجھے تنگ نہ کرو۔ باپ نے یہ کہتے ہوئے کروٹ بدلی اور دوبارہ سو گیا۔

رضیہ نے دوبارہ اس کا بازو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ابا جان دیکھیے! شاید کنڈاپور آ گیا ہے۔

باپ نے ملتجی ہو کر کہا۔خدا کے لیے مجھے سونے دو کنڈاپورا بھی بہت دور ہے۔

رضیہ مایوس ہو کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

صدیق علی عرشہ پر کھڑا سامان اتارنے والے سپاہیوں اور ملاحوں کو ہدایات دے رہا تھا۔رضیہ کچھ دیر اس سے چند قدم دور کھڑی بندرگاہ کی طرف دیکھتی رہی۔ آنکھوں کے سوا اس کا قی چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔صدیق علی نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور بے توجہی سے منہ پھیر لیا۔ جہاز پہلی گفتگو کے بعد وہ حتی الوسع اس سے دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔رضیہ کچھ دیر تذبذب کی حالت میں کھڑی رہی۔ بالآخر جرات کر کے آگے بڑھی اور صدیق علی کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ یہ کنڈاپور ہے؟

جی ہاں! ہم رات کے تیسرے پہر یہاں پہنچ گئے تھے۔

کوئی ہمارے متعلق پوچھنے نہیں آیا؟ مجھے یقین ہے کہ میرا بھائی ضرور آیا ہوگا۔

ممکن ہے آپ کا بھائی بندرگاہ پر کہیں ٹھہرا ہوا ہو۔میرا خیال ہے کہ کسی کو اس جہاز پر آپ کی آمد کی توقع نہیں ہوسکتی۔

رضیہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔خدا کا شکر ہے کہ ہم خیریت سے پہنچ گئے، ورنہ آپ تو ہمیں راستے میں ہی دکھا دینے پر آمادہ تھے۔

صدیق علی نے کہا۔بعض فرائض بہت ناخوشگوار ہوتے ہیں اور یہ ان سے ایک تھا، بہر حال مجھے خوشی ہے کہ آپ تکلیف سے بچ گئیں۔اب آپ تیاری کریں آپ کے لیے کشتی تیار ہے۔میں نے قلعہ دار کو آپ کی آمد کی اطلاع بھیج دی ہے۔

شاید وہ آپ کے استقبال کے لیے پہنچ جائے۔

رضیہ نے کہا۔اس دن شاید آپ کو میری باتیں ناگوار محسوس ہوئی تھیں۔میرا یہ ارادہ تھا کہ کنڈا پور پہنچ کر آپ سے معذرت کروں گی۔

صدیق علی نے بے پروائی سے جواب دیا۔باتوں میں شاید میں نے بھی آپ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی۔کاش مجھے معلوم ہوتا کہ آپ شام کے وقت کشتی پر سوار ہونے سے ڈرتی ہیں۔

جی یہ بالکل غلط ہے۔رضیہ نے کہہ کر صدیق علی سے زیادہ اپنے باپ کو کوستی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔تھوڑی دیر بعد وہ ناصر الدین کو بازو سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر یہ کہہ رہی تھی۔ابا جان! آپ نے اس نیم پاگل آدمی سے یہ کیوں کہا تھا کہ میں کشتی پر سوار ہونے سے ڈرتی ہوں؟

ناصر الدین نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔معلوم ہوتا ہے آج تم مجھے بالکل نہیں سونے دو گی۔

تھوڑی دیر بعد ناصر الدین رضیہ اور ان کی خادمہ اور نوکر ایک کشتی پر سوار ہو کر بندرگاہ کا رخ کر رہے تھے۔اور صدیق علی خاں ان کے پیچھے دوسری کشتی میں سوار تھا۔دونوں کشتیاں ایک ساتھ ساحل پر لگیں۔کنڈا پور کا قلعہ دار چند افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر پہلے ناصر الدین اور پھر رضیہ کو سہارا دے کر کشتی سے اتارا۔قلعہ دار، صدیق علی سے مصافحہ کرنے کے بعد ناصر الدین کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے کہا۔ہم نے آپ کے سفر کا انتظام کر دیا ہے۔چلیے پہلے قلعہ میں ناشتا کر لیجیے۔

ناصر الدین نے صدیق علی کو اس نوجوان کی طرف جو چند قدم پیچھے رضیہ کے

پاس کھڑا تھا متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ کپتان صاحب یہ میرا بیٹا افتخار الدین ہے۔

افتخار الدین نے آگے بڑھ کر گرمجوشی کے ساتھ صدیق علی سے مصافحہ کیا۔

قلعہ دار نے اپنے سپاہیوں سے کہا۔ ان کا سامان قلعے میں لے چلو۔

افتخار الدین نے قلعہ دار سے کہا۔ لیکن ہم کھانا کھاتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔

ناصر الدین نے احتجاج کیا۔ نہیں نہیں! کھانا کھانے کے بعد میں آرام کروں گا۔ اب ہمیں کوئی جلدی نہیں۔

سپاہیوں نے سامان اٹھالیا اور ناصر الدین اور اس کے ساتھی ان کے پیچھے قلعے کی طرف چل دیئے۔

قلعہ دار نے صدیق علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ انہیں لے آئے۔ صوبیدار صاحب مجھ سے بہت برہم تھے۔ چند دن قبل انہوں نے یہ حکم بھیجا تھا کہ انہیں لانے کے لیے ایک کاص جہاز بھیج دیا جائے۔ بدقسمتی سے یہاں کوئی جہاز موجود نہ تھا۔ پھر ان کا دوسرا حکم آیا کہ منگلور کے فوجدار کو ان کے سفر کا انتظام کرنے کا حکم بھیجا جا چکا ہے، اس لیے یہاں سے کسی جہاز بھیجنے کی ضرورت نہیں ان کا صاحبزادہ ایک ہفتے سے ان کا یہاں انتظار کر رہا تھا لیکن صبح ان کا تیسرا حکم آیا کہ اب سمندر کا راستہ خطرناک ہے، اگر وہ پہنچ نہیں گئے تو تم خشکی کے راستے چند سپاہی بھیج کر منگلور کے فوجدار کو یہ ہدایت کر دو کہ انہیں سمندر کے بجائے خشکی کے راستے بھیجنے کا انتظام کیا جائے اور میں نے یہ حک ملتے ہی چند سوار منگلور کی طرف روانہ کر دیئے تھے۔

صدیق علی نے کہا گورنر صاحب ایک باخبر آدمی ہیں۔ بحری سفر کے متعلق ان

کے خدشات بلاوجہ نہیں تھے۔میں نے راستے میں ایک انگریزی جہاز دیکھا تھا آپ کو چوکس رہنا چاہیے۔

ایک نوجوان ہجوم سے نکل کر۔بھائی جان، بھائی جان! کہتا ہوا صدیق علی کی طرف بڑھا اور صدیق علی نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔مسعود تم کب یہاں آئے!

بھائی جان! میں تین دن سے یہاں ہوں۔ہمیں اس قلعے کے آس پاس کی دفاعی چوکیوں کی حفاظت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ہمارے دستے یہاں سے دو میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔اگر آپ اس وقت فارغ ہوں تو میرے ساتھ چلیے، چچا زاسد خاں آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

وہ یہاں ہیں؟

ہاں بھائی جان! اور جب میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ وہ ہمارے کماندار ہیں تو آپ اور زیادہ حیران ہوں گے، چلیے میں آپ کو ان سے ملاتا ہوں۔

صدیق علی نے کہا ابھی جہاز پر دو توپیں رہ گئی ہیں۔میں انہیں اتروانے کے بعد تمہارے ساتھ چلوں گا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد جب توپیں اتار کر ساحل پر پہنچا دی گئیں تو صدیق علی نے قلعہ دار سے مخاطب ہو کر کہا۔اب جہاز پر غلہ لدوانا آپ کی ذمہ داری ہے میں کل صبح ہونے سے پہلے یہاں سے روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔

قلعہ دار نے کہا۔غلے کے لیے چند دن آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔

صدیق علی نے کہا۔لیکن منگلور کے فوجدار نے مجھے فوراً واپس پہنچنے کا حکم دیا تھا۔آپ کو ان کی ہدایات موصول نہیں ہوئیں؟

ان کی ہدایات موصول ہو چکی ہیں لیکن مجھے بدنور کے صوبہ کا حکم ہے کہ ان کی اجازت حاصل کیے بغیر یہاں سے کوئی چیز نہ بھیجی جائے۔ میں نے منگلور کے فوجدار کا مراسلہ ان کی خدمت میں بھیج دیا تھا لیکن ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔ چلیے آپ قلعے میں قیام کریں۔ مجھے امید ہے کہ آج یا کل تک ان کی طرف سے جواب آ جائے گا۔

صدیق علی نے جواب دیا۔نہیں میری جگہ جہاز میں ہے، میں اب اسد خاں سے ملنے جا رہا ہوں۔چلو مسعود!

مسعود علی نے کہا۔ بھائی جان! میں پیدل آیا ہوں لیکن اگر آپ چاہیں تو قلعے سے گھوڑوں کا انتظام ہو سکتا ہے۔

نہیں! میں پیدل چلنا چاہتا ہوں۔

صدیق علی اور مسعود سمندر کے کنارے چند دفاعی چوکیوں کے قریب سے گزرنے کے بعد دائیں ہاتھ مڑے اور کوئی دو میل چلنے کے بعد محفوظ فوج کے پڑاؤ میں داخل ہوئے۔

اسد خاں اپنے خیمے سے باہر چہل قدمی کر رہا تھا وہ اچانک صدیق علی کی طرف متوجہ ہوا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ارے تم کہاں؟

جی میں منگلور سے اسلحہ لے کر آج ہی پہنچا ہوں۔ابھی مسعود نے بتایا کہ آپ یہاں ہیں اور میں حیران ہوں کہ۔۔۔۔

اسد خاں بولا۔کہو کیا بات ہے تم خاموش کیوں ہو گئے؟

کچھ نہیں چچا جان!

اسد خان مسکرایا۔برخوردار تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس عمر میں ایک سپاہی کا لباس

مجھے عجیب معلوم ہوتا ہے۔

صدیق علی نے کہا۔نہیں چچا جان، میں دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ میسور کو جنگ کے میدان سے باہر آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔

اسد خاں نے کہا۔ مجھے ہنگامی حالات میں صرف خانہ پُری کے لیے بھیجا گیا ہے۔

صدیق علی نے کہا۔ چچا جان! یہ آپ کی کسر نفسی ہے میں جانتا ہوں کہ چند سال قبل میسور کی فوج کے بہترین افسر آپ کی فوجی صلاحیتوں کے معترف تھے۔

اسد خان بولا۔ بیٹا! یہ ان دنوں کی بات ہے جب میری لوگوں میں خون تھا۔ اب خدا سے دعا کرو کہ میں اپنے آپ کو اس ذمہ دری کا اہل ثابت کر سکوں۔

چچا جان! آپ ہر ذمہ داری کے اہل ہیں اور مجھے صرف آپ کی ذات کے لیے دعا کرنی چاہیے۔

اسد خاں نے کہا۔فوج میں رہ کر میری صحت ٹھیک ہو جائے گی۔تم کب تک یہاں ہو؟

میں کل علی الصباح یہاں سے واپس جانا چاہتا تھا لیکن اب شاید ایک دو دن ٹھہرنا پڑے۔

صدیق علی نے باقی دن اسد خاں اور اپنے بھائی کے ساتھ پڑاؤ میں گذارا غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے جب اس نے اسد خاں سے اپنے جاہز پر واپس جانے کی اجازت لی تو مسعود اسے ساحل تک پہنچانے کے لیے اس کے ساتھ ہو گیا۔

قلعے کے قریب سے گزرتے ہوئے انہیں افتخار الدین بندرگاہ کی طرف سے

آتا ہوا دکھائی دیا۔وہ ہاتھ سے اشارہ کرنے کے بعد تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔میں جہاز پر آپ کو تلاش کرنے گیا تھا۔

کیوں خیر تو ہے؟ میرا خیال تھا کہ آپ یہاں سے روانہ ہو چکے ہوں گے۔

میں تو اسی وقت روانہ ہونا چاہتا تھا لیکن ابا جان آج سفر کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔اب ہم انشاء اللہ کل علی الصباح روانہ ہو جائیں گے۔ابا جان کی خواہش ہے کہ آپ آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔

افتخار الدین نے کہا ہم آپ کو بہت جلد فارغ کر دیں گے۔چلیے ابا جان کہتے تھے کہ میں آپ کو اپنے ساتھ لے کر آؤں۔

صدیق علی نے مسعود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔یہ میرا بھائی مسعود علی ہے۔

افتخار الدین نے مسعود علی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔میرا نام افتخار الدین ہے۔میں نے آپ کو یہاں دو تین بر بندرگاہ پر دیکھا ہے، آیئے آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ابا جان ! آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

مسعود علی نے جواب دیا۔لیکن مجھے واپس اپنے پڑاؤ میں جانا ہے۔

افتخار الدین نے کہا۔میں آپ کو اپنے نوکر کے ساتھ گھوڑا دے کر بھیج دوں گا۔

افتخار الدین کے اصرار پر مسعود اس کی دعوت میں شریک ہونے سے انکار نہ کر سکا۔

تھوڑی دیر بعد یہ تینوں قلعے کے ایک کمرے میں ناصر الدین کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔رضیہ برابر کے کمرے میں نیم وا دروازے کے آڑ میں کھڑی تھی۔افتخار الدین اور مسعود علی پہلی ملاقات میں ہی یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ ایک

دوسرے کومدت سے جانتے ہیں۔

ناصرالدین کا ایک نوکر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔قلعہ دار صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔وہ دروازے پر کھڑے ہیں۔

ناصرالدین نے اٹھتے ہوئے کہا۔انہیں اندر لے آؤ۔

نوکر باہر نکل گیا اور چند ثانیہ کے بعد قلعہ دار کمرے میں داخل ہوا صدیق علی مسعود علی اور افتخارالدین اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

قلعہ دار نے کہابڑ نور سے صوبیدار صاحب کا ایلچی ابھی پہنچا ہے۔انہوں نے تاکید کی ہے کہ اگر آپ پہنچ گئے ہوں تو آپ کو فوراً یہاں سے روانہ کر دیا جائے۔

ناصرالدین نے کہا تشریف رکھیے! ہم انشاءاللہ علی الصباح روانہ ہو جائیں گے۔

میرا خیال تھا کہ آپ کھانا کھانے کے بعد فوراً روانہ ہو جاتے تو اچھا تھا۔

ناصرالدین نے جواب دیا صوبیدار صاحب کو شاید اس بات کا احساس نہیں کہ رات خدا نے آرام کے لیے بنائی ہے۔

قلعہ دار نے کہا۔ جناب! صوبیدار صاحب یہ محسوس کرتے ہیں کہ ساحلی علاقے ہر وقت خطرے میں ہیں اور یہاں آپ کا قیام ٹھیک نہیں۔

ناصرالدین نے کہا۔ یہ قلعہ جہاز نسبت بہر حال زیادہ محفوظ ہے اور صوبیدار صاحب کو تو اس بات کا علم بھی نہیں ہوگا کہ ہم یہاں پہنچ گئے ہیں۔

لیکن انہیں آپ کی آمد کی توقع تھی نا؟

بہر حال رات کے وقت سفر کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور اگر آپ کو اس قلعے میں ہمارا ٹھہرنا پسند نہیں تو ہم پڑاؤ میں جانے کے لیے تیار ہیں۔

جناب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اگر آپ حکم دیں تو میں سارا قلعہ آپ کے لیے خالی کرادوں۔

صدیق علی نے سوال کیا۔صوبیدار صاحب کا ایلچی غلے کے متعلق بھی کوئی پیغام لیا ہے؟

نہیں غلے کے متعلق انہوں نے کچھ نہیں لکھا پریشانی کی کوئی بات نہیں۔بہت ممکن ہے کل ان کا حکم آجائے۔اگر کل نہیں تو پرسوں ضرور آجایئگا۔

کچھ دیر بعد یہ لوگ قلعے کے ایک اور وسیع کمرے میں چند افسروں کے ساتھ کھانا کھارہے تھے۔سدتر خوان پر ناصرالایدن کی گفتگو انتہائی شگفتہ تھی لیکن قلعہ دار کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ناصرلدین نے کوئی لطیفہ سنانے کے بعد قلعہ دار سے سوال کیا۔

آپ بہت مغموم نظر آتے ہیں خیر تو ہے؟

جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

کھانا کھانے کے بعد ناصرالدین اور اس کا لڑکا صدیق علی اور اس کے بھائی کو رخصت کرنے کے لیے قلعے کے دروازے تک آئے۔مسعود علی کے لیے افتخار الدین کا ایک نوکر گھوڑا لیے کھڑا تھا۔

ناصرالدین نے صدیق علی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ہم علی الصباح روانہ ہوجائیں گے اس لیے آُ سے ملاقات نہیں ہوسکے گی۔تاہم مجھے یقین ہے کہ ہماری یہ ملاقات آخری نہیں ہوگی۔

رات کے تیسرے پہر صدیق علی توپوں کی دھنادھن اور ملاحوں کی چیخ پکار سن

کر گہری نیند سے بیدار ہوا۔ وہ بھاگتا ہوا جہاز کے عرشے پر پہنچا۔ اس کا جہاز جنوب اور مغرب سے دو جہازوں کی گولہ باری کی زد میں تھا۔ اسے شمال سے بھی توپوں کے دھماکے سنائی دے رہے تھے۔

ایک ملاح بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔ ہمارا جہاز دشمن کی توپوں کی زد میں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ شمال کی ساحلی چوکیوں پر بھی گولہ باری کر رہے ہیں۔

صدیق علی نے جہاز کا لنگر اٹھانے اور بادبان کھولنے کا حکم دیا لیکن ایک گولہ جہاز کے مستول پر آ کر لگا اور وہ ٹوٹ کر گر پڑا۔ صدیق علی کے جہاز پر پانچ چھوٹی توپیں نصب تھیں۔ اس نے جوابی گولہ باری کا حکم دیا لیکن دشمن کے دو بڑے جنگی جہاز جو دور مار توپوں سے کام لے رہے تھے ان کی زد سے باہر تھے۔ دس منٹ کے اندر اندر صدیق علی کے جہاز میں شگاف پیدا ہو چکے تھے۔

ایک ملاح چلایا۔ جہاز ڈوب رہا ہے۔

ملاحوں کو سمندر میں کودنے کا حکم دینے کے بعد صدیق علی نے ساحل کی طرف دیکھا اور ایک ثانیہ کے لیے اس کے خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ قلعے کی توپیں خاموش تھیں اور اس کے ایک بُرج پر مشعلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ساحلی چوکیوں پر گولہ باری کرنے والی توپوں کے شعلے رات کی تاریکی میں ایک خوفناک منظر پیدا کر رہے تھے صدیق علی نے ڈوبتے ہوئے جہاز سے چھلانگ لگائی اور ساحل کی طرف تیرنے لگا وہ حیران تھا کہ قلعے والی شعلوں کی رہنمائی کے باوجود دشمن کی توپوں کا ہدف ابھی تک قلعے کی بجائے قلعے کی بجائے اس کا ڈوبتا ہوا جہاز ہے۔

اس کے چند ساتھی کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ اس نے کہا تم یہیں ٹھہر کر باقی

ساتھیوں کا انتظار کرو۔ جب وہ کنارے پر پہنچ جائیں تو تم سب شمال کی ساحلی چوکیوں کی طرف آجاؤ۔ چوکیوں کے عقب میں محفوظ دستوں کا پڑاؤ ہے میں وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔

ایک ملاح نے کہا۔ آپ اتنی دور پڑاؤ کی طرف جانے کی بجائے قلعے کی طرف کیوں نہیں جاتے۔ دیکھیے بُرج پر مشعلیں جل رہی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قلعے کی فوج بھنگ پی کر سو گئی ہے۔

صدیق علی نے جواب دیا مجھے یقین ہے کہ قلعے کے محافظ ساری رات نہیں سوئے۔ وہ دشمن کی آمد کی خوشی میں چراغاں کرر ہے ہیں۔ اب تمہارے لیے قلعے کا دروازہ نہیں کھلے گا۔ یہ اس وقت کھلے گا جب دشمن کی فوج قلعے کا قبضہ لینے کے لیے پہنچ جائے گی۔

اگر آپ پڑاؤ کی طرف جا رہے ہیں تو چند آدمی اپنے ساتھ لیتے جائیں! بہت اچھا! تم میں سے دو آدمی جو تیز بھاگ سکتے ہیں۔ میرے ساتھ آجائیں۔ رات کی تاریکی میں افق پر توپوں کی شعلہ باری صدیق علی کی رہنمائی کر رہی تھی۔ حفاظت کے لیے پہنچ چکے ہیں صدیق علی پڑاؤ کا رخ کرنے کا خیال ترک کر کے اسد خان کو تلاش کرنے کے ارادے سے اگلی چوکیوں کی طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے اور دائیں بائیں گولے گر رہے تھے۔ اس کے دو ساتھی ہمت ہر کر ایک قریب کے مورچے میں پناہ لے چکے تھے۔ وہ ہر مورچے کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں پکارتا۔ کماندار کہاں ہیں؟ جواب میں اسے بدحواس سپاہیوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ کماندار ابھی یہاں تھے۔ کماندار صاحب گھوڑے پر آگے نکل گئے ہیں۔

صدیق علی نے پانچویں چوکی کے قریب پہنچ کر اپنا سوال دہرایا۔ تو تاریکی میں

اسے مسعود علی کی آواز سنائی دی ۔ بھائی جان! بھائی جان! کمانداار صاحب اگلے مورچے میں ہیں وہ زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑے تھے ۔

مسعود, مسعود! صدیق علی نے آگے بڑھ کر اس کا بزو پکڑتے ہوئے کہا ۔

مجھے ان کے پاس لے چلو! ۔

وہ بھاگتے ہوئے اگلے مورچے مں داخل ہوئے اسد خان زمین پر لیٹا ہوا تھا اور چند افسر اور سپاہی اس کے گرد جمع تھے ۔

چچا جان! صدیق علی نے اس کے قریب بیٹھ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اسد خان نے نحیف آواز میں کہا۔ کون ۔۔! صدیق علی ! ۔۔ تم یہاں !! لیکن تمہارا جہاز؟

میرا جہاز ڈوب ہو چکا ہے آپ کے زخم زیادہ شدید تو نہیں؟

میرے زخموں کی پروانہ کرو۔ میری منزل آ چکی ہے ۔

صدیق علی نے کہا ۔ چچا جان! ان حالات میں فوج کو آگے لانے کی بجائے پیچھے ہٹانے کی ضرورت تھی ۔

اسد خان نے جوب دیا ۔ ان چوکیوں کی حفاظت کرنا میرا فرض تھا ۔

صدیق علی نے کہا ۔ ان چوکیوں کے سپاہی دور مار توپوں کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے اور وہ آپ کے پاس نہیں ہیں ۔

اسد خان نے کہا ۔ ہمارے پاس چار بڑی توپیں تھیں اور وہ میں نے قلعہ دار کے اصرار پر یہاں پہنچتے ہی قلعہ کے اندر بھجوا دی تھیں ۔ تم لوگوں کو میرے گرد جمع ہونے کی ضرورت نہیں اب تمہارا کام یہ ہے کہ دشمن کو رات کے وقت ساحل پر اترنے کا موقع نہ دو ۔

صدیق علی نے کہا ۔ چچا جان! دشمن اس جگہ فوجیں نہیں اتارے گا ۔ وہ جانتا

ہے ہے کہ قلعے کے آس پاس کا علاقہ اس کیلئے کہیں زیادہ محفوظ ہے۔

اسد خان نے کہا تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

صدیق علی نے جواب دیا۔جب دشمن کے جہاز ہمارے جہاز پر گولہ باری کر رہے تھے۔تو قلعے کی توپیں خاموش تھیں۔صرف یہی نہیں بلکہ قلعے کے محافظ بُرجوں سے مشعلیں دکھا کر یہ بتا رہے تھے کہ ہم یہاں ہیں۔اس لیے تمہاری توپوں کا رخ دوسری طرف ہونا چاہیے۔

اسد خان نے اچانک اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن درد سے کراہتا ہوا دوبارہ لیٹ گیا اور قدرے توقف کے بعد بولا۔صدیق علی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ تمہارا مشورہ کیا ہے۔

صدیق علی نے کہا۔مجھے یقین ہے کہ ان مورچوں پر دشمن کی گولہ باری محض ایک دکھاوا ہے۔وہ صبح کے وقت اطمینان سے قلعے کے آس پاس فوجیں اتار دے گا اگر آپ کنڈاپور کو بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں صبح سے پہلے قلعے پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ آپ پڑاؤ میں سوار دستوں کو یہ حکم بھیج دیجئے کہ اس طرف ابھی ان کی ضرورت نہیں۔وہ دشمن کے جنگی بیڑے کی توپوں کی زد سے دور رہیں۔پھر اگر دشمن نے کسی جگہ فوج اتار دی تو نہیں کام میں لایا جا سکے گا۔

اسد خان نے کہا۔صدیق میرا وقت آ چکا ہے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ قدرت نے تمہیں بلا وجہ نہیں بھیجا جب تک یہاں میری جگہ لینے کے لیے کوئی اور نہیں آ جاتا میں اس فوج کی کمان تمہیں سونپتا ہوں۔

چچا جان! مجھے یقین ہے کہ آپ اچھے ہو جائیں گے۔ یہ کہہ کر صدیق علی سپاہیوں کی طرف متوجہ ہوا انہیں پڑاؤ کے پیچھے کسی محفوظ جگہ لے جاؤ۔ یہ جگہ محفوظ

نہیں ہے۔

اسد خان نے نحیف آواز میں کہا۔ بیٹا تم وقت ضائع نہ کرو۔ اب میرے لیے کوئی جگہ غیر محفوظ نہیں۔

سپاہی اسد خاں کو تختے پر ڈال کر اٹھانے لگے تو کسی نے کہا۔ جلدی سے لاؤ یہ بے ہوش ہیں۔

فوجی طبیب نے جلدی سے نبض ٹٹولی اور پھر جُھک کر تھوڑی دیر اس کے سینے سے کان لگانے کے بعد کہا، اب انہیں پانی پلانے کی ضرورت نہیں۔

صدیق علی نے ڈیڑھ سو سپاہیوں کو ساحلی چوکیوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر محفوظ فوج کے ایک ہزار سپاہیوں کو قلعے کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ صبح کی روشنی کے ساتھ دشمن کے جنگی بیڑے کی گولہ باری بند ہو چکی تھی۔ صدیق علی کی رہنمائی میں یہ فوج قلعے کے قریب پہنچی تو بُرج پر سفید جھنڈا دکھائی دیا۔ صدیق علی نے دروازے کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں کہا۔ دروازہ کھولو!۔

کچھ دیر بعد جواب ملا۔ پھر بڑے پھاٹک کی بجائے بغلی دروازہ کھلا اور صدیق علی کی توقع کے خلاف قلعہ دار نے باہر نکل کر کہا۔ تمہارے کماندار کہاں ہیں۔ ؟

قلعہ دار نے جواب دیا۔ آپ مجھ سے اس قسم کے سوالات پوچھنے کا حق نہیں رکھتے تاہم آپ کی تسلی کے لیے یہ بات کافی ہونی چاہیے کہ میں نے اپنے بڑوں کی ہدایات پر عمل کیا ہے۔

اور حملے کے وقت آپ نے قلعے کے برجوں پر جو روشنی کی تھی وہ بھی غالباً کسی بڑے کی ہدایت کے مطابق تھی؟

ہاں!

میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ بڑا کون ہے؟

اس وقت اس سوال کا جواب میں صرف فوج کے کماندار کو دے سکتا ہوں ۔ تمہارا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ۔

صدیق علی نے کہا۔اس وقت میں اس فوج کا کماندار ہوں ۔

اگر آپ اس فوج کے کماندار ہیں تو آپ کے لیے بدنور کے گورنر کا یہ حکم ہے کہ آپ فوج کو یہاں سے نکال کر حیدرگڑھ پہنچ جائیں ۔وہاں آپ کو مزید ہدایات مل جائیں گی ۔

میں بدنور کے گورنر سے تصدیق کیے بغیر کوئی نیا قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہون ۔اس فوج کو کنڈا پور کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے ۔اور کنڈا پور کی حفاظت ہم اس وقت تک کریں گے جب تک کہ دشمن اس قلعے کی دیواریں زمین سے ہموار نہیں کر دیتا۔

قلعہ دار کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا اور اس نے کہا۔اس قلعے کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں ۔اس کی حفاظت کے متعلق سوچنا ہمارا کام ہے ۔

اور تم نے اس کی حفاظت کا جو نیا طریقہ اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب رات ہو تو قلعے کے بُرجوں پر روشنی کر دی جائے اور جب صبح ہو جائے تو سفید جھنڈ الہرا دیا جائے ؟

میں نے جو کچھ کیا ہے میں اس کی پوری ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار ہوں ۔ہمیں حکم تھا کہ خطرے کے سقت یہ قلعے خالی کر دیا جاے ۔

اور تمہیں یہ بھی حکم تھا کہ خطرے کے وقت دشمن کو یہ بتا دیا جائے کہ تمہارا مقابلہ

کرنے والی فوج باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔

میرا فرض اپنے سپاہیوں کو بلاوجہ ہلاک ہونے سے بچانا تھا لیکن تم جیسے گستاخ آدمی سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تمہارے نزدیک ان سپاہیوں کی زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی تو تمہیں اس بات کی آزادی ہے کہ تم سینہ تان کر دشمن کی توپوں کے سامنے کھڑے ہو جاؤ لیکن مجھے حیدر گڑھ پہنچنے کی ہدایات موصول ہو چکی ہیں۔

یہ کہہ کر قلعے دار دروازے کی طرف پلٹا لیکن صدیق علی نے اچانک آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا اور میان سے تلوار نکال کر اس کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا

تم قلعے کے اندر نہیں جا سکتے۔

ایک ثانیہ کے اندر اندر پہرے داروں نے قلعے کا بغلی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

قلعہ دار نے کہا۔ ”تمہیں شاید معلوم نہیں کہ تمہارے سپاہی اس وقت ہماری گولیوں کی زد میں ہیں۔ اگر تم فصیل کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی تکلیف کرو تو تمہاری بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔“

صدیق علی نے کہا۔ ”تم یہ دیکھنے کے لیے موجود نہیں ہو گے کہ ہماری غلط فہمیاں کس حد تک دور ہوئی ہیں۔ اگر ایک منٹ کے اندر اندر قلعے کا دروازہ نہ کھلا تو میری تلوار تمہارے سینے سے پار ہو گی۔“

قلعہ دار نے صدیق علی الفاظ سے زیادہ اس کی تلوار کی نوک کا دباؤ اپنے سینے پر محسوس کیا اور اس نے کسی توقف کے بغیر بلند آواز میں کہا۔ ”دروازہ کھول دو۔“

درازہ کھل گیا اور صدیق علی اپنے ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ قلعے کے اندر

داخل ہو گیا۔ قلعے کے سپاہی پریشانی اور تذبذب کے عالم میں یہ تماشا دیکھ رہے تھے صدیق علی نے بلند آواز میں کہا۔ ''جس ملک کی فوج میں غدار موجود ہوں اس کے آہنی قلعے بھی محفوظ نہیں ہوتے۔ میرے دوستو! اس قلعے کا محافظ دشمن کے ساتھ مل گیا ہے۔ میسور کی فوج تمہاری اور تمہاری آنے والی نسلوں کی عزت اور آزادی کی جنگ لڑ رہی ہے۔ میسور کی فتح اس ملک کے ہر اس باعزت انسان کی فتح ہو گی جو ایک باعزت قوم کے فرد کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتا ہے اور اگر خدانخواستہ میسور کو شکست ہوئی تو اس کے نتائج صرف میسور کی سرحدوں تک محدود نہیں رہیں گے۔ بلکہ ہندوستان کا ہر حریت پسند یہ محسوس کرے گا کہ اس کے لیے عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کے امکانات ختم ہو چکے ہیں۔ تمہارے قلعہ دار کو دشمن کے حملے کا قبل از وقت علم تھا اور اس نے دشمن کے استقبال کے لیے قلعے پر چراغاں کیا تھا۔ اس کی بزدلی اور غداری کے باعث ہمارے کئی آدمی شہید ہو چکے ہیں۔ کاش میں ہر غدار کو قلعے کے دروازے پر چالیس بار پھانسی دے سکتا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم میں سے اور کون ہیں جو اس سازش میں شریک ہیں۔''

قلعے کے سپاہیوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

صدیق علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم دشمن کے خلاف جنگ میں ہمارا ساتھ دینا چاہتے ہو یا بزدلوں اور غداروں کی موت مرنا چاہتے ہو؟''

صدیق علی نے کہا۔ ''اس قلعے میں اسلحہ کی کمی نہیں، بارود کا ذخیرہ جو میں لایا تھا، اتنا ہے کہ ہم کم از کم ایک ہفتہ دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس عرصہ میں یقیناً کمک پہنچ جائے گی۔''

ایک نوجوان افسر نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”ہم آپ کے ساتھ جان دینے کے لیے تیار ہیں لیکن پاس جو بارود ہے وہ ایک دن کے لیے بھی کافی نہیں۔ آپ جو بارود اپنے جہاز پر لائے تھے وہ رات کے حملے سے پہلے ہی سمندر میں پھینک دیا گیا تھا۔ قلعہ دار دشمن کے ساتھ ساز باز کرنے کے بعد ہماری طرف سے مطمئن نہ تھا، اسے یہ خدشہ تھا کہ ہم کہیں اس کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ یہ شخص کنڈا پور کی قسمت کا فیصلہ دشمن کی آمد سے پہلے ہی کر چکا تھا۔ اسے لے جاؤ اور قلعہ سے باہر کسی درخت کے ساتھ لٹکا دو!“

صدیق علی کے اشارے سے چند سپاہیوں نے اپنی سنگینیں قلعہ دار کی طرف سیدھی کر دیں اور اسے باہر نکلنے کے لیے کہا۔

قلعہ دار چلایا۔ ”بڈنور کا گورنر میرے بدلے تم میں سے ہر ایک کو پھانسی پر لٹکا دے گا۔ میں نے اس کے احکام کی تعمیل کی ہے۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ میرا معاملہ اس کے سپرد کر دیا جائے۔ خدا کے لیے کسی آدمی کو بھیج کر میرے متعلق ان سے پوچھ لو۔ ورنہ مجھے بڈنور بھیج دو۔“

صدیق علی نے کہا۔ ”اگر تم بڈنور کے صوبیدار کے بھائی ہوتے تو بھی اس غداری کے بعد میں تمہارے متعلق کسی تحقیقات کی ضرورت محسوس نہ کرتا۔ اگر تم سلطان معظم کے بھائی ہوتے تو بھی تمہارے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا۔“

ناصر الدین، افتخار الدین اور رضیہ اپنے اپنے کمروں سے نکل کر انتہائی پریشانی کی حالت میں یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ افتخار الدین سپاہیوں کو راستے سے ہٹاتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے کہا۔ ”بھائیو! یہ شخص جھوٹ بولتا ہے، اس نے اس شخص کے خلاف غلط بیانی کی ہے جسے حیدر علی اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔ اس کے لیے کوئی سزا

کافی نہیں ہوسکتی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اس کی سازش میں جو افسر یا سپاہی شریک ہیں۔ ان سب کو پھانسی دے دی جائے۔"

صدیق علی نے کہا۔"افتخار میں اس معاملے کی پوری چھان بین کروں گا لیکن اس وقت ہمارے سامنے فوری مسئلہ اس قلعے کی حفاظت ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں تم دوبارہ جنگ شروع ہونے سے پہلے اپنے والد اور ہمشیرہ کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ۔"

افتخار الدین نے جواب دیا۔"میں ایک سپاہی ہوں اور میرے ابا اور ہمشیرہ بھی یہ پسند نہیں کریں گے کہ میں میدان چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ میرے ساتھ جو دس آدمی آئے تھے وہ انہیں بدنور پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔"

صدیق علی نے آگے بڑھ کر ناصر الدین سے کہا۔"میں چاہتا ہوں کہ آپ وقت ضائع نہ کریں۔ آپ بدنور پہنچ کر گورنر کو میرا یہ پیغام دیجئے کہ کنڈاپور کی فوج آخری دم تک دشمن کا مقابلہ کرے گی۔"

ناصر الدین نے کہا۔"میں وہاں پہنچتے ہی آپ کو کمک بھجوانے کی کوشش کروں گا۔"

تھوڑی دیر بعد قلعے کے دروازے سے باہر افتخار الدین اپنے باپ اور اپنی بہن کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ سامنے ایک درخت پر قلعہ دار کی لاش لٹک رہی تھی۔

رضیہ نے گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد اپنی آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا"بھائی جان! اپنا خیال رکھنا"۔

فصیل سے ایک سپاہی نے بلند آواز میں کہا۔"سامنے دو جہاز کشتیوں پر فوج اتار رہے ہیں اور شمال مغرب سے چار اور جہاز اس طرف آرہے ہیں۔"

صدیق علی نے کہا۔ ”سپاہیو! اپنے مورچے سنبھال لو۔ سفید جھنڈا اتار دو اور قلعے کا دروازہ بند کر لو“۔

افتخار الدین نے کہا۔ ”انگریز لڑائی سے زیادہ چال اور دغا بازی پر بھروسا کرتے ہیں۔ ہمیں سفید جھنڈا اس وقت اتارنا چاہیے جب ان کی کشتیاں ہماری توپوں کی زد میں آ جائیں۔“

صدیق علی نے جواب دیا۔ ”جنگ اور صلح کے متعلق ہمارے اصول ان سے مختلف ہیں۔ میں سلطان ٹیپو کا سپاہی ہوں اور سلطان کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ ہم دھوکے اور فریب میں دشمن کی پیروی کریں۔ ق، قلعہ دار کو اس کے جرم کی سزا دے چکا ہوں۔ دشمن سے اس کی غداری کا انتقام نہیں لے سکتا۔“

صدیق علی فصیل پر چھڑا۔ دشمن کے جہازوں سے چھ کشتیاں کنارے کی طرف آ رہی تھیں۔ ایک کشتی پر سفید جھنڈا لہرا رہا تھا۔ صدیق علی نے دشمن کو خبردار کرنے کے لیے توپ چلانے کا حکم دیا۔ توپ کی آواز سن کر کشتیاں واپس چلی گئیں۔ اور دشمن کے جہازوں نے گولہ باری شروع کر دی۔ قریباً ایک گھنٹہ بعد دشمن کے وہ جہاز بھی بندرگاہ کے سامنے پہنچ گئے جنھوں نے رات کے وقت شمال کی ساحلی، چوکیوں پر گولہ باری کی تھی۔ قلعے میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ساٹھ اور زخمیوں کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہنچ چکی تھی۔ صدیق علی دوربین لیے ایک بُرج پر کھڑا توپچیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ افتخار الدین بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔ ”دیکھیے ایک جہاز ساحل کے قریب آ رہا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے“۔ صدیق علی نے جواب دیا۔ لیکن اُدھر دیکھو وہ دو جہاز اب پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ بری طرح

شکستہ ہو چکا ہے۔

افتخار الدین نے کہا۔ ’’مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میری حیثیت ابھی تک ایک تماشائی سے زیادہ نہیں۔ کاش میری بندوقوں کی گولیاں دشمن تک پہنچ سکتیں ۔‘‘

صدیق علی نے جواب دیا۔ ’’تمہارے امتحان کا وقت آ رہا ہے۔ اس لڑائی کا آخری فیصلہ تلواروں اور بندوقوں سے ہی ہو گا۔‘‘

صدیق دوربین لگا کر سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک اسے اپنے دئیں ہاتھ ایک ہلکی سی چیخ اور اس کے ساتھ کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، افتخار منہ کے بل پڑا تھا۔ صدیق نے اسے اٹھانے کی کوشش کی اور اس کے ہاتھ خون سے تر ہو گئے۔

’’افتخار! افتخار!‘‘ اس نے اسے پیٹھ کے بل لٹاتے ہوئے کہا لیکن افتخار کسی اور دنیا میں پہنچ چکا تھا۔

’’اسے نیچے لے جائے‘‘ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں سپاہیوں سے کہا۔

صدیق علی نے چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر دوربین لگا کر سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ہاتھ سے اشارہ کیا اور فضا بیک وقت قلعے کی کئی توپوں کے دھماکوں سے گونج اٹھی۔

بیسواں باب

بڈ نور کا گورنر ایاز خان اپنے محل کے ایک کمرے میں ٹہل رہا تھا اس کی آنکھوں سے ایک بھڑیئے کی سفاکی اور اس کے چہرے سے ایک لومڑی کی عیاری مترشح تھی۔ ناصر الدین کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ ''میں ساری رات نہیں سو سکا۔ کہیے کنڈا پور سے کوئی خبر آئی؟''

''نہیں! میں حیران ہوں کہ میرے ایلچی نے اتنی دیر کیوں لگائی!؟

''میرے خیال میں آپ کی کمک پہنچ گئی ہو گی۔''

ایاز خان نے جواب دیا۔'' کمک بھیجنے سے کوئی فائدہ نہ تھا میں نے قلعے کے محافظ کو یہ حکم بھیج دیا تھا کہ وہ فوج وہاں سے نکال کر حیدر گڑھ پہنچ جائے۔''

''لیکن مجھے تو آپ نے بتایا تھا کہ آپ کمک بھیج رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے لیکن اب میں قلعے کی حفاظت بے سود سمجھتا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ قلعے کے نئے محافظ کی حماقت کی وجہ سے بہت سی جانیں ضائع ہو جائیں گی اور مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ آپ افتخار الدین کو ایسے آدمیوں کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔ بہر حال آپ کو فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ قلعے کی فوج اب حیدر گڑھ پہنچ چکی ہو گی اور میں نے افتخار الدین کے لیے یہ حکم بھیج دیا ہے کہ وہ فوراً یہاں آجائے۔''

ناصر الدین نے کہا۔'' مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ نے کنڈا پور خالی کرنے کا حکم بھیجا ہے تو صدیق علی آپ کے ایلچی پر اعتماد نہیں کرے گا۔ اسے اس بات کا یقین نہیں آئے گا کہ آپ ایسی غلطی کر سکتے ہیں۔''

ایاز خاں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔'' میں اب یہ سوچ رہا ہوں کہ اس

بیوقوف کو پھانسی دینے کے لیے کون سی جگہ موزوں رہے گی۔

ناصر الدین نے کہا۔" اس نے ایک محب وطن سپاہی کا فرض ادا کیا ہے۔اور وہ سزا کی بجائے انعام کا مستحق ہے۔قلعہ دار کی غداری کے بعد اس کا وہاں پہنچنا تائید غیبی تھا"

ایاز خان نے کہاں۔" آپ تشریف رکھیے! میں آپ سے ایک مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

ناصر الدین ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ایاز خاں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے قدرے توقف کے بعد کہا۔" میں یہاں پہنچتے ہی آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے درمیان کوئی غلط فہمی نہیں رہنی چاہیئے۔ کنڈاپور کے قلعہ دار نے میرے ساتھ غداری نہیں کی تھی۔"

ناصر الدین چند ثانیے سکتے کے عالم میں ایاز کی طرف دیکھتا رہا۔بالآخر اس نے کہا۔" آپ کا مطلب یہ ہے کہ اس نے آپ کے حکم کی تعمیل کی تھی؟"

"ہاں"

"اور آپ کا حکم یہ تھا کہ کنڈاپور کا قلعہ کسی مزاحمت کے بغیر دشمن کے حوالے کر دیا جائے؟"

ناصر الدین اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن ایاز خان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوبارہ کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔"میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی، زندگی میں ہمیں بسا اوقات ایسی حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جو ناقابل یقین معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم جنگ ہار چکے ہیں۔"

" آپ مذاق کر رہے ہیں۔" ناصر الدین نے اپنی بدحواسی پر قابو پانے کی

کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''میں مذاق نہیں کر رہا۔میسور ساری دنیا کے ساتھ نہیں لڑ سکتا۔وہ چند جہاز جو اآپ نے کنڈاپور کی بندرگاہ میں دیکھے تھے۔ایک زبردست جنگی بیڑے کے ہراول تھے۔انگریزوں کی فوج چند دن تک یہاں پہنچ جائے گی۔ملیبار کے تمام ساحلی علاقوں پر ان کا قابض ہو جانا یقینی ہے۔سلطان ٹیپو جنوب اور مشرق کے تمام علاقے خطرے میں ڈالے بغیر اس طرف نہیں آ سکتا۔اب ہمیں میسور کی بجائے اپنے مستقبل کے متعلق سوچنا چاہیئے!''

ناصر الدین نے کہا۔''میں اپنا مستقبل میسور کے ساتھ وابستہ کر چکا ہوں۔''

''نہیں! آپ کا مستقبل بدنور کے صوبیدار سے وابستہ ہو چکا ہے۔''

''لیکن ان حالات میں جب کہ انگریزی فوجیں۔۔۔!''

ایاز خاں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔''آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔انگریز مجھ سے بدنور کی صوبیداری نہیں چھینیں گے۔''

''ان حالات میں میرے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔افتخار الدین کے یہاں پہنچتے ہی واپس منگلور چلا جاؤں گا۔''

''آپ رضیہ کو چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں۔''

ایک ثانیہ کے لیے ناصر الدین کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔بالآخر اس نے کہا۔

''رضیہ میرے ساتھ جائے گی۔''

''نہیں! رضیہ یہیں رہے گی اور آپ بھی یہیں رہیں گے۔ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔اب آپ منگلور واپس جانے کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لائیں۔

منگلور آپ کے وہاں پہنچنے سے پہلے انگریزوں کے قبضہ میں جا چکا ہوگا۔''

’’ہم کسی اور جگہ چلے جائیں گے‘‘۔

’’اگر آپ یہ ثابت کرسکیں کہ آپ کی صاحبزادی کے لیے اس ملک میں بدنور سے بہتر کوئی اور جگہ ہو سکتی ہے ۔تو میں اسے بخوشی وہاں بھیج دوں لیکن وہ اس محل میں رہنے کے لیے پیدا ہوئی ہے اگر آپ کو میرے متعلق کوئی شبہ ہے تو میں آج اسے اپنی رفیقہ حیات بنانے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گوارا نہیں کہ آپ لوگ اس محل سے باہر ایک معمولی سے مکان میں رہیں۔‘‘

باہر پہرہ داروں کا شور سنائی دیا۔کوئی بلند آواز میں کہہ رہا تھا’’میں اسی وقت صوبیدار سے ملنا چاہتا ہوں۔تم میرا راستہ نہیں روک سکتے۔بیوقوفو! میں کنڈاپور سے آیا ہوں۔‘‘

ایاز خاں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا اس کے دائیں بائیں اور پیچھے چار پہرے دار ننگی تلواریں بلند کیے ہوئے تھے۔ایاز خاں نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ پیچھے ہٹ گئے۔نوجوان چند قدم آگے بڑھا اور ایاز خان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ناصر الدین نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا یہ مسعود علی تھا۔

ایاز نے پوچھا۔’’تم کنڈاپور سے آئے ہو؟‘‘

’’جی ہاں! وہاں حالات بہت مخدوش ہیں۔ ہمارا بارود ختم ہو چکا ہے۔دشمن کے جنگی بیڑے کے پانچ اور جہاز وہاں پہنچ چکے ہیں۔انہوں نے تین بار قلعے کے آس پاس مختلف مقامات پر فوجیں اتارنے کی کوشش کی ہے لیکن ہم نے انہیں ہر بار سمندر میں دھکیل دیا ہے۔ قلعے کے محافظ اس وقت ملبے کے ڈھیروں پر مورچے بنا کر لڑ رہے ہیں۔ہمارے نصف سے زیادہ سپاہی زخمی اور ہلاک ہو چکے ہیں۔ہمیں بہت جلد پیچھے ہٹ کر ساحل پر اترنے والی فوج کے ساتھ فیصلہ کن جنگ لڑنا پڑے

گی۔ہم کمک کا انتظار کر رہے تھے لیکن کل چند غدار آپ کے ایلچیوں کا بھیس بدل کر وہاں پہنچے اور انہوں نے ہمیں آپ کا یہ حکم دیا کہ میدان چھوڑ دیں اور تین حصوں میں تقسیم ہو کر حیدر گڑھ، اٹت پور اور اونور پہنچ جائیں ۔یہ حکم نہایت عجیب تھا۔ کماندار نے ان آدمیوں کو گرفتار کر لیا ہے اور مجھے آپ کے پاس تصدیق کے لیے بھیجا ہے۔''

ایاز خاں کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔اس نے کہا۔''اب اگر تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ وہ تمہیں بھی غدار نہیں سمجھے گا تو تم فوراً واپس جا کر اسے میرا یہ حکم دو کہ کنڈاپور خالی کر دے اور سیدھا میرے پاس آئے۔تم وقت ضائع نہ کرو۔تمہارے ساتھ اور کتنے آدمی ہیں؟''

مسعود علی نے جواب دیا۔''میرے ساتھ صرف دو آدمی ہیں۔''

ایاز خاں نے پہرے داروں سے مخاطب ہو کر کہا۔''تم ان کے ساتھ جاؤ اور اصطبل کے داروغہ سے کہو انہیں تازہ دم گھوڑے دے دے۔''

پہریدار کمرے سے باہر نکل گئے لیکن مسعود اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔اس کی نگاہیں ناصر الدین پر مرکوز تھیں ۔اس نے بڑی مشکل سے کہا۔''میں نے یہاں پہنچتے ہی آپ کو تلاش کیا تھا آپ گھر پر نہیں تھے۔مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے لیے اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔افتخار الدین شہید ہو چکا ہے۔''

''مجھے معلوم تھا۔''ناصر الدین نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

ایاز خاں انتہائی پریشانی کی حالت میں کبھی ناصر الدین کی طرف اور کبھی مسعود علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ناصر الدین اٹھا اور کچھ کہے بغیر دروازے کی طرف بڑھا۔ایاز خاں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔''چلیے میں آپ کو گھر چھوڑ آتا

ہوں۔"

ناصر الدین نے کہا۔"نہیں! خدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو۔ مجھے چند گھنٹے تنہائی کی ضرورت ہے۔"

یہ کہہ کر ناصر الدین باہر نکل گیا۔ مسعود علی اس کے پیچھے جانے لگا۔ لیکن ایاز خاں نے کہا۔"نوجوان ٹھہرو! میرا خیال ہے کہ تم نے ابھی ناشتا بھی نہیں کیا ہے۔"

"ناشتا مجھے راستے میں مل جائے گا۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو میں فوراً واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"تم ناصر الدین کے گھر میں یہ خبر دے آئے ہو؟"

"جی ہاں"

"اب واپسی پر بھی وہاں جاؤ گے؟"

"جی نہیں! اگر وہ یہاں نہ ملتے تو بھی میرے پاس انہیں تلاش کرنے کے لیے وقت نہ تھا۔"

"مجھے ان کے بیٹے کی موت کا بڑا افسوس ہے۔ اچھا تم جاؤ اور کنڈاپور کے محافظ سے کہو کہ میں اس سے خفا بھی ہوں اور خوش بھی۔۔۔ خفا اس بات پر کہ اس نے میرے ایلچیوں کو قید کر دیا ہے اور خوش اس بات پر کہ اس نے فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن اب اسے قلعہ خالی کرنے کے متعلق میرے احکام کی تعمیل کرنی چاہیئے۔"

○

تھوڑی دیر بعد مسعود علی اور اس کے ساتھی گھوڑے دوڑاتے ہوئے شہر سے باہر نکل رہے تھے تو انہیں سامنے ایک سوار دکھائی دیا۔ جب وہ قریب پہنچے تو اس نے

ہاتھ بلند کرتے ہوئے چلا کر کہا۔ ’’مسعود علی صاحب ٹھہریئے !‘‘

مسعود علی نے گھوڑا روکا اور سوار نے کہا۔ ’’میں ناصر الدین کا نوکر ہوں ۔وہ آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں ۔آپ تھوڑی دور آگے چل کر ان کا انتظار کریں ۔‘‘

’’وہ یہاں آئیں گے؟‘‘

ہاں !چلیے ذرا آگے نکل چلیں ۔

کوئی آدھ میل چلنے کے بعد ناصر الدین کے نوکر نے کہا۔ ’’بس اب یہیں ٹھہر جایئے ۔وہ تھوڑی دیر تک پہنچ جائیں گے ۔‘‘

مسعود علی اور اس کے ساتھ گھوڑوں سے اُتر کر زمین پر بیٹھ گئے ۔کوئی آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد مسعود علی نے کہا۔ ’’ہمیں بہت دیر ہو رہی ہے ۔ہم اس سے زیادہ انتظار نہیں کر سکتے ۔‘‘

نوکر نے کہا۔ ’’جناب انہوں نے یہ کہا تھا کہ آپ کو روکنا بہت ضروری ہے ۔اور وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر میں آپ کو نہ روک سکا تو بدنور اور ملیبار کی تباہی یقینی ہے ۔‘‘

مسعود علی کے ایک ساتھی نے شہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’شاید کوئی آرہا ہے ۔‘‘

مسعود علی اٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔ایک سوار پوری رفتار سے آرہا تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو مسعود علی نے کہا لیکن یہ ناصر الدین تو معلوم نہیں ہوتے ۔ارے یہ تو کوئی عورت ہے ۔!‘‘

نوکر نے کہا۔ ’’یہ ناصر الدین کی صاحبزادی ہیں ۔‘‘

مسعود علی اور اس کے ساتھی پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف

دیکھ رہے تھے۔رضیہ نے گھوڑا روکا اور کسی تمہید کے بغیر کہا۔"چلیے"۔

"کہاں؟"مسعود علی نے سوال کیا۔

"کنڈا پور"۔

"آپ ہمارے ساتھ جائیں گی؟"

"ہاں وقت ضائع نہ کریں"

"لیکن کنڈا پور میں اب عورتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں"

"آپ کا بھائی وہاں ہے؟"

"ہاں"

"ابا جان! نے مجھے ایک ضروری پیغام دے کر ان کے پاس بھیجا ہے۔خدا کے لیے اب وقت ضائع نہ کیجئے!"

مسعود علی کچھ کہے بغیر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی۔

تھوڑی دیر بعد ان کے گھوڑے ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔مسعود علی اور اس کے ساتھی اپنے رسالے کے بہترین سوار تھے لیکن ان کے نزدیک رضیہ کی ہمت قابل داد تھی۔مسعود علی کے ذہن میں کئی سوال تھے۔جو وہ رضیہ سے پوچھنا چاہتا تھا ۔لیکن جب وہ حزن وملال کی اس تصویر کو دیکھتا تو اُسے بات کرنے کی جرات نہ ہوتی ۔راستے کی پہلی چوکی پر وہ گھوڑے بدلنے کے لیے رکے۔مسعود علی اور اس کے ساتھیوں کا بھوک سے بُرا حال ہو رہا تھا۔مسعود علی نے چوکی کے محافظ کو کھانا لانے کے لیے کہا اور پھر رضیہ کی طرف دیکھ کر بولا۔"میرے خیال میں آپ بھی کچھ کھا لیں"۔

"مجھے بھوک نہیں! آپ جلدی کریں"

شام کے وقت وہ کنڈا پور سے تھوڑ دور ایک چوکی میں پہنچ گئے۔ مسعود علی نے رضیہ کو ایک کمرے میں پہنچا کر کہا۔" آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ آپ کھانا کھا کر سو جائیں۔ میں آپ کا نوکر اور اپنا ایک ساتھی آپ کے پاس چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ہماری منزل اب زیادہ دور نہیں ہے۔ میں دو گھنٹے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ خدا معلوم وہاں حالات کیسے ہیں۔ اس لیے آپ کے پاس آدمی بھیج دوں گا۔ اگر آپ کے پاس کوئی ضروری اطلاع ہے تو مجھے بتا دیجیے۔"

رضیہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔" میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ مجھے آرام کی ضرورت نہیں" مسعود علی نے کہا۔" میں افتخار الدین کی بہن کو ناراض نہیں کر سکتا لیکن کاش مجھے اس بات کا یقین ہوتا کہ کنڈا پور آپ کے لیے محفوظ ہے۔ آپ کے لیے اپنے بھائی کی موت یقیناً ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ لیکن وہاں جا کر آپ کا غم غلط نہیں ہو سکتا۔ آپ کے ابا جان اگر وہاں کوئی ضروری پیغام پہنچانا چاہتے تھے تو اس کے لیے آپ کا بھیجنا بھی ضروری نہ تھا۔ وہ مجھ پر اعتماد کر سکتے تھے۔"

رضیہ نے مضطرب ہو کر کہا۔" آپ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں آپ کو صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ میرا فوراً کنڈا پور پہنچنا ضروری ہے۔"

مسعود علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔" اگر آپ کسی خطرے سے بھاگ رہی ہوں تو بھی آپ کو مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے۔ میں صدیق علی کا بھائی ہوں۔"

رضیہ نے مسعود علی کی طرف دیکھا اور اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ چند ثانیے ضبط کرنے کی ناکام کوشش کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

ایک سپاہی نے کھانے کا طشت اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ مسعود علی نے اس کے ہاتھ سے طشت لے کر رضیہ کے سامنے رکھ دیا۔ سپاہی واپس چلا گیا۔ مسعود علی نے رضیہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "اگر آپ کو میری کسی بات سے دکھ پہنچا ہے تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

رضیہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہو۔ "اگر آپ پر مجھے اعتماد نہ ہوتا تو میں آپ کے ساتھ یہاں تک کیوں آتی؟ سنیے! ابا جان نے محل سے واپس آتے ہی مجھے بتایا تھا کہ ایاز انگریزوں کے ساتھ بڈنور کا سودا کر چکا ہے۔ کنڈاپور کے قلعہ دار نے اس کی ہدایات پر عمل کیا تھا۔ ایاز بڈنور کے تمام قلعے انگریزوں کے قبضہ میں دینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔"

مسعود علی کچھ دیر سکتے کے عالم میں رضیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "یہ خبر نہایت الم ناک ہے لیکن اس کے لیے آپ کو کنڈاپور جانے کی ضرورت نہ تھی۔"

رضیہ نے کہا۔ "آپ نہیں جانتے، اس وقت بڈنور کی تمام فوج مجھے تلاش کر رہی ہوگی۔ ابا جان محل سے آتے ہی یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ وہ غدار اب زبردستی مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اس لیے میرے لیے بھاگنے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ ابا جان کو یقین تھا کہ آپ کے بھائی جان مجھے کسی محفوظ جگہ پہنچا دیں گے۔ جب ابا جان ایاز خاں کے ساتھ میری منگنی کر رہے تھے تو وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ایک بڑا آدمی ہے اور میں بھی یہ سوچتی تھی کہ میں خوش قسمت ہوں۔ خدا کے لیے مجھے کسی ایسی جگہ پہنچا دیجیے جو اس قوم فروش کی دسترس سے باہر ہو۔"

مسعود علی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ اطمینان رکھیں۔ اب آپ کو

کوئی خطرہ نہیں لیکن آپ کے والد کے متعلق پریشان ہوں۔وہ آپ کے ساتھ کیوں نہ آئے؟"

"انہیں یہ ڈر تھا کہ ایاز بہت جلد ہمارے گھر آئے گا وہ اسے غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کے لیے وہاں ٹھہرنا ضروری سمجھتے تھے۔اگر انہیں موقع ملا تو آج رات وہاں سے روانہ ہو کر خشکی کے راستے سیدھے منگلور کا رخ کریں گے۔اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر منگلور کو کوئی خطرہ درپیش ہوا تو وہ سرنگا پٹم چلے جائیں گے۔"

مسعود علی نے کہا۔میں گھوڑے دیکھتا ہوں۔اب شاید ہمارا سفر بہت طویل ہو جائے۔آپ چند نوالے ضرور کھا لیجے!"

"مجھے بالکل بھوک نہیں۔آپ جلدی تیاری کریں۔

چند منٹ بعد مسعود علی، رضیہ اور ان کے ساتھی رات کی تاریکی میں گھوڑوں پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہوئے اور قریباً چار میل سفر کرنے کے بعد جب وہ ایک ندی کے پل کے قریب پہنچے تو کسی نے بلند آواز میں کہا۔"ٹھہرو، کون ہے؟"

مسعود علی نے گھوڑا روک کر جواب دیا۔"میں مسعود علی ہوں۔"

چار مسلح سپاہی آگے بڑھے اور ان میں سے ایک نے کہا۔" آپ کماندار صدیق علی خاں کے بھائی ہیں؟"

ہاں۔اور تم کنڈاپور کی فوج کے آدمی ہو؟

"جی ہاں"

"یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"فوج یہاں آگئی ہے اور ہم پڑاؤ کے گرد پہرہ دے رہے ہیں۔"

''قلعہ خالی ہو چکا ہے؟''

''جی ہاں! قلعے میں اب ملبے کے سوا کچھ نہیں رہا۔ ہم غروب آفتاب کے بعد وہاں سے نکل آئے تھے۔''

مسعود علی اپنے بھائی کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس میں بولنے کی سکت نہ تھی۔ رضیہ نے گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''صدیق علی خان کہاں ہیں؟''

''وہ یہیں ہیں۔'' سپاہی نے جواب دیا۔

مسعود علی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں ان کے پاس لے چلو۔''

''چلیے!''

تھوڑی دیر بعد یہ لوگ صدیق علی خاں اور فوج کے چند افسروں کے سامنے کھڑے تھے اور رضیہ انہیں ایاز خاں کی غداری کی داستان سنا رہی تھی۔ رضیہ کا بیان سننے اور مسعود علی سے چند سوالات کرنے کے بعد صدیق علی نے کہا۔ ''مسعود تم بہت تھکے ہوئے ہو لیکن تمہیں آج رات آرام نہیں ملے گا۔ تم پانچ سواروں کے ساتھ اسی وقت شیموگہ کی طرف روانہ ہو جاؤ اور وہاں قلعے کے محافظ کو موجودہ صورتِ حالات سے خبردار کرو۔ سے میری طرف سے یہ پیغام دو کہ انگریز ملیبار اور بدنور کے کئی ساحلی مقامات پر فوجیں اتار چکے ہیں۔ ہم نے کنڈاپور اس وقت خالی کیا ہے جب کہ دشمن کی توپیں قلعے کو ملبے کا ڈھیر بنا چکی تھیں اور ان کی فوج کنڈاپور کے شمال اور جنوب میں کئی مقامات پر اتر چکی تھی اور ہمارے لیے رسد اور کمک کے تمام راستے بند ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ ہم قلعے کی توپیں نکال کر حیدر گڑھ اور بدنور لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن اب شیموگہ بھیج دی جائیں گی۔ اس وقت ہمارے ساحک کی

کوئی چوکی محفوظ نہیں ۔ایاز خاں کی غداری کے بعد ہمارے لیے بڈنور کو بچانا ممکن نہیں لیکن میں بڈنور کی طرف پیش قدمی کرنے والی فوج پر عقب سے حملے کر کے اسے زیادہ سے زیادہ عرصہ کے لیے مصروف رکھنے کی کوشش کروں گا۔میرے پاس اس وقت صرف ساڑھے تین سو سوار آٹھ سو پیادہ سپاہی ہیں ۔زخمیوں کو ایک دستے کی حفاظت میں شیموگہ روانہ کر دیا گیا ہے ۔ہمارے پاس بارود کی کمی ہے۔اس لیے جب تک کمک نہیں پہنچتی ہم دشمن کے عقب پر اکا دکا حملوں پر اکتفا کرتے رہیں گے ۔"

مسعود علی نے کہا۔" آپ نے افتخار الدین کی ہمشیرہ کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟"

صدیق علی نے جواب دیا۔"اب اننت پور بھی زیادہ محفوظ نہیں ۔اس لیے ہمیں شیموگہ کو ہی اپنا فوجی مستقر بنانا پڑے گا۔زخمیوں اور پناہ گزینوں کا قافلہ زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔میں رضیہ کو ان تک پہنچانے کا انتظام کر دیتا ہوں ۔"پھر وہ ایک افسر کی طرف متوجہ ہوا۔"انہیں قافلے کے ساتھ شامل کرنا تمہارے ذمہ ہے ۔اپنے ساتھ چار سپاہی لے کر ابھی روانہ ہو جائے ۔"

رضیہ نے کہا۔"میں یہیں رہ کر ابا جان کا انتظار کروں گی ۔"

صدیق علی نے جواب دیا۔"ہم دو تین گھنٹے سے زیادہ یہاں نہیں ٹھہریں گے ۔میں نے کنڈاپور سے شمال کی طرف اترنے والی فوج کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لیے چند جاسوس بھیجے ہیں اور ان کی طرف سے اطلاع ملتے ہی ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے ۔

رضیہ نے کہا۔"میں لڑائی میں اآپ کی فوج کا ساتھ دے سکتی ہوں ۔"

"نہیں! ابھی ہماری بہنوں کے لیے تلوار اٹھانے کا وقت نہیں آیا۔ ابھی ہماری رگوں میں خون کے چند قطرے باقی ہیں۔"

رضیہ نے کہا۔ "اگر آپ مجھے شیموگہ بھیجنا ضروری سمجھتے ہیں تو مجھے قافلے کے ساتھ بھیجنا ضروری نہیں۔ میں آپ کے بھائی کے ساتھ سفر کر سکتی ہوں۔"

"آپ کو بہت تکلیف ہوگی، مسعود راستے میں ایک لمحہ کے لیے بھی رکے گا لیکن اگر آپ مسعود کا ساتھ دے سکیں تو اس سے یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ آپ شیموگا کے قلعہ دار کو کسی اور کی نسبت زیادہ متاثر کر سکیں گی۔"

رضیہ نے کہا۔ "مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اگر ابا جان آپ کے پاس پہنچیں تو انہیں میرے متعلق بتا دیجیے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "بہت اچھا۔۔۔! مسعود علی اب تم انہیں لے کر روانہ ہو جاؤ۔!"

مسعود علی کو روانہ کرنے کے دو گھنٹہ بعد صدیق علی کو جاسوسوں نے واپس آ کر اطلاع دی کہ انگریزی افواج جنرل میتھیوز کی قیادت میں حسن گدی کے درے کے قریب پہنچ کر پڑاؤ ڈال چکی ہیں۔ اس نے اپنی فوج کو کوچ کا حکم دیا۔

علی الصباح جب جنرل میتھیوز کی افواج درے کی ایک تنگ گھاٹی سے گزر رہی تھیں۔ میسور کے سپاہیوں نے آس پاس کی چوٹیوں سے اچانک نمودار ہو کر ان کے عقب کے دستوں پر فائرنگ شروع کر دی۔ انگریزی فوج نے پلٹ کر حملہ کرنے کی بجائے اپنی رفتار تیز کر دی۔ یہ درہ دفاعی لحاظ سے بہت مضبوط خیال کیا جاتا تھا۔ اور سات میل تک جگہ جگہ توپیں نصب تھیں۔ صدیق علی نے اس امید پر دشمن کا تعاقب جاری رکھا کہ شاید ایاز خاں کی غداری کے باوجود کسی چوکی کے سپاہی دشمن کا

راستہ روکنے کی کوشش کریں۔لیکن اس کی یہ توقع عبث ثابت ہوئی۔جنرل میتھیوز کے لیے راستہ کھلا تھا۔وہ عقب سے بار بار حملہ کرنے والی فوج کے ساتھ الجھنا اپنے لیے نقصان دہ سمجھتا تھا۔

صدیق علی کے سپاہی قریباً ڈیڑھ سو انگریزوں کو ہلاک اور زخمی کرنے کے بعد ان کے بارود سے لدے ہوئے چند خچر چھین چکے تھے لیکن جنرل میتھیوز کو ان نقصانات کی پروا نہ تھی۔انگریزی فوج درے سے نکل کر حیدر گڑھ کے قلعے میں داخل ہوئی حیدر گڑھ کے قلعے کے سترہ سو محافظوں میں سے اکثر ایاز خاں کے حکم کے مطابق بدنور پہنچ چکے تھے۔باقی قلعے کے دروازے پر دشمن کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔یہ قلعہ ایک بلند مقام پر تھا۔اور اپنے محلِ وقوع کے باعث ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔اس میں پچیس توپیں نصب تھیں۔لیکن قلعہ دار نے انہیں صرف دشمن کو سلامی دینے کے لیے استعمال کیا۔حیدر گڑھ سے آگے بدنور کا راستہ انگریزوں کے لیے کھلا تھا اور صدیق علی کے تھکے ماندے سپاہیوں کے لیے ان کا تعاقب جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔

۲۸ جنوری ۱۷۸۳ء کی شام بدنور کے باشندے حسرت و یاس کے عالم میں قلعے کے دروازے پر میسور کی بجائے انگریزوں کا جھنڈا دیکھ رہے تھے۔اور ایاز خاں کمپنی کی فوج کے افسروں کو بدنور کا سرکاری خزانہ تقسیم کرنے میں مصروف تھا۔۔

○

مسعود علی نے شموگا کے قلعے میں داخل ہوتے ہی کماندار سے ملاقات کی اور اس نے نئے حالات سے باخبر ہوتے ہی سلطان ٹیپو اور ملیبار کی فوجی چوکیوں کے محافظوں کو خبردار کرنے کے لیے اپنے ہرکارے روانہ کر دیے۔رضیہ کو اس نے اپنے

مکان میں جگہ دی۔

دو دن بعد کنڈا پور کے زخمیوں اور پناہ گزینوں کا قافلہ شیموگا پہنچ گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی قلعے کے محافظ کو یہ اطلاع ملی کہ بڈنور اور حیدر گڑھ پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ چوتھے روز سلطان کی فوج کا ایک افسر لطف علی چند دستوں کے ساتھ چتل ڈرگ سے یلغار کرتا ہوا شیموگا پہنچ گیا۔ اور اس نے قلعے کے محافظ کو یہ خوشخبری سنائی کہ سلطان کا لشکر بہت جلد پہنچنے والا ہے۔

اگلے روز رضیہ قلعہ دار کے گھر میں عصر کی نماز پڑھ رہی تھی کہ اسے باہر "فوج آرہی ہے، فوج آرہی ہے" کا شور سنائی دیا۔ وہ نماز ختم کرکے اٹھی اور قلعہ دار کی بیوی اور لڑکیوں کے ساتھ مکان کے دروازے میں کھڑی ہو کر وسیع احاطے کی طرف جھانکنے لگی۔

مسعود علی چند افسروں کے ساتھ صحن میں کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد صدیق علی گھوڑا دوڑاتا ہوا قلعے کے اندر داخل ہوا اور رضیہ اسے دیکھ کر اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگی۔ پھر چند ثانیے بعد سواروں کے دستے داخل ہو رہے تھے۔ اور رضیہ کی نگاہیں ان میں اپنے باپ کو تلاش کر رہی تھیں۔ مسعود علی بھاگتا ہوا آگے بڑھا۔

صدیق علی نے اسے دیکھ کر اپنا گھوڑا روکا اور نیچے اتر کر اس کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ رضیہ اپنے باپ کے متعلق سننے کے لیے بے تاب تھی اور اسے اپنا سانس بھی بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ مسعود علی کے ساتھ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد صدیق علی نے قلعہ دار اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر ان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا۔

رضیہ کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ اچانک وہ مکان سے باہر نکل آئی اور تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی صدیق علی کی طرف بڑھی۔ مسعود علی نے صدیق علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”بھائی جان! رضیہ آرہی ہے۔ وہ اپنے باپ کے متعلق بہت پریشان ہے۔“

صدیق علی نے مڑ کر رضیہ کی طرف دیکھا اور رضیہ کے پاؤں اچانک زمین سے پیوست ہو کر رہ گئے۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے صدیق علی کا مغموم چہرہ دیکھ رہی تھی۔ صدیق علی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔ ”رضیہ! مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں لایا۔“

”ابا جان کہاں ہیں“ رضیہ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

صدیق علی نے جواب دیا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں انہیں اپنے ساتھ نہیں لا سکا۔ اب وہ ہم سے بہت دور جا چکے ہیں۔ میں نے ان کا پتہ کرنے کے لیے بدنور میں اپنا ایک جاسوس بھیجا تھا۔ تمہارے نوکروں نے اسے بتایا کہ انہوں نے اسی روز رات کے وقت بدنور سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن شہر سے تھوڑی دور ایاز خاں کے آدمیوں نے انہیں جالیا۔ وہ رات کی تاریکی میں سڑک چھوڑ کر ایک طرف بھاگنے لگے لیکن وہ گھوڑے سمیت ایک گہرے کھڈ میں جا گرے ایک نوکر آخر وقت تک ان کے ساتھ تھا۔ اور میرا جاسوس اس سے مل کر ان کی موت کی تصدیق کر چکا ہے۔“

رضیہ ایک سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ مسعود علی اور قلعہ دار آگے بڑھے۔ قلعہ دار نے کہا۔ ”بیٹی! مجھے تمہارے باپ کی موت کا افسوس ہے۔“

رضیہ کوئی جواب دیئے بغیر مڑی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی مکان کی

طرف چل دی۔

○

عشاء کی نماز کے بعد قلعہ دار مسجد سے نکل کر اپنے مکان کی طرف جا رہا تھا کہ صدیق علی نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ ''میں ناصر الدین کی صاحبزادی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''چلیے! میری بیوی کہتی تھی کہ اس نے اپنے باپ کی موت کی خبر سننے کے بعد سے کسی سے بات نہیں کی۔ اگر آپ اسے تسلی دے سکیں تو بہت اچھا ہوگا۔''

صدیق علی، قلعہ دار کے ساتھ مکان کے اندر داخل ہوا۔ قلعہ دار نے ایک کمرے کے دروازے پر رکتے ہوئے کہا۔ ''وہ اس کمرے میں ہیں۔''

صدیق علی نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کون ہے؟'' اندر سے آواز آئی۔

''میں صدیق علی ہوں''

کمرے میں پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور پھر نیم وا کواڑ کی اوٹ سے رضیہ کی آواز آئی ''میرا خیال تھا کہ آپ کہیں جا چکے ہیں''

صدیق علی نے جواب دیا۔ ''میں اس قلعے میں پناہ لینے والے زخمیوں کی مزاج پرسی میں مصروف تھا لیکن اگر میں کہیں چلا گیا ہوتا تو بھی یہ کوئی غیر متوقع بات نہ ہوتی۔ جو حادثہ آپ پر گزرا ہے۔ مجھے اس کا پورا احساس ہے۔ لیکن کاش تسلی کے الفاظ آپ کے زخموں کا مداوا بن سکتے۔ میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ اب شموگا اور اس کے آس پاس کوئی شہر یا قلعہ محفوظ نہیں۔ ہمیں ابھی تھوڑی دیر پہلے بڈنور اور حیدر گڑھ سے انگریزی افواج کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی ہے لیکن ابھی یہ معلوم نہیں ہو

سکا کہ ان کی منزلِ مقصود کدھر ہے۔ ممکن ہے کہ دو ایک روز تک مجھے کسی اہم محاذ پر جانا پڑے۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کو کسی محفوظ جگہ پہنچا دیا جائے۔ مجھے آپ کے نوکر نے بتایا ہے کہ بنگلور میں آپ کے کوئی عزیز رہتے ہیں۔"

بنگلور میں ہمارے چند رشتہ دار ہیں لیکن میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد آج تک انہیں نہیں دیکھا۔ اور میں ان کا سہارا تلاش کرنے کی بجائے اس قلعے میں جان دینا آسان سمجھتی ہوں۔"

صدیق علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "اگر آپ کو کسی اور جگہ جانا پسند نہیں تو سرنگا پٹم میں ہمارے گھر کا دروازہ آپ کے لیے ہر وقت کھلا ہے، آپ کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ مجھے امید ہے کہ میری امی جان آپ کی دلجوئی کر سکیں گی۔ اگر آپ کو وہاں جانے میں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں کل ہی آپ کے سفر کا بندوبست کر دوں گا۔ آپ کا نوکر چند سپاہی آپ کے ساتھ جائیں گے۔"

صدیق علی نے رضیہ کی طرف سے کسی جواب کی بجائے دروازے کی اوٹ میں اس کی سسکیاں سن رہا تھا۔ اور یہ سسکیاں آہستہ آہستہ دبی چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔

قلعہ دار نے کہا۔ "بیٹی! میں صدیق علی کے ابا جان کو جانتا ہوں۔ سرنگا پٹم میں ان کے گھر سے بہتر تمہارے لیے کوئی اور جائے پناہ نہیں ہو سکتی۔ شیموگا اب ہماری فوج کا مرکز بننے والا ہے۔ اس لیے میں بھی اپنے بچوں کو یہاں سے بھیج رہا ہوں۔"

قلعہ دار کا ایک نوکر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب پہنچا اور بولا "ایک افسر دروازے پر کھڑا ہے اور وہ آپ سے اسی وقت ملنا چاہتا ہے۔"

"اسے ملاقات کے کمرے میں بٹھاؤ! میں ابھی آتا ہوں"

نوکر چلا گیا تو قلعہ دار نے صدیق علی سے کہا۔ ''مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی اہم خبر سننے والے ہیں۔ آپ انہیں تسلی دیں میں اس سے پتہ کرتا ہوں''

قلعہ دار ملاقات کے کمرے کی طرف چل دیا اور صدیق علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''رضیہ اگر آپ کو ہمارے گھر جانے میں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں چاہتا ہوں کہ آپ کل ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں۔''

رضیہ نے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اُپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے میں سوچ رہی تھی کہ اب اس دنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔ آپ شاید بہت رحمدل ہیں۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ میں پتھر نہیں ہوں''۔

رضیہ نے کہا۔ ''کاش میں آپ کی فوج میں شامل ہو کر اپنے بھائی اور باپ کا انتقام لے سکتی۔''

صدیق علی نے جواب دیا۔ ''آپ کے بھائی اور ابا جان کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔''

قلعہ دار کا نوکر بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا۔ ''وہ آپ کو بلا رہے ہیں انگریزوں کی پیش قدمی کے متعلق کوئی اہم خبر آئی ہے۔''

صدیق علی نے کہا۔ ''رضیہ! کاش میرے پاس باتوں کے لیے وقت ہوتا اگر مجھے اسی وقت کسی مہم پر جانا پڑا تو میری غیر حاضری میں قلعہ دار تمہارے سفر کا بندوبست کر دے گا۔'' اس کے بعد اس نے نوکر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''چلو''۔

رضیہ چند منٹ کواڑ سے لگی کھڑی رہی۔ پھر اپنے بستر کے قریب ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ سرنگا پٹم میں صدیق علی کے والدین اور اس کے گھر کی مختلف

خیالی تصویریں اس کے ذہن میں آ رہی تھیں۔ کبھی اسے یہ خیال آتا کہ جب جنگ کے بعد سپاہی اپنے گھروں کو لوٹیں گے تو وہ صدیق علی اور مسعود کی ماں کے ساتھ بالکنی میں کھڑی ان کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔ اور اس کی نگاہوں کے سامنے امیدوں کے چراغ روشن ہو جاتے۔ اور کبھی وہ سوچتی کہ میدانِ جنگ سے کوئی ایلچی ایک عمر رسیدہ ماں کو آ کر یہ پیغام دے گا کہ تمہارے جواں سال بیٹے لڑائی میں کام آ چکے ہیں۔ اور اس کی نگاہوں کے سامنے بھیانک تاریکیاں چھا جاتیں۔ جہاز پر صدیق علی کے ساتھ ابتدائی ملاقات کو وہ ایک اتفاقی حادثہ سمجھتی تھی لیکن کنڈا پور سے رخصت ہوتے وقت اسے افسوس تھا کہ ان کے راستے ایک دوسرے سے اتنی جلدی جدا ہو گئے ہیں۔ تاہم یہ احساس اتنا شدید نہ تھا کہ وہ مڑ کر پیچھے دیکھتی لیکن اب دنیا بدل چکی تھی اور صدیق علی س کے لیے زندگی کا آخری سہارا بن چکا تھا۔ اپنے بھائی اور اپنے باپ کی موت کے بعد وہ بار بار یہ سوچ رہی تھی کہ اگر صدیق علی نہ ہوتا تو یہ دنیا میرے لیے کتنی تاریک ہوتی!۔

وہ دیر تک اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق سوچتی رہی۔ قریباً ایک گھنٹہ بعد اسے قلعے کے صحن میں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور اس کا دل بیٹھنے لگا۔ ”صدیق علی کہیں جا رہا ہے“۔ صدیق علی کسی خطرناک مہم پر جا رہا ہے۔ شاید وہ واپس نہ آئے۔ نہیں نہیں! صدیق علی مت جاؤ، اب اس دنیا میں میرا کوئی نہیں، میں اکیلی ہوں، میں اب افتخار الدین کی بہن اور ناصر الدین کی بیٹی نہیں ہوں، اب میرے لیے بڈنور کے گورنر کا محل نہیں ہے۔ میں ایک بے بس لڑکی ہوں۔ ”صدیق علی مجھے اپنے ساتھ ہی لے چلو۔ میں گولیوں کی بارش میں تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔“

رضیہ کے دل و دماغ میں ایک ہیجان برپا تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکلی تو

اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے وہ قلعے کے صحن میں داخل ہوئی۔صدر دروازے پر سپاہیوں کی آوازیں اور قلعے سے باہر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دے رہی تھی۔رضیہ کی حالت اس مسافر کی تھی جس کا قافلہ اسے صحرا میں تنہا چھوڑ کر آگے جا چکا ہو۔وہ دیر تک بے حس وحرکت کھڑی رہی۔آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹا اور دم بھر کے لیے تاریک فضا میں نور کے خزانے بکھیر کر روپوش ہوگیا۔اچانک اسے کسی کی آواز سنائی دی۔''کون ہے؟''

رضیہ نے قلعہ دار کی آواز پہنچانتے ہوئے جواب دیا۔''میں ۔۔ میں رضیہ ہوں۔صدیق علی کہاں ہیں؟''

''وہ ایک مہم پر جا چکے ہیں لیکن آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔چلیے اندر،وہ مجھے آپکے متعلق تاکید کر گئے ہیں۔آپ کے سفر کا بندوبست ہو جائے گا۔اب آپ کو آرام کرنا چاہئیے۔''

''وہ کہاں گئے ہیں؟''

''وہ اننت پور گئے ہیں۔ابھی اننت پور کی فوج کا ایک افسر یہاں پہنچا تھا اور اس نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ انگریزوں کی فوج اننت پور کا رخ کر رہی ہے۔اور بدنور کا گورنر وہاں کے سپاہیوں کو یہ ہدایت بھیج چکا ہے کہ قلعہ کسی مزاحمت کے بغیر انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے۔صدیق علی تین سو سواروں کے ساتھ روانہ ہو چکا ہے۔اگر وہ وقت پر پہنچ گیا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اننت پور کا قلعہ بچا سکے گا۔''

''ان کا بھائی کہاں ہے؟''

''وہ بھی فوج کے ساتھ جا چکا ہے لیکن وہ آپ کو سرنگا پٹم پہنچانے کے لیے تین سپاہی چھوڑ گئے ہیں۔صدیق علی نے اپنے والد کے نام ایک مختصر سا خط لکھ کر آپ

کے نوکر کو دیا تھا۔''

رضیہ نے کہا۔''اگر آپ مجھے ضرور بھیجنا چاہتے ہیں تو میں اسی وقت یہاں سے روانہ ہونا چاہتی ہوں۔''

''یہ وقت موزوں نہیں۔آپ رات آرام کریں۔صبح دیکھا جائے گا۔''

''رضیہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔اننت پور میں ان کی مہم زیادہ خطرناک تو نہیں؟''

''اننت پور کا قلعہ ہمارا مضبوط ترین قلعہ ہے۔وہاں ساٹھ بڑی توپیں نصب ہیں۔اگر صدیق علی کے پہنچنے سے پہلے غداروں نے اسے دشمن کے حوالے نہ کر دیا تو ہم انگریزوں سے بڈنور اور حیدر گڑھ کی شکست کا بدلہ لے سکیں گے۔''

رضیہ نے کہا۔''میں پچھلے پہر یہاں سے روانہ ہو جاؤں گی۔اور اس وقت آپ کو جگانا مناسب نہ ہوگا۔اس لیے آپ سونے سے پہلے میرے ساتھ جانے والے سپاہیوں کو ہدایت کر دیں کہ وہ پچھلے پہر تیار رہیں!''

''بہت اچھا! لیکن اگر آپ ایک دن اور ٹھہر سکیں تو ممکن ہے پرسوں تک میں آپ کے ساتھ ہی اپنے بال بچوں کو بھی روانہ کر دوں''

''نہیں! میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔'' رضیہ یہ کہہ کر واپس مڑی، قلعہ دار کے مکان کے سامنے اسے اپنا نوکر دکھائی دیا۔وہ جلدی سے آگے بڑھ کر بولا۔''میں آپ کو تلاش کر رہا تھا۔صدیق علی خاں کہیں چلے گئے ہیں وہ تاکید کرتے تھے کہ ہم یہاں سے فوراً سرنگاپٹم روانہ ہو جائیں۔انہوں نے اپنے والد کے نام مجھے خط لکھ کر دیا تھا۔لیجیے!''

رضیہ نے کاغذ کا پرزہ اپنے نوکر کے ہاتھ سے لے لیا اور کہا۔''میں ابھی قلعہ

دار سے مل چکی ہوں تم جا کر تیاری کرو ہم پچھلے پہر یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد رضیہ اپنے کمرے کے اندر چراغ کی روشنی میں صدیق علی کا مختصر سا خط پڑھ رہی تھی۔

"ابا جان اور امی جان! میں ایک بے سہارا
لڑکی کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ میرے پاس
تفصیلات بیان کرنے کا وقت نہیں۔ رضیہ کو آپ کی
محبت، شفقت اور نیک دعاؤں کی ضرورت ہے اور
مجھے یقین ہے کہ آپ اسے مایوس نہیں کریں گے۔
آپ کا بیٹا
صدیق علی۔"

صدیق انت پور کے قلعے کے دروازے کے برج پر کھڑا مغرب کی سمت انگریز سواروں کی فوج دیکھ رہا تھا۔ ان کے ہراول دستے معمولی رفتار سے قلعے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سب سے آگے ایک سوار سفید جھنڈا بلند کیے ہوئے تھا۔

تھوڑی دیر بعد یہ سوار قلعے کی توپوں اور بندوقوں کی زد میں آ چکے تھے۔ صدیق علی کے اشارے پر چند سپاہیوں نے ہوائی فائر کیے۔ اس کے بعد ایک توپ چلائی گئی۔ اور انگریز فوج جو اطمینان سے آگے بڑھ رہی تھی، رک گئی، چند منٹ بعد انگریزی فوج کے چار سوار، جن میں سے ایک کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا۔ گھوڑے دوڑاتے ہوئے قلعے کے دروازے کے قریب پہنچے اور ان میں سے ایک نے جو فوج کا کوئی بڑا افسر معلوم ہوتا تھا۔ بلند آواز میں کہا۔ "سفید جھنڈے پر گولی چلانا جنگ کے اصولوں کے خلاف ہے۔ تمہارا کماندار ہمارے ساتھ وعدہ کر چکا ہے۔ کہ وہ قلعہ

ہمارے حوالہ کر دے گا۔ اگر کماندار کی نیت بدل گئی ہے تو یہ اس معاہدے کی خلاف ورزی ہوگی جو بدنور کے گورنر نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "بدنور کا گورنر حکومتِ میسور کا غدار ہے اور اس کماندار کو پھانسی دی جا چکی ہے۔ جس نے ایک غدار کے حکم کی تعمیل کا ارادہ کیا تھا۔ ہم نے تمہارے سفید جھنڈے پر گولی نہیں چلائی بلکہ تمہیں خبردار کیا تھا کہ تم اس امید پر قلعے کی توپوں کی زد میں آنے کی کوشش نہ کرو کہ یہاں سب غدار بستے ہیں۔"

انگریز افسر نے کہا۔ "ایاز خاں نے بدنور کے گورنر کی حیثیت سے اس قلعے کے متعلق ہمارے ساتھ معاہدہ کیا ہے اور میسور کی حکومت اپنے ایک بااختیار گورنر کی طرف سے کیے گئے معاہدوں کی پابند ہے۔"

"بدنور کے گورنر کی سرکاری حیثیت اس دن ختم ہو گئی تھی۔ جب اس نے تمہارے ساتھ بدنور اور حیدر گڑھ کا سودا کیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک غدار ہے۔"

"ہم تمہیں خبردار کرتے ہیں کہ تم غلطی کر رہے ہو۔ تم چند گھنٹوں سے زیادہ ہمارے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم تمہیں پندرہ منٹ سوچنے کے لیے مہلت دیتے ہیں۔ اس کے بعد اگر تم نے مزاحمت کی تو ہم بدعہدی کے جرم میں اس قلعے کے کسی سپاہی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

صدیق نے جواب دیا۔ "اگر تم دو منٹ کے اندر اندر واپس نہ چلے گئے تو میں سپاہیوں کو گولی چلانے کا حکم دے دوں گا۔"

انگریز سپاہیوں نے چند ثانیے آپس میں کچھ باتیں کیں اور اس کے بعد اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑ لیں۔

اچانک صدیق علی کو دائیں طرف حدِ نگاہ پر چند سوار دکھائی دیے۔ اس نے

ایک افسر کے ہاتھ سے دوربین لی اور افق کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ ہمارے آدمی معلوم ہوتے ہیں اس نے بلند آواز میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد اسے پانچ سوار اچھی طرح دکھائی دینے لگے اور پھر اچانک وہ اپنے دل میں ناخوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگا۔ چند ثانیے غور سے دیکھنے کے بعد اس نے دوربین نیچے کرتے ہوئے اپنے بھائی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "مسعود! رضیہ نے میرا کہا نہیں مانا۔ نیچے جا کر پہریداروں سے کہو کہ وہ انہیں اندر آنے دیں ۔انگریز محاصرے کے لیے اپنی صفیں درست کر رہے ہیں۔ اور ابھی شاید ان کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوئی لیکن ممکن ہے کہ وہ انہیں قلعے میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کریں۔"

مسعود علی جلدی سے نیچے اتر گیا اور صدیق علی اضطراب کی حالت میں کبھی اپنے بائیں ہاتھ انگریزوں کی فوج کی طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی دائیں جانب قلعے کی سمت آنے والے پانچ سواروں کی طرف ۔اب وہ دوربین کے بغیر بھی رضیہ اور اس کے ساتھیوں کو پہچان سکتا تھا۔ اچانک انگریزوں کی فوج کے چند سوار گھوڑے بھگاتے ہوئے آگے بڑھے اور انہوں نے رضیہ اور اس کے ساتھیوں کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی۔ لیکن فصیل پر سے گولیوں کی بارش کے باعث انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ انگریز سپاہیوں نے جواب میں گولیاں برسائیں لیکن اتنی دیر میں رضیہ اور اس کے ساتھی قلعے کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ صدیق علی بھاگتا ہوا صحن میں پہنچا۔ اسے اپنے جذبات کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ رضیہ کا چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ چند ثانیے اسے اس بات کا احساس نہ ہوا کہ وہ اجنبی لوگوں کے درمیان کھڑی ہے۔ پھر اس نے صدیق علی کی طرف دیکھا اور جلدی سے گردن نیچی کر کے اپنا نقاب درست کرنے لگی۔

مسعود علی نے اسے گھوڑے سے اترنے کے لیے سہارا دیا اور صدیق علی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''رضیہ تم نے بہت برا کیا۔اس قلعے میں چار سو عورتیں اور بچے پہلے ہی پناہ لے چکے ہیں اور خدا معلوم اس کی دیواریں کب تک دشمن کی گولہ باری کے سامنے ٹھہر سکیں۔''

رضیہ نے جواب دیا۔''میں اس قلعے میں پناہ لینے نہیں آئی۔آپ میرا نام اپنے سپاہیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔''

صدیق علی نے کہا۔''اگر آپ عورتوں اور بچوں کی خبر گیری کر سکیں تو میں اسے غنیمت سمجھوں گا۔مسعود انہیں خواتین کے پاس پہنچادو۔''

''چلیے!مسعود علی نے کہا اور رضیہ کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ قلعے کے اس حصے کی طرف چل پڑی جہاں عورتیں اور بچے ٹھہرے ہوئے تھے۔

صدیق علی نے اپنے افسروں اور سپاہیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔''میرے دوستو!ہمارے عزم اور استقلال کے امتحان کا وقت آپہنچا ہے۔میں یہ ہدایت لے کر آیا ہوں کہ جب تک ہمارا لشکر یہاں نہیں پہنچتا اس قلعے کی ہر قیمت پر حفاظت کی جائے۔اگر یہ قلعہ دشمن کے قبضے میں چلا گیا تو یہ تمام علاقہ خطرے میں پڑ جائے گا۔انگریز کو فتوحات کا شوق ہزاروں میل دور سے یہاں تک لے آیا ہے۔اس نے سات سمندر پار اپنی قوم کی سطوت کے پرچم لہرانے کے لیے ہمارے ساتھ جنگ مول لی ہے۔اور اس جنگ میں فتح یا شکست اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں لیکن ہم اپنی عزت،اپنی آزادی اور اپنے بقا کے لیے لڑ رہے ہیں۔ہمیں زندہ رہنے کے لیے اپنے دشمنوں کے سامنے یہ ثابت کرنا ہے کہ تم جس جنگل میں شکار کھیلنے آئے ہو۔وہاں بھیڑ،بکریوں کے ریوڑ نہیں،شیر بستے ہیں۔ایک سپاہی کی

زندگی میں ایسا وقت آتا ہے جب اسے فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر اپنی جان کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتا۔ کہ انت پور میں ہماری جنگ کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ممکن ہے ہمیں بروقت کمک پہنچ جائے۔ اور دشمن کو دھکیل کر سمندر کی طرف لے جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم وطن کی آزادی کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ دونوں صورتوں میں ہماری آئندہ نسلیں ہمارے متعلق یہ نہیں کہہ سکیں گی کہ ہم نے ذلت کا راستہ اختیار کیا تھا۔ میں تمہیں اس بات کا یقین دلا سکتا ہوں کہ اس قلعے کے ہر سپاہی کی قربانی قوم کے ہزاروں افراد کو تباہی اور بربادی سے بچا سکے گی۔ ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ دشمن ہماری لاشیں روندے بغیر انت پور سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

ایک گھنٹہ بعد لڑائی شروع ہو چکی تھی اور انگریزوں کی توپیں چاروں طرف سے قلعے پر گولہ باری کر رہی تھیں۔ قلعے میں بارود کے ذخیرے کا اندازہ لگانے کے بعد صدیق علی سپاہیوں کو یہ ہدایت دے چکا تھا کہ وہ اشد ضرورت کے بغیر فائر نہ کریں۔ تیسرے پہر انگریزوں نے چاروں طرف سے قلعے پر دھاوہ بولنے کی کوشش کی لیکن قلعے کی توپوں نے پہلی بار پوری شدت سے گولہ باری کی اور حملہ آوروں کو شدید نقصان اٹھانے کے بعد پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس کے بعد دشمن صرف اپنے توپخانے سے گولے برسانے پر اکتفا کرتا رہا۔ غروبِ آفتاب کے وقت صدیق علی اپنی آنکھوں سے دوربین لگائے قلعے کے ایک بُرج پر کھڑا تھا۔ قلعے کے گرد دشمن کی تعداد پہلے سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اور وہ چاروں طرف چھوٹی توپوں کی جگہ بھاری توپیں نصب کر رہے تھے۔ مغرب کی اذان سن کر صدیق علی فصیل سے نیچے اُترا اور

نمازیوں کی صف میں کھڑا ہو گیا۔ اچانک باہر سے توپ کا ایک گولہ فصیل کے ایک بُرج پر لگا اور اس کے ریزے اڑ کر صحن میں آ گرے۔ پھر پوری شدت کے ساتھ چاروں طرف سے گولہ باری ہونے لگی۔ نماز ختم کرنے کے بعد سپاہی اور افسر اپنے اپنے مورچوں میں کھڑے ہو گئے۔

یہ رات قیامت کی رات تھی۔ دشمن کا توپخانہ اندھا دھند آگ برسا رہا تھا۔ قلعے کے کئی برج ٹوٹ چکے تھے۔ چھتوں اور فصیلوں میں جگہ جگہ شگاف پڑ چکے تھے۔ کئی سپاہی زخمی اور شہید ہو چکے تھے۔ پچھلے پہر صدیق علی فصیل کا چکر لگانے کے بعد نیچے اترا اور ایک سپاہی کے ہاتھ سے مشعل لے کر قلعے کے اندر گشت کرنے لگا۔ جگہ جگہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھنے کے بعد وہ ایک وسیع کمرے میں داخل ہوا جہاں چند عورتیں زخمیوں کی تیمارداری کر رہی تھیں۔ کمرے کے ایک سرے پر ایک سپاہی جس کی قمیض خون سے تر تھی۔ درد سے کراہ رہا تھا۔ اور رضیہ اس کے سر پر پٹی باندھ رہی تھی۔ صدیق علی اس کے قریب پہنچ کر رکا۔ رضیہ نے اس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ صدیق علی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ واپس مڑا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ فصیل پر پہنچا اور چاروں طرف چکر لگانے اور سپاہیوں کو ہدایات دینے کے بعد دروازے کے قریب ایک بُرج کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ رات کی تاریکی میں قلعے کے چاروں طرف توپوں کے دہانوں سے آگ کے شعلے اژدہوں کی پھنکار سے زیادہ مہیب معلوم ہوتے تھے۔ اچانک اسے اپنے قریب کسی کی دبی دبی سسکیاں سنائی دیں۔

”کون ہے؟“ اس نے چونک کر سوال کیا۔

''میں ہوں رضیہ۔'' کسی نے گھٹی ہوئی نسوانی میں جواب دیا۔

''آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ مجھ سے خفا ہیں؟''

صدیق علی نے جواب دیا۔ ''میں تم سے خفا نہیں ہوں رضیہ! لیکن تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''لیکن یہاں سینکڑوں عورتیں موجود ہیں۔ میرے آنے سے کیا فرق بڑ گیا ہے؟''

صدیق علی نے جواب دیا۔ ''یہ عورتیں اننت پور کی طرف دشمن کی اچانک پیش قدمی کے باعث مجبوری کی حالت میں یہاں جمع ہو گئی ہیں۔ لیکن تمہارے لیے ایسی کوئی مجبوری نہ تھی۔ میں نے تمہیں اپنے گھر پہنچانے کا انتظام کر دیا تھا۔''

رضیہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''یہاں آ کر مجھے موت کا ڈر نہیں میرے لیے یہ بات نا قابلِ برداشت ہے کہ آپ مجھ سے خفا ہوں۔''

''میں تم سے خفا نہیں رضیہ! لیکن کاش میں تمہیں یہ سمجھا سکتا کہ ہم یہاں زندگی کی بجائے موت سے زیادہ قریب ہیں۔ دشمن اپنی پوری قوت یہاں جمع کر رہا ہے۔ خدا معلوم کل تک وہ کتنی اور بڑی توپیں اس قلعے کے سامنے نصب کر دے گا۔ ہمارا بارود کا ذخیرہ اب زیادہ سے زیادہ ایک دن اور چلے گا۔ میرے سپاہیوں کے حوصلے بلند ہیں۔ لین عورتوں اور بچوں کا مسئلہ ہمارے لیے بہت پریشان کن ہے۔ کاش تم میرا کہا مانتیں!''

رضیہ نے کہا۔ ''مجھے معلوم نہیں کہ میں یہاں کیوں آ گئی ہوں۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ ہماری منزل ایک ہے اور ہمارے راستے ایک دوسرے سے جدا نہیں

ہو سکتے۔‘‘

صدیق علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔’’ رضیہ تم صرف اس لیے یہاں آئی ہو کہ میں یہاں تھا؟‘‘

صدیق علی کو جواب میں الفاظ کی بجائے سسکیاں سنائی دینے لگیں۔اس نے کہا۔’’ رضیہ سچ کہو تمہارے دل میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میں شاید اننت پور سے واپس آ کر تمہیں نہ دیکھوں؟‘‘

رضیہ کی سسکیاں اچانک بند ہو گئیں اور اس نے چند ثانیے توقف کے بعد جواب دیا۔’’ مجھے صرف اس بات کا احساس تھا کہ آپ کسی خطرناک مہم پر روانہ ہو چکے ہیں اور میں خطرے کے وقت آپ سے دور رہنا نہیں چاہتی تھی۔آپ میری حفاظت کے خیال سے مجھے سرنگا پٹم بھیجنا چاہتے تھے لیکن آپ کے بغیر میرے لیے زندگی کے کوئی معنی نہ تھے۔‘‘

اچانک ایک خوفناک دھماکہ سنائی دیا اور اس کے بعد بُرج کے ایک ستون اور چھت کی کچھ اینٹیں نیچے گر پڑیں۔پھر بیک وقت ایک کی زبان سے’’ رضیہ‘‘ اور دوسرے کی زبان سے’’ صدیق علی‘‘ کے الفاظ نکلے اور وہ اضطراب کی حالت میں ایک دوسرے کی گرفت میں آ چکے تھے۔

’’ رضیہ تم ٹھیک ہو نا؟‘‘

’’ مٰں بالکل ٹھیک ہوں۔میں آپ کے متعلق ڈر گئی تھی۔آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟‘‘

صدیق علی نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔’’رضیہ تم نیچے چلی جاؤ‘‘

’’بھائی جان! بھائی جان! چند قدم کے فاصلے سے مسعود علی کی آوازیں سنائی دیں۔‘‘

’’کیا ہے مسعود؟‘‘

مسعود تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور بولا۔۔’’بھائی جان یہ برج گر رہا ہے آپ ایک طرف ہٹ جائیں۔‘‘

’’بہت اچھا! تم رضیہ کو نیچے لے جاؤ‘‘۔

مسعود نے رضیہ کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔’’آپ یہاں کیا کر رہی ہیں، چلیے!‘‘

رضیہ کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ فصیل سے نیچے اتر آئی۔

صدیق علی آہستہ آہستہ فصیل پر چلتا ہوا آگے بڑا۔سپاہی اپنی اپنی جگہ پر کھڑے تھے اور صدیق علی کو ان کا سکوت چیخوں سے زیادہ اضطراب انگیز محسوس ہوتا تھا۔دشمن کی گولہ باری ہر لحظہ شدت اختیار کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ فصیل کے دوسرے حصے پر ایک افسر سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک نیچے صحن سے کسی نے بلند آواز میں کہا۔کماندار صاحب! کماندار صاحب!!

صدیق علی نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔’’میں یہاں ہوں! کیا بات ہے؟‘‘

’’مسعود علی خان زخمی ہو گئے ہیں۔آپ نیچے آئیں۔‘‘

صدیق علی کا دل بیٹھ گیا۔وہ جلدی سے نیچے اترا اور سپاہی کے ساتھ بھاگتا ہوا ایک کمرے میں داخل ہوا۔مسعود علی جانکنی کے عالم میں فرش پر پڑا ہوا تھا۔اس کے سینے سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔چند سپاہی اس کے گرد کھڑے تھے اور رضیہ ایک سکتے کے عالم میں اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

"مسعود! مسعود!" صدیق علی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ مسعود علی کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر چند ثانیہ بعد اس نے آنکھیں بند کر کے گردن ڈھیلی چھوڑ دی۔ رضیہ کی پتھرائی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ نکلا۔

ایک افسر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے صدیق علی کے قریب آ کر کہا۔

"جناب اب صبح ہو رہی ہے اور دشمن کی نقل و حرکت سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعے پر دھاوا بولنے کا ارادہ کر رہا ہے۔"

○

دن کے آٹھ بجے تک قلعے کی فصیل جگہ جگہ سے ٹوٹ چکی تھی۔ اندر کئی مکان ملبے ڈھیر بن چکے تھے۔ لڑنے والے سپاہیوں کی نسبت زخمی اور شہید ہونے والے مجاہدوں کی تعداد زیادہ تھی۔ سپاہیوں کے علاوہ کئی عورتیں اور بچے گرتی ہوئی چھتوں کے ملبے کے نیچے دب کر ہلاک ہو چکے تھے۔ دوپہر کے وقت دشمن نے ایک بار پھر قلعے پر یورش کرنے کی کوشش کی لیکن قلعے کے محافظوں نے توپوں اور بندوقوں کی شدید فائرنگ سے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ قلعے کے محافظوں کی یہ کامیابی بجھتے ہوئے چراغ کی آخری لو تھی۔ ان کا بارود ختم ہو چکا تھا اور صدیق علی انہیں یہ حکم دے چکا تھا کہ اب توپوں سے کام نہ لیا جائے، اب اگر دشمن نے دوبارہ حملہ کیا تو بندوقیں، نیزے اور تلواریں ہمارا آخری سہارا ہوں گی۔

تیسرے پہر دشمن کی پیادہ فوج اپنے توپخانوں کی گولہ باری کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے سرک کر نئے مورچے تیار کر رہی تھی۔ صدیق علی فصیل کے ایک مورچے میں بیٹھا دشمن پر گولیاں برسا رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ فائر کرنے کے بعد اپنی بندوق

بھرنے لگا تو کسی نے اسے اپنی بندوق پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ لیجئے! یہ بھری ہوئی ہے۔ خالی بندوق مجھے دے دیجئے! میں بارود اور گولی ڈالنا جانتی ہوں''

یہ رضیہ تھی۔ صدیق علی نے کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھ سے بندوق لے لی اور وہ اس کے قریب بیٹھ کر خالی بندوق بھرنے لگی۔ صدیق علی نشانہ باندھتے ہوئے کہا۔

''رضیہ! ہماری منزل شاید اب بہت قریب آ چکی ہے۔ ہزاروں باتیں ایسی ہیں جو میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تمہارے پاس بیٹھ کر مسعود کے متعلق باتیں کروں اور تمہیں یہ بتاؤں کہ اس کا بچپن اور جوانی کیسی تھی۔ وہ مجھے کس قدر عزیز تھا۔ اس کی شہادت سے تھوڑی دیر قبل میں یہ تصور کر رہا تھا کہ ہم سرنگا پٹم پہنچ چکے ہیں۔ ہم دریائے کاویری کے کنارے سیر کر رہے ہیں۔ میں اپنے ابا جان اور امی جان کو تمہارے متعلق بتا رہا ہوں اور میرے چھوٹے بھائی تمہیں حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔''

رضیہ بولی ''اور میں شاید اس وقت آپ کے ساتھ کسی جہاز پر سفر کر رہی تھی۔ ہم کسی ایسے جزیرے کی طرف جا رہے تھے جہاں انسانیت جنگوں کے آلام و مصائب سے آزاد ہے۔ جہاں ملت فروش اپنے وطن کی آزادی اپنی قوم کے دشمنوں کے ہاتھوں فروخت نہیں کرتے۔''

صدیق علی نے فائر کرنے کے بعد رضیہ کے ہاتھ سے بھری ہوئی بندوق لیتے ہوئے کہا۔ ''رضیہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ میں ایک کامیاب جہاز راں بنوں اور بنگلور سے روانہ ہوتے وقت یہ بات میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھی کہ مجھے اچانک بری فوج کا ایک افسر بنا دیا جائے گا۔ جب تم جہاز پر سوار

ہوئی تھیں تو سا وقت کون کہہ سکتا تھا کہ قدرت نے ہمیں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سنانے کے لیے اننت پور کا قلعہ منتخب کیا ہے۔"

رضیہ نے کہا۔"میں آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں۔اور وہ یہ کہ آپ کسی مرحلہ پر مجھے اپنی نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کا حکم نہیں دیں گے۔"

صدیق علی نے کہا۔"اگر چند گھنٹوں تک ہمیں کوئی کمک نہ پہنچی تو بچوں اور عورتوں کی خاطر ہم ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔اگر دشمن انہیں یہاں سے نکلنے کا موقع دینے پر رضامند ہو گیا تو میں اپنے بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ ان کی قید میں جانا قبول کرلوں گا۔اگرچہ ان کی قید ہمارے لیے موت سے بدتر ہوگی۔بہر حال ان حالات میں اس قلعے کے کماندار کی حیثیت سے میرا جو حکم باقی عورتوں اور بچوں کے لیے ہوگا وہی تمہارے لیے ہوگا۔"

رضیہ نے پر اُمید ہو کر کہا۔"ایسا وقت آنے پر میں آپ کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کروں گی۔اور مجھے یقین ہے کہ میری زندگی میں ایسا وقت نہیں آئے گا۔"

شام کے وقت قلعے کے باقی افسر صدیق علی سے کہہ رہے تھے کہ ہمارا بارود اب بالکل ختم ہو چکا ہے۔اگر تھوڑی دیر تک کوئی کمک نہ آئی تو ممکن ہے کہ رات کے وقت دشمن کسی مزاحمت کے بغیر قلعے میں داخل ہو جائے۔"

صدیق علی نے جواب دیا۔"اب ہمارا مقصد لڑائی میں دشمن کو زیادہ سے زیادہ دیر یہاں مصروف رکھنا ہے۔ہمیں یہ رات گزارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

رات کے وقت قلعے کی توپوں کو خاموش دیکھ کر انگریز اپنی توپیں اور قریب لا چکے تھے اور ان کی گولہ باری کے اثرات پہلے سے کہیں زیادہ تباہ کن تھے۔جس مورچے میں صدیق عی بیٹھا ہوا تھا اس کے ارد گرد فصیل کا کچھ حصہ منہدم ہو چکا تھا۔

اس نے رضیہ کو بڑے اصرار کے بعد نیچے جانے پر رضامند کیا۔ وہ عورتوں کے ایک کمرے میں جا کر لیٹ گئی اور تھوڑی دیر بعد اس پر نیند کا غلبہ طاری ہو گیا۔

رات بھر کی گولہ باری کے بعد صبح کی روشنی میں انت پور کا قلعہ ویرانی اور بربادی کا ایک دلخراش منظر پیش کر رہا تھا۔ قلعے کے محافظ اپنی آخری گولی چلا چکے تھے۔ صدیق علی نے حسرت و یاس کے عالم میں چاروں طرف دیکھا اور ایک سپاہی کو فصیل سے سفید جھنڈا لہرانے کا حکم دیا۔ دشمن کی توپیں خاموش ہو گئیں۔ صدیق علی گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا اور قلعے سے کوئی پچاس گز دور جا کر رک گیا۔ دشمن کی صفوں سے سواروں کا ایک دستہ نکلا اور آن کی آن میں صدیق علی کے قریب آ رکا۔ صدیق علی نے کہا۔ ''میں آپ کے کماندار کے پاس یہ پیش کش لے کر آیا ہوں کہ اگر آپ اس قلعے میں پناہ لینے والی عورتوں اور بچوں کو نکل جانے کا موقع دیں تو ہم یہ قلعہ آپ کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں''

ایک انگریز افسر نے جواب دیا۔ ''تمہیں یہ درخواست لے کر کماندار کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے کماندار ان لوگوں سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے جنہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہمارے صلح کے جھنڈے پر فائرنگ کی تھی۔ اگر تم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہو تو گولہ باری پھر دوبارہ شروع کر دی جائے گی۔ اور قلعے پر قبضہ کے بعد ہم تمہیں بد ترین سلوک کا مستحق سمجھیں گے۔''

صدیق علی نے جواب دیا ''جس شخص نے اس قلعے کے متعلق آپ کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا تھا وہ میسور کا غدار تھا۔''

افسر نے کہا۔ ''ہم تمہارے ساتھ بحث میں الجھنا پسند نہیں کرتے۔ تم واپس جا

سکتے ہو۔ہمیں یقین ہے کہ ہم تمہاری مزاحمت کے باوجود ایک گھنٹے کے اندر اندر اس قلعے پر قبضہ کرلیں گے۔"

صدیق علی نے مایوس ہوکر کہا۔"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر ہم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیں تو اپ عورتوں اور بچوں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

افسر نے جواب دیا۔"تمہارے ہتھیار نہ ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں معلوم ہے کہ تمہارا بارود ختم ہو چکا ہے اور تم نے اس وقت صلح کا جھنڈا بلند کیا ہے جب تمہارے لیے کوئی اور راستہ باقی نہیں رہا۔تم ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دو۔عورتوں اور بچوں کے ساتھ زیادتی کرنا ہماری شان کے شایان نہیں لیکن ہم ان کے متعلق تمہارے ساتھ کوئی بات کرنے پر آمادہ نہیں تم جا سکتے ہو"

صدیق علی نے مڑ کر قلعے کی طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر اپنی کمر سے تلوار اتار کر انگریز افسر کو پیش کر دی۔

تھوڑی دیر بعد انگریزی فوج فتح کے نقارے بجاتی قلعے کے اندر داخل ہوئی انگریز کمانڈنٹ کے حکم سے قلعے کے محافظوں کو جن میں بیشتر زخمی تھے، غیر مسلح کر کے ایک طرف کھڑا کر دیا گیا۔چند سپاہی ان کے سامنے بندوقیں تان کر کھڑے ہو گئے اور باقی بھوکے بھڑیوں کی طرح عورتوں پر ٹوٹ پڑے۔کوئی کسی کا زیور اتار رہا تھا اور کوئی کسی کا لباس نوچ رہا تھا۔عورتوں اور بچوں کی چیخوں کے ساتھ انگریزوں کے قہقہے بلند ہورہے تھے۔

صدیق علی یہ جگر خراش منظر برداشت نہ کر سکا۔وہ جھپٹ کر آگے بڑا اور اپنے راستے کے ایک سپاہی کو دھکا دے کر گرانے کے بعد آنکھ جھپکنے کی دیر میں ایک انگریز

افسر پر پل پڑا جو ایک نوجوان لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا۔اس نے ایک ہی مکے سے نیچے گرا دیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے اسے گلا دبوچ لیا۔سپاہیوں نے بندوقوں کے کندے مار مار کر اسے علیحدہ کیا اور اس کے ہاتھ ایک رسی سے جکڑ دیئے۔اتنی دیر میں صدیق علی کے چند ساتھ انگریز سپاہیوں کے ہاتھوں سے سنگینیں چھین کر چھ آدمیوں کو ہلاک کر چکے تھے۔انگریزوں نے اس کے جواب میں قتل عام شروع کر دیا اور آن کی آن میں پچاس قیدی موت کے گھاٹ اتار دیئے۔اس وحشیانہ قتلِ عام کے دوران میں کئی عورتیں اور لڑکیاں دشمن کی وحشت اور بربریت سے بچنے کے لیے قلعے کے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر جانیں دے چکی تھیں۔

انگریز کمانڈنٹ نے صورتِ حالات پر قابو پاتے ہی بقیۃ السیف قیدیوں میں سے بیس آدمی علیحدہ کیے اور ان کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر فصیل کے ساتھ کھڑا کر دیا۔صدیق علی ان کے درمیان کھڑا تھا۔اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ دیوار سے چند قدم دور قیدیوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔رضیہ چند عورتوں کے ساتھ پشت بہ دیوار قیدیوں سے تھوڑی دور کھڑی سکتے کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہی تھی۔انگریز کمانڈنٹ نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور سپاہیوں نے اپنی بندوقیں سیدھی کر لیں۔

رضیہ اچانک عورتوں کے ہجوم سے نکل کر بھاگی اور ”صدیق صدیق“ کہتی ہوئی بندوقوں کی زد میں آ گئی۔اس کے ساتھ کمانڈنٹ نے ”فائر“ کہہ کر ہاتھ نیچے کر دیا۔بندوقوں کے مہیب دھماکوں کے ساتھ۔ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔رضیہ، صدیق علی سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر گری۔اٹھی۔پھر گری۔اور اس کے بعد زمین پر رینگتی ہوئی صدیق کی لاش سے لپٹ گئی۔

ایک انگریز افسر نے آگے بڑھ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"یہ مرچکی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد انگریز سپاہی قیدیوں کی ایک اور ٹولی پر اپنی بندوقوں کا نشانہ آزمارہے تھے۔اور پھر جب فاتح لشکر اہت پور کے قلعے پر اپنے پرچم کو سلامی دے رہا تھا۔تو چند زخمیوں اور بیماروں کے سوا جنھیں انتہائی بے ضرر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا تھا۔قلعے کے باقی محافظ اپنا سفرِ حیات ختم کر چکے تھے۔وہ عورتیں جو بچ گئی تھیں۔ان میں سے بہت کم ایسی تھیں جن کے چہروں پر زخموں کے نشان نہ تھے۔۔

اکیسواں باب

معظم علی، ایاز خان کی غداری اور بدنور پر انگریزوں کے اچانک قبضے کی خبر سن چکا تھا۔لیکن وہ صدیق اور مسعود کے انجام سے کئی دن بے خبر رہا۔ایک صبح فرحت حسبِ معمول نماز سے فارغ ہو کر قرآن کی تلاوت کر رہی تھی اور معظم علی مراد کے ساتھ فوجی درسگاہ جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ صابر نے اندر آ کر کہا۔"ایک فوجی افسر آپ سے ملنا چاہتا ہے،وہ کہتا ہے کہ میں ملیبار سے کوئی اہم اطلاع لے کر آیا ہوں۔میں نے اسے دیوان خانے میں بٹھا دیا ہے۔"

معظم علی نے اپنے دل میں ناخوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا دیوان خانے کی طرف بڑھا اور تھوڑی دیر بعد وہ میسور کی فوج کے ایک بڑے افسر کے ساتھ مصافحہ کر رہا تھا،معظم علی نے کہا۔"تشریف رکھیے،آپ ملیبار سے آئے ہیں؟"

"جی ہاں!میرا نام لطف علی بیگ ہے۔"

معظم علی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔"میں آپ کا نام سن چکا ہوں،فرمائیے!"

لطف علی نے کہا،"مجھے سلطانِ معظم نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔مجھے افسوس ہے کہ میں کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔"

معظم علی نے لطف علی کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔"آپ صدیق،مسعود یا انور میں سے کسی کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"جی میں صدیق اور مسعود کے متعلق بہت بُری خبر لے کر آیا ہوں"

چند ثانیے معظم علی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔بالآخر اس نے ڈوبتی ہوئی

آواز میں کہا۔ ''اگر میرے بیٹوں نے کسی میدان میں پیٹھ نہیں دکھائی تو میرے لیے ان کے متعلق کوئی خبر بُری نہیں ہو سکتی۔ بتائیے آپ کیا خبر لائے ہیں؟''

لطف علی نے کہا۔ '' آپ اننت پور میں انگریزوں کے مظالم کے واقعات سن چکے ہیں''

''ہاں''

''صدیق علی خاں اننت پور کے قلعے کا محافظ تھا اور مسعود علی اس کے ساتھ تھا۔''

''اور وہ دونوں ۔۔۔؟''

''وہ دونوں شہید ہو چکے ہیں''

معظم علی سکتے کے عالم میں چند ثانیے لطف علی کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ ''لیکن صدیق علی تو بحری فوج میں تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ اننت پور کیسے پہنچا۔''

لطف علی نے جواب دیا۔ ''وہ منگلور سے سامانِ جنگ لے کر کنڈاپور گیا تھا۔ وہاں ایاز خان کی غداری کے بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ اسے کنڈاپور کی فوج کی کمان سنبھالنی پڑی۔ اس کے بعد بڈنور کے علاقے میں ہماری رہی سہی افواج اس کے گرد جمع ہو چکی تھیں۔

مسعود علی پہلے سے وہاں تھا۔ وہ انگریزوں کے حملے سے چند دن پہلے اسد خان کی کمان میں کنڈاپور پہنچ چکا تھا۔ اسد خاں کنڈاپور کی جنگ میں شہید ہوا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنی ذمہ داریاں صدیق علی کو سونپ دی تھیں۔ میں نے سنا ہے کہ اسد خاں آپ کا دوست تھا؟''

”جی ہاں وہ میرا بہترین دوست تھا۔“

”سلطان معظم کو صدیق اور مسعود کی شہادت کی خبر سن کر بہت صدمہ ہوا تھا اور انہوں نے مجھے آپ کے نام ایک ذاتی خط دے کر بھیجا ہے۔“ لطف علی نے ایک خط نکالا اور معظم علی کو پیش کر دیا۔

معظم علی نے خط کھول کر پڑھا۔ سلطان ٹیپو نے لکھا تھا۔

”میرے عزیز دوست! میں لطف علی کو ایک المناک خبر سنانے کے لیے آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ کاش میرے الفاظ آپ کے زخموں کا مداوا بن سکتے۔ میری سلطنت کے تمام خزانے صدیق علی اور مسعود جیسے جانبازوں کے خون کے ایک قطرے کی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ آپ نے کچھ عرصہ قبل جنگ میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اور میں نے آپ کی درخواست کا اس لیے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ مجھے محاذ جنگ کی بجائے سرنگا پٹم کی فوجی تربیت گاہ میں آپ کی زیادہ ضرورت تھی۔ میری اب بھی یہی رائے کہ آپ سرنگا پٹم میں زیادہ مفید کام کر رہے ہیں۔ تاہم اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو آپ جس وقت چاہیں سرنگا پٹم میں کسی موزوں آدمی کو اپنی ذمہ داریاں سونپ کر تشریف لے آئیں۔ مجھے جنگ میں بھی آپ جیسے لوگوں کے مشوروں کی ضرورت ہے۔“

خط پڑھنے کے بعد معظم علی دیر تک گردن جھکائے سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے لطف علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”آپ ان کی شہادت کے متعلق اچھی طرح تصدیق کر چکے ہیں؟“

”جی ہاں! اننت پور کے وحشیانہ قتلِ عام کے بعد انگریزوں نے چند عورتیں اور بچے جن میں سے اکثر زخمی تھے۔ ہمارے حوالے کر دیئے تھے اور انہوں نے

آپ کے بیٹوں کی شہادت کی خبر کی تصدیق کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب انت پور کے واقعات لوگوں کے سامنے آئیں گے تو میسور کا ہر باشندہ ان کی جرائت، ہمت اور غیرت پر فخر کرے گا۔''

معظم علی نے کہا۔'' کاش ان کی قربانی اس قوم کی تقدیر بدل سکتی۔ جس کی عزت اور آزادی چند غداروں اور ابن الوقتوں کے رحم و کرم پر ہے۔ کاش میسور میں کوئی اور ایاز پیدا نہ ہو۔''

لطف علی نے کہا۔'' اب مجھے اجازت دیجیے میں آج ہی واپس جانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ سلطان معظم کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتے ہیں تو میں پہنچا دوں گا۔''

'' آپ میری طرف سلطانِ معظم کا شکریہ ادا کیجئے۔ اور ان سے کہیئے کہ میں بہت جلد ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

O

ایک ہفتہ بعد رات کے پچھلے پہر معظم علی اور فرحت مکان کے صحن میں کھڑے تھے معظم علی سفر کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ مراد آنکھیں ملتا ہوا برآمدے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔'' ابا جان آپ تیار ہو گئے ہیں۔ ابھی تو بہت رات باقی ہے؟''

''نہیں بیٹا وہ دیکھو صبح کا ستارہ نمودار ہو چکا ہے۔''

مراد علی نے ماں کی طرف متوجہ ہو کر شکایت کے لہجے میں کہا۔'' امی جان آپ نے وعدہ کیا تھا کہ جب ابا جان اٹھیں گے آپ مجھے جگا دیں گی۔''

ماں نے جواب دیا۔'' بیٹا میں نے تو یہ وعدہ کیا تھا کہ تمہارے ابا جان تم سے مل کر جائیں گے۔''

معظم علی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔'' بیٹا تم وعدہ کرو کہ میری

غیر حاضری میں اپنا وقت ضائع نہ کرو گے۔ صدیق اور مسعود ایک بہت بڑے مقصد پر قربان ہوئے ہیں اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے میسور کو بہترین آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔ میں تمہیں میسور کا بہترین نوجوان دیکھنا چاہتا ہوں؟"

مراد علی نے پوچھا۔ "ابا جان آپ کب تک واپس آئیں گے؟"

"بیٹا میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ اور اگر انور علی ملیبار پہنچ چکا ہے تو اسے چند دن کے لیے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔" اس کے بعد معظم علی فرحت کی طرف متوجہ ہوا۔ فرحت تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں انشاء اللہ جلد واپس آجاؤں گا۔"

فرحت نے مغموم لہجے میں جواب دیا، "میں پریشان نہیں ہوں۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ گذشتہ تیس برس میں ہمارے خاندانوں کی تین نسلیں یکے بعد دیگرے قوم کے غداروں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرتی چلی آرہی ہیں۔ خدا معلوم اس ملک میں میر جعفر کی روح کب تک زندہ رہے گی اور یہ سلسلہ کہاں ختم ہوگا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "فرحت یہ دنیا خیر و شر کی رزمگاہ ہے مجھے یقین ہے کہ ابن الوقتوں، غداروں اور ملت فروشوں کا یومِ حساب اب قریب آچکا ہے۔ بدنور کے واقعات نے سلطان ٹیپو کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ جنگ سے فارغ ہونے کے ان کے سامنے پہلا مسئلہ قوم کو ان گندے عناصر کے وجود سے پاک کرنا ہوگا۔ انگریزوں سے نپٹنے کے بعد میں سلطان سے یہ مطالبہ کروں گا کہ بدنور کے غداروں کا معاملہ میرے سپرد کر دیا جائے۔ فرحت! جو قوم سلطان ٹیپو کو جنم دے سکتی ہے۔ اس کے لیے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، میں بہت جلد واپس آکر تمہیں یہ مژدہ سناؤں گا کہ صدیق اور مسعود کا خون رائیگاں نہیں گیا اور اننت پور اور بدنور پر

ہماری فتح کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔"

فرحت کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ معظم علی چند ثانیے خاموش اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر "خدا حافظ" کہہ کر چل دیا۔ جب وہ صحن سے باہر نکل گیا تو فرحت مراد علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے مردانہ حصے کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے سے چند قدم آگے معظم علی گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا اور نوکر اس کے گرد جمع تھے۔ معظم علی نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور فرحت کی آنکھوں میں آنسو پھوٹ نکلے۔

مراد علی کچھ دیر اپنی ماں کے ساتھ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ بالآخر اس نے کہا ۔"چلیے امی جان"

ماں نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "چلو بیٹا اب مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔"

o

میسور کی افواج انگریزوں سے ساحلی چوکیاں چھیننے کے بعد حیدر گڑھ اور بڈنور کے ارد گرد کئی چھوٹے چھوٹے قلعوں پر قبضہ کر چکی تھیں اور بڈنور میں جنرل میتھیوز کی فوج سمندر کی طرف سے رسد و کمک کے تمام راستے بند ہو جانے کے باعث محاصرے کی سی حالت کا سامنا کر رہی تھی۔ سلطان ٹیپو حیدر گڑھ اور بڈنور کے درمیان ایک وادی میں پڑاؤ ڈالے مختلف محاذوں پر لڑنے والی افواج کی نگرانی کر رہا تھا۔

وہ جنگ کے ایام میں بھی سلطنت کے تمام حالات سے باخبر رہتا تھا۔ وزیر، صوبیدار اور دوسرے عہدیدار سے باقاعدگی کے ساتھ اپنی کارگزاریوں کی تفصیلات

لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ سلطان ہر روز اپنے عمال کے بیشمار خطوط، اور رعایا کی درخواستوں کے جواب اور اہم مقدمات کے فیصلے لکھواتا۔ ملاقاتیوں سے ملتا اور اس کے بعد فوجی معاملات کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتا۔ ایک دن گیارہ بجے کے قریب سلطان اپنے دفتری کاموں سے فارغ ہوا تو اس کے سامنے حسبِ معمول ملاقاتیوں کی فہرست پیش کی گئی۔ سلطان نے کاغذ پر نگاہ ڈالتے ہی پوچھا۔ معظم علی کب آئے ہیں؟''

فہرست پیش کرنے والے افسر نے جواب دیا۔ ''عالیجاہ! وہ کل رات یہاں پہنچے تھے''

سلطان ٹیپو نے کہا۔ ''انہیں لے آؤ''

افسر باہر نکل گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد معظم علی اندر داخل ہوا۔ سلطان نے مسند سے اُٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور اسے اپنے قریب ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ ہم اننت پور کے جانبازوں کو بروقت کمک نہ بھیج سکے۔ دشمن نے اچانک منگلور پر حملہ کر کے ہماری افواج کو اس محاذ سے توجہ ہٹانے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اب ان ظالموں کا یومِ حساب شروع ہو چکا ہے۔ ہم نے سمندر کی طرف سے دشمن کے رسد و کمک کے رستے منقطع کر دیئے ہیں۔ حیدر گڑھ فتح ہو چکا ہے اور کل وہاں سے ہماری فوج کا ایک حصہ اننت پور روانہ ہو جائے گا اور اس کے بعد چند دن تک بڈنور کا قلعہ بھی ہماری توپوں کی زد میں ہوگا۔ میرے الفاظ اس باپ کے زخموں کے لیے مرہم کا کام نہیں دے سکتے جو صدیق علی اور مسعود علی جیسے ہونہار بیٹوں سے محروم ہو چکا ہے۔ لیکن میں آپ کو یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ اننت پور کے شہیدوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔

معظم علی نے کہا۔’’ایک باپ کے لیے اس سے زیادہ حوصلہ افزا خبر کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے بیٹے آپ کی نگاہوں میں عزت کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔‘‘

سلطان نے کہا۔’’آپ جنگ میں حصہ لینے پر مصر تھے۔اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو اننت پور پر حملہ کرنے والی فوج کی کمان سونپنے کے لیے تیار ہوں۔‘‘

معظم علی نے جواب دیا۔’’عالیجاہ! اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو میں شکریے کے ساتھ یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔‘‘

سلطان ٹیپو نے کہا۔’’جب آپ اس مہم سے واپس آئیں گے تو میں آپ کو اس سے زیادہ اہم ذمہ داری سونپنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔مجھے بڈنور کی صوبیدار کے لیے آپ سے زیادہ موزوں اور کوئی نظر نہیں آتا۔آپ حیدر گڑھ جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔شام سے پہلے وہاں کے سپہ سالا کے نام اپ کی تقرری کے احکام پہنچ جائیں گے۔‘‘

معظم علی نے احسان مندی کے ساتھ شیر میسور کی طرف دیکھا اور اٹھ کر خیمے سے باہر نکل آیا۔

غروب آفتاب سے تھوڑی دی قبل معظم علی گھوڑا دوڑاتا ہوا حیدر گڑھ کے قلعے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔گھوڑے سے اترتے وقت معظم علی کی نگاہیں ایک نوجوان کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔یہ اس ک تیسرا بیٹا انور علی تھا۔اس کے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔چند ثانیے معظم علی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔بالآخر اس نے کہا۔انور تم کب سے یہاں ہو؟‘‘

انور کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اس نے جواب دیا۔’’ابا جان ہماری فوج

پچھلے ہفتے یہاں پہنچ گئی تھی۔ مجھے ابھی سپہ سالار نے یہ بتایا تھا کہ آپ یہاں تشریف لا رہے ہیں۔ امی جان اور مراد کا کیا حال ہے؟''

''وہ ٹھیک ہیں بیٹا۔ تمہارے سپہ سالار کہاں ہیں؟''

''وہ اندر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ چلیے!''

معظم علی، انور علی کے ساتھ قلعے کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ میسور کی فوج کا مایہ ناز جرنیل غازی خاں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے کئی نقشے اور کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ غازی خاں نے اٹھ کر معظم علی کے ساتھ گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور کہا۔ ''مجھے آپ کے متعلق حکم موصول ہو چکا ہے۔ آپ کی فوج علی الصباح کوچ کرنے کے لیے تیار رہے۔''

O

انت پور کے قلعے پر دو دن سے شدید گولہ باری ہو رہی تھی۔ انگریز قلعے سے باہر اپنی رسد اور کمک کے راستے مسدود پا کر مایوس ہو چکے تھے۔ تیسرے دن معظم علی کی فوج قلعے پر فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے تیار کھڑی تھی کہ قلعے کے ایک شکستہ برج پر سفید جھنڈا دکھائی دیا۔

معظم علی نے فائرنگ بند کرنے کا حکم دیا اور فضا میں اچانک خاموشی چھا گئی۔ فوج کا ایک نوجوان افسر گھوڑا بھگاتا ہوا معظم علی کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔'' جناب اس قلعے کی فوج کو امان دینا گناہ ہے ان لوگوں کے ہاتھ ہمارے بے گناہ، بھائیوں اور بہنوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے جنگی قیدیوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ ہم انہیں معاف نہیں کر سکتے۔''

معظم علی نے جواب دیا۔''ہم برائی میں اپنے دشمنوں کی تقلید نہیں کریں گے۔

صلح اور جنگ کے متعلق ہمارا اپنا ایک ضابطہ ہے۔"

"لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے بیٹوں کے ساتھ انہوں نے کیا سلوک کیا تھا؟"

"مجھے معلوم ہے لیکن اپنے بیٹوں کی مظلومیت مجھے بھیڑیوں کی تقلید کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔"

قلعے کا دروازہ کھلا اور ایک انگریز افسر جس کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا، گھوڑا دوڑاتا ہوا آگے بڑھا، تھوڑی دیر بعد وہ معظم علی سے کہہ رہا تھا۔"ہمارے کماندار متارکۂ جنگ کے لیے آپ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں"

معظم علی نے جواب دیا۔"انہیں ہمارے ساتھ بات کرنے کی ضرورت نہیں تم ان سے کہو کہ جنت ختم کرنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ آپ ہتھیار ڈال دیں"

انگریز افسر نے کہا۔"اگر آپ ہمیں اپنی حفاظت میں سداشیو گڑھ پہنچانے کا ذمہ لیں تو ہم یہ قلعہ خالی کرنے کے لیے تیار ہیں"

معظم علی نے تلخ ہو کر جواب دیا۔"تم ہمارا وقت ضائع کر رہے ہو۔ جنگ بند کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ تم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دو۔"

انگریز افسر نے قدرے تذبذب کے بعد کہا۔"اگر ہم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آپ ہمارے ساتھ جنگی قیدیوں کا سلوک کریں گے؟"

"ہم تمہیں کوئی ضمانت نہیں دے سکتے۔ تمہارے جرائم ایسے ہیں کہ تمہارے ساتھ بات کرنا بھی انسانیت کی توہین ہے۔ لیکن تم اپنے کماندار کو میری طرف سے

یہ بتا سکتے ہو کہ ہم تمہارے ساتھ وہ سلوک کریں گے جو تم نے انت پور کا قلعہ فتح کرنے کے بعد ہمارے سپاہیوں اور ہماری عورتوں کے ساتھ کیا تھا۔ میں تمہیں فیصلہ کرنے کے لیے نصف گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں۔ اس کے بعد قلعے پر گولہ باری شروع کر دی جائے گی۔ تم جا سکتے ہو۔"

انگریز افسر نے کہا۔"اگر آدھ گھنٹے کے بعد قلعے کا دروازہ کھول دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے آپ کا فیصلہ تسلیم کر لیا ہے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔"نہیں یہ کافی نہیں۔ آپ کو تمام فوج قلعے سے باہر کھڑی کرنی پڑے گی اور ان کے ہتھیار ایک جگہ ڈھیر کرنے ہوں گے۔ پھر جب ہم قلعے پر قبضہ کر لیں گے تو آپ کو کسی موزوں جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔"

انگریز افسر نے معظم علی کو فوجی سلام کرنے کے بعد گھوڑے کی باگ موڑ لی۔ کوئی بیس منٹ بعد قلعے کا دروازہ کھل چکا تھا اور انگریز باہر نکل کر فصیل سے چند گز آگے اپنا اسلحہ ڈھیر کر رہے تھے۔

معظم علی نے قلعے پر قبضہ کرنے کے بعد انگریز عورتوں کو چند کوٹھڑیوں میں بند کر دیا۔ قلعے کے اندر میسور کی فوج کے وہ قیدی جو انگریزوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ گئے تھے۔ ہڈیوں کے ڈھانچے معلوم ہوتے تھے۔ اور چلا چلا کر صدیق علی اور اس کے ساتھیوں کے انتقام کی مطالبہ کر رہے تھے۔

معظم علی نے انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ میں صدیق اور مسعود کا باپ ہوں جب معظم علی نے شہداء کی قبروں کے متعلق پوچھا تو ایک قیدی نے بتایا کہ ان سب کو قلعے سے باہر ایک ہی گڑھے میں دفن کر دیا گیا تھا اور وہ گڑھا ہم سے کھدوایا گیا تھا۔

"

تھوڑی دیر بعد فاتح لشکر قلعے سے باہر مٹی کے ایک انبار کے گرد کھڑا تھا اور اس انبار کے اوپر میسور کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ معظم علی قیدیوں کی زبانی اس لڑکی کے متعلق سن رہا تھا جس نے صدیق علی کے ساتھ جام شہادت نوش کیا تھا۔ کسی کو اس کی پوری داستان معلوم نہ تھی۔ اپنے ان گنت سوالات کے جواب میں وہ صرف یہ معلوم کر سکا کہ اس کا بیٹا کسی عالی نسب اور بے یارومددگار لڑکی کا آخری سہارا تھا۔ اور اس نے اسے شیموگا کے قلعے سے اپنے گھر بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔

معظم علی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور صدیق اور مسعود کے بچپن اور جوانی کی بے شمار تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ پھر اپنے بیٹوں کے ساتھ وہ ایک لڑکی کی مختلف خیالی تصویریں دیکھنے لگا۔ "میری بیٹی!" وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ "مجھے نہیں معلوم تو کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی، کس خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ میں تمہیں کبھی نہیں دیکھوں گا لیکن اگر تمہاری توح میری آواز سن سکتی ہے تو میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے بچوں سے کم عزیز نہیں ہو۔"

○

اگلے دن معظم علی نے چار سو سپاہی قلعے کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر باقی دستوں کے ساتھ سلطان کے پڑاؤ کا رخ کیا۔ راستے میں اسے یہ اطلاع ملی کہ سلطان کا لشکر بدنور کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔ معظم علی اپنی پیادہ فوج کو پیچھے چھوڑ کر سوار دستوں کے ہمراہ یلغار کرتا ہوا بدنور پہنچا تو وہاں لڑائی شروع ہو چکی تھی۔

معظم علی نے شہر کی مشرقی دیوار سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر اپنے ساتھیوں کو رکنے کا حکم دیا اور خود گھوڑے سے اتر کر بھاگتا ہوا ایک ٹیلے پر چڑھا۔ اس نے آنکھوں سے دوربین لگا کر صورتِ حالات کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹیلے سے اترا

اوراپنے ساتھیوں کوگھوڑوں سے اترنے کاحکم دے کرایک افسر کی طرف متوجہ ہوا۔'' تم اپنے سپاہیوں سے کہو کہ وہ گھوڑوں کو پیچھے لے جائیں، میں باقی دستوں کے ساتھ آگے جارہاہوں۔''

چند منٹ بعد وہ شہر کی مشرقی سمت غازی خاں کی قیادت میں لڑے والے سپاہیوں کی صفوں میں شامل ہوگیا۔سلطان کی فوج کا فرانسیسی توپخانہ فصیل کے مشرقی دروازے پر گولہ باری کررہا تھا۔اورتوپخانے کے دائیں بائیں غازی خاں کی فوج فیصلہ کن حملے کے لیے حکم کا انتظار کررہی تھی۔فرانسیسی توپخانے کی گولہ باری کے باعث مشرقی دیوار میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے شگاف پیدا ہو چکے تھے۔تاہم انگریز فصیل کے مورچوں پر ڈٹے ہوئے تھے اوران کی جوابی گولہ باری کافی شدید تھی۔شہر کی مغربی سمت سے نقاروں کی صدائیں یہ ظاہر کررہی تھیں کہ اس طرف عام حملے کاحکم ہوچکا ہے۔غازی خاں نے نقاروں کی صدائیں سنتے ہی اپنے دستوں کوپیش قدمی کاحکم دیا۔سپاہی اپنے اپنے مورچوں سے نکلےاوررینگتے ہوئے شہر پناہ کی طرف بڑھنے لگے۔پھرکئی نوجوان اچانک بانس کی سیڑھیاں اٹھا کر بھاگےاورآن کی آن میں فصیل کے قریب پہنچ گئے۔لیکن دشمن کی شدید مزاحمت کے باعث وہ فصیل کے کسی حصے پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہوئے اورانہیں مشرقی دروازے کے آس پاس چندلاشیں چھوڑکر پیچھے ہٹنا پڑا۔

معظم علی فصیل سے کوئی تیس چالیس قدم دورایک زخمی سپاہی کوسہارادینے کی کوشش کررہا تھا۔اچانک اس نے دیکھا کہ دوفرانسیسی جوان جن میں سے ایک کے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل تھی اوردوسرا اپنے بازوؤں میں ایک بارودی گولہ تھامے ہوئے تھا۔بے تحاشا فصیل کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ان کے پیچھے فرانسیسی

سپاہیوں کا ایک دستہ فصیل کے مورچوں پر گولیاں برساتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔معظم علی بلند آواز میں چلایا۔دشمن کو اپنی طرف متوجہ رکھو۔اور اس کے ساتھیوں نے پلٹ کر فصیل پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔غازی خاں اور فوج کے دوسرے افسر دم بخود ہو کر فرانسیسی جانبازوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔بارودی گولے کے بوجھ کے باعث فرانسیسی سپاہی اپنی دوڑ کا آخری مرحلہ بڑی مشکل سے طے کر رہا تھا۔اور دوسرا جس کے ہاتھ میں مشعل تھی۔چند قدم بھاگ کر اپنے ساتھی سے آگے نکل جاتا اور پھر اچانک زمین پر لیٹ کر اس کا انتظار کرتا۔فصیل سے آٹھ دس قدم دور یہ دونوں یکے بعد دیگرے زخمی ہو کر گر پڑے۔ایک ثانیہ بعد ان میں سے ایک دوبارہ اٹھا اور گولہ اٹھا کر فصیل کے ساتھ جا گرا۔پھر اس نے گولے کو فصیل کے شگاف کے اندر دھکیل دیا اور زمین پر رینگتا ہوا واپس مڑا۔اپنے گرے ہوئے ساتھی کے قریب پہنچ کر اس نے جلتی ہوئی مشعل اٹھائی اور دوبارہ مڑ کر فصیل کی طرف رینگنے لگا۔لیکن اچانک اس کے سر پر گولی لگی اور وہ بے حس و حرکت لیٹ گیا۔

معظم علی اچانک اٹھ کر پوری رفتار سے بھاگا اور پھر اچانک زمین پر منہ کے بل لیٹ گیا۔پھر چند قدم اٹھا کر بھاگا اور دوبارہ لیٹ گیا۔تیسری کوشش میں وہ فرانسیسی سپاہی کے ہاتھ سے گری ہوئی مشعل اٹھا چکا تھا۔پھر یکے بعد دیگرے اس کی ران اور اس کے سینے میں دو گولیاں لگیں لیکن گرتے پڑتے بارودی گولے کے قریب پہنچ چکا تھا۔فصیل کے شگاف کے اندر سمٹنے کے بعد وہ اوپر سے آنے والی گولیوں کی زد سے محفوظ تھا۔اس نے جلتی ہوئی مشعل بارودی گولے کے فیتے پر رکھ دی پھر اپنی رہی سہی قوت بروئے کار لاتے ہوئے فصیل کے شگاف سے باہر نکلا اور بھاگنے لگا۔

اتنی دیر میں فصیل کے مورچوں میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔فصیل سے بیس گز دور معظم علی گر پڑا۔اس کے ساتھ ہی ایک زبردست دھما کا سنائی دیا۔دھوئیں اور گرد کے بادل اڑے اور میسور کے سپاہی قلعے کی مشرقی دیوار میں ایک چھوٹے شگاف کی جگہ ایک بڑی گزرگاہ دیکھ رہے تھے۔۔

O

معظم علی نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں تو وہ ایک خیمے کے اندر لیٹا ہوا تھا۔ انور علی اور میسور کی فوج کا ایک بہترین طبیب اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔اس نے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن نقاہت کے باعث اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔طبیب نے جلدی سے اسے سہارا دے کر لٹاتے ہوئے کہا۔''آپ آرام سے لیٹے رہیں۔''

معظم علی نے چند ثانیے ستانے کے بعد انور علی کی طرف دیکھا اور کہا۔''میں کہاں ہوں،بدنور فتح ہوا یا نہیں؟''

''ابا جان!بدنور کا شہر فتح ہو چکا ہے۔اب صرف قلعہ باقی ہے''

معظم علی نے کہا۔''بیٹا!تمہیں میری خاطر اپنے فرائض سے غافل نہیں ہونا چاہیے''

''ابا جان مجھے سلطان معظم اور غازی خاں نے آپ کے پاس ٹھہرنے کا حکم دیا تھا۔وہ ابھی آپ کو دیکھ کر گئے ہیں۔برہان الدین بھی آپ کو دیکھنے آئے تھے۔ابھی قلعے پر حملہ شروع نہیں ہوا۔اس کے گرد ابھی توپیں نصب کی جا رہی ہیں۔''

معظم علی نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔''بیٹا شہر کی لڑائی میں ہمارا زیادہ نقصان تو نہیں ہوا۔''

”نہیں ابا جان! شہر کی فصیل ٹوٹنے کے بعد انگریز چاروں اطراف سے بھیڑوں کی طرح قلعے کی طرف دوڑ رہے تھے۔“

طبیب نے دوا کی پیالی معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔”باتیں کرنے سے آپ کی تکلیف میں اضافہ ہوگا۔آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔یہ دوا پی لیجئے۔“

معظم علی نے جواب دیا۔”اگر یہ دوا مجھے بیہوش کرنے کے لیے ہے تو میں نہیں پیوں گا۔میں اپنی زندگی کی باقی گھڑیوں میں سے ایک لمحہ کے لیے بھی بے ہوش رہنا پسند نہیں کروں گا۔اور آپ اس حقیقت کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ میں صرف چند گھڑی کا مہمان ہوں۔“

انور علی نے کہا۔”ابا جان! غازی خاں کہتے تھے کہ اگر آپ پسند فرمائیں تو امی جان اور مراد علی کو یہاں لانے کا انتظام ہوسکتا ہے؟“

معظم علی نے جواب دیا۔”نہیں بیٹا! تم جاؤ اور کہیں سے کاغذ اور قلم لے آؤ۔ میں ان کے نام ایک خط لکھنا چاہتا ہوں۔“

انور علی اٹھ کر باہر نکل گیا۔اور طبیب نے کہا۔”دیکھیے آپ اس حالت میں خط نہیں لکھ سکتے۔“

”آپ کو مجھے اپنی زندگی کا آخری فرض ادا کرنے سے منع نہیں کرنا چاہیے۔ میں خود لکھنے کی بجائے انور علی یا آپ میں سے کسی کو چند سطریں لکھوادوں گا۔“

طبیب نے کہا۔”میں آپ کو کسی بات سے منع نہیں کرسکتا۔لیکن آپ کم ازکم دل کی تقویت کے لیے یہ دوا ضرور پی لیں“

معظم علی نے جواب دیا۔”فتح کی خبر سے زیادہ میرے دل کے لیے اور کونسی چیز تقویت کا باعث ہوسکتی ہے۔بہر حال میں دوا پی لیتا ہوں۔“

طبیب نے ایک بوتل سے چند گھونٹ دوا نکال کر پیالی میں ڈالی اور معظم علی کو پلا دی۔

انور علی قلمدان اور کاغذ اٹھائے خیمے میں داخل ہوا اور اپنے باپ کے بستر کے قریب بیٹھ گیا۔طبیب نے معظم علی سے کہا۔"آپ اطمینان سے خط لکھوائیں۔میں باہر انتظار کرتا ہوں۔"

طبیب باہر نکل گیا اور معظم علی فرحت کے نام خط لکھوانے میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب یہ طویل خط ختم ہو چکا تو معظم علی اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا۔"بیٹا! یہ خط اپنی ماں کو دے دینا۔میں تمہیں یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ میرے بعد تم پر اپنی والدہ، اپنے بھائی اور سب سے زیادہ اپنے ملک و قوم کے متعلق کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔مجھے یقین ہے کہ تم ایک سعادت مند بیٹے اور ایک شفیق بھائی ثابت ہو گے۔لیکن میری امیداں اور آرزوئیں اس سے بہت زیادہ ہیں۔تمہارے لیے اور تمہارے بھائیوں کے لیے میری دعائیں ہمیشہ یہ رہی ہیں کہ تم قوم کی عزت اور آزادی کے امین بنو اور تمہاری آئندہ نسلیں اس درخت کی شاخوں پر جھولے ڈالیں جسے تمہارے اسلاف کے خون نے آبیار کیا ہے۔میسور ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری حصار ہے۔سلطان ٹیپو کی فتح ان کروڑوں انسانوں کی فتح ہو گی جو اس ملک میں عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔تمہارے متعلق میری آخری خواہش یہ ہے کہ جب میسور کی عزت اور آزادی کے محافظ فتح و نصرت کے پرچم لہرائیں تو تم فخر کے ساتھ سر اونچا کر کے یہ کہہ سکو کہ میسور کی خاک پر میرے باپ اور میرے بھائیوں کا خون گرا تھا۔تم کسی دن میری قبر پر آؤ اور مجھے یہ مژدہ سناؤ کہ ابا جان آپ نے جس عظیم مقصد کے لیے قربانیاں دی تھیں۔

وہ پورا ہو چکا ہے۔آزادی کے جس سورج کی تلاش میں آپ مرشد آباد سے نکلے تھے ۔وہ میسور میں پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔

بیٹا! تمہاری منزل بہت دور اور تمہارا راستہ بہت کٹھن ہے لیکن قدرت نے تمھیں ایک ایسا رہنما عطا کیا ہے جو عزم و ثبات اور ایثار و خلوص کی نعمتوں سے مالا مال ہے۔ایک قافلے کی اس سے زیادہ اور کیا خوش بختی ہو سکتی ہے۔کہ اس کا رہنما مہیب تاریکیوں، آندھیوں اور طوفانوں میں اپنی منزل دیکھ سکتا ہو۔"

انور علی بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔اس نے کہا ۔"ابا جان مجھے یقین ہے کہ آپ تندرست ہو جائیں گے۔سلطان کو اآپ جیسے ساتھیوں کی ضرورت ہے اور میسور میں ابھی آپ کے حصے کا بہت سا کام باقی ہے۔"

معظم علی نے کہا۔"بیٹا! شاہراہِ زندگی کے ہر مسافر کی ایک آخری منزل ہوتی ہے۔اور میں اپنی زندگی کے آخری سانس کے لیے اس سے بہتر مقام کی تمنا نہیں کر سکتا تھا۔تمہاری عمر میں میری سب سے بڑی خواہش یہ ہوا کرتی تھی کہ میں حق کے لیے زندہ رہوں، حق کے لیے لڑوں اور حق کے لیے جان دے دوں۔"

طبیب خیمے میں داخل ہوا اور اس نے معظم علی کے قریب بیٹھ کر اس کی نبض دیکھتے ہوئے کہا۔"آپ کے چند دوست آپ کو دیکھنے آرہے ہیں۔لیکن میں آپ کو اب زیادہ دیر باتیں کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔آپ اپنے زخموں میں زیادہ درد محسوس تو نہیں کرتے؟"

معظم علی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا"نہیں! باتیں کرتے وقت مجھے درد کا احساس نہیں رہتا۔"

غازی خاں، برہان الدین اور فوج کے تین اور بڑے افسر خیمے کے اندر داخل

ہوئے۔ غازی خاں نے آگے بڑھ کر معظم علی کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔" آپ کیسے ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا۔"میں ٹھیک ہوں۔قلعہ فتح ہو چکا ہے؟"

غازی خاں نے جواب دیا"نہیں! قلعے کی فتح کی خبر سننے کے لیے آپ کو شاید چند دن انتظار کرنا پڑے۔اس وقت اہم مقامات پر توپیں نصب کی جارہی ہیں اور شام تک گولہ باری شروع ہو جائے گی۔سلطان معظم آپ کے متعلق بہت فکرمند ہیں اور انہوں نے یہ فرمایا ہے کہ اگر آپ پسند کریں تو آپ کے بچوں کو یہاں بلالیا جائے۔"

معظم علی نے جواب دیا۔"نہیں! میں اس حالت میں انہیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

معظم علی سے چند منٹ اور باتیں کرنے کے بعد غازی خاں اوراس کے ساتھی خیمے سے باہر نکل گئے۔برہان الدین نے خیمے سے باہر نکلتے وقت مڑ کر دیکھا اور طبیب کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔طبیب جلدی سے خیمے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ برہان الدین اسے ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے آیا۔اور بولا۔"سلطانِ معظم کا حکم ہے کہ آپ ان کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔اب کی حالت خطرے سے باہر ہے نا۔؟"

طبیب نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔"نہیں! ان کا اس وقت تک اطمینان سے باتیں کرنا بھی ایک معجزہ ہے۔زخم بہت شدید ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ ان کی ہمت اچانک جواب دے جائے گی۔"

برہان الدین نے کہا۔"ان کی جان بہت قیمتی ہے۔"

طبیب نے کہا۔ ’’آپ اطمینان رکھیں، میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی ۔‘‘

○

اگلی رات معظم علی کی حالت بہت نازک ہوچکی تھی۔ وہ کبھی کبھی ہوش میں آکر انور علی سے کوئی بات کرتا لیکن چند منٹ کے بعد اس کی طاقت جواب دے جاتی اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں آنکھیں بند کرلیتا، آدھی رات کے قریب اس نے انور علی سے کہا۔ ’’بیٹا! میرا خیال تھا کہ میں آخری سانس لینے سے پہلے سلطانِ معظم سے چند باتیں کرسکوں گا۔ لیکن وہ بہت مصروف ہیں۔‘‘

انور علی نے کہا۔ ’’ابا جان! اگر آپ چاہیں تو میں غازی خاں کی وساطت سے ان تک آپ کا پیغام پہنچا سکتا ہوں۔ سلطانِ معظم عشاء کی نماز کے بعد آپ کو دیکھنے آئے تھے۔ لیکن اس وقت آپ بے ہوش تھے‘‘

معظم علی نے آنکھیں بند کرتے ہوئے جواب دیا۔ ’’انہیں اس وقت تکلیف دینے کی ضرورت نہیں اور بیٹا تم بھی لیٹ جاؤ۔‘‘

انور علی نے کہا۔ ’’ابا جان! طبیب کسی زخمی کو دیکھنے کے لیے گیا ہے جب وہ واپس آئے گا تو میں سو جاؤں گا۔ آپ میری فکر نہ کریں۔‘‘

رات کے پچھلے پہر طبیب اسے دوا پلا رہا تھا اور انور علی اس کے قریب بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ خیمے سے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر کوئی یہ کہتا ہوا سنائی دیا۔ ’’تم یہیں ٹھہرو‘‘ اور ایک ثانیہ بعد انسانی سطوت و جبروت کا ایک پیکر مجسم خیمے کے اندر داخل ہوا۔ معظم علی نے آنکھیں کھول دیں۔ اور اس کی نگاہیں۔ سلطان ٹیپو کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ طبیب ادب سے سلام کرکے ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

انور علی نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور جلدی سے اٹھ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ معظم علی نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کی ہمت جواب دے گئی۔ سلطان نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے اپنے ہاتھوں کا سہارا دیا اور کہا۔ ''آپ اطمینان سے لیٹے رہیں۔'' پھر وہ بے تکلفی سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

معظم علی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''عالیجاہ! مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور تشریف لائیں گے۔ اگرچہ ایسی خواہش آپ کے ایک خادم کو زیب نہیں دیتی۔''

سلطان نے کہا۔ ''آپ میرے دوست ہیں اور مجھے آپ کی دوستی پر فخر ہے۔''

معظم علی نے کہا۔ ''آپ ان لوگوں سے خبردار رہیں جو قوم کی عزت اور آزادی کو تجارت کا مال سمجھتے ہیں۔ ایک غدار ہزاروں شہیدوں کی قربانی پر پانی پھیر سکتا ہے۔ خدا معلوم اس ملک میں ابھی کتنے ایاز ہیں۔ بدنور اور ملیبار کے باقی علاقوں سے دشمن کو نکالنے کے بعد آپ کسی غدار کو زندہ نہ چھوڑیں''

سلطان نے جواب دیا۔ ''غدار اپنا وار کرنے سے پہلے ہمارے سامنے نہیں آتے۔ انہیں ختم کرنے کے لیے ایک حکمران کی بصیرت سے زیادہ پوری قوم کے اجتماعی احساس کی بیداری کی ضرورت ہے۔ خطرناک ناسور اس جسم پر ظاہر ہوتے ہیں۔ جس میں صالح خون کی جگہ فاسد مادہ جمع ہو چکا ہو۔ غدار ہمیشہ اس قوم کی آغوش میں جنم لیتے ہیں جسکی قوت محاسبہ کمزور ہو چکی ہے۔ میری پونجی وہ تہی دست قوم ہے جس کی غیرت اور حمیت کے خزانے الٹ چکے ہیں اس قوم میں زندگی کی نئی روح بیدار کرنے کے لئے مجھے وقت کی ضرورت ہے۔ اگر خدا نے مجھے ان جنگوں سے فرصت دی تو شاید میں یہ کام بھی کر سکوں لیکن میری جنگ صرف انگریزوں کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ مرہٹے اور نظام بھی مجھے اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔''

معظم علی نے نقاہت سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ قدرت نے آپ کو جس مقصد کے لیے منتخب کیا ہے۔ وہ ضرور پورا ہوگا۔''

سلطان نے طبیب کی طرف دیکھا اور وہ جلدی سے آگے بڑھ کر معظم علی کی نبض ٹٹولنے لگا۔ سلطان نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''معظم علی''

معظم علی نے آنکھیں کھولیں اور سلطان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگالیا اور کہا۔ ''عالیجاہ! مجھے موت کے لیے اس گھڑی کا انتظار تھا۔ خدا آپ کو فتح دے۔'' پھر محبت، اطاعت اور عقیدت سے لبریز نگاہیں سلطان ٹیپو کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

چند ثانیے بعد معظم علی نے ایک گہری اور لمبی سانس لی۔ اور سلطان کے ہاتھ پر اپنی گرفت ڈھیلی چھوڑ دی۔ مرشد آباد کی تاریک رات کا مسافر میسور کی حسین صبح کے آفتاب کے سامنے دم توڑ چکا تھا۔ طبیب نے سلطان کا اشارہ پا کر آگے بڑھا۔ اس نے معظم علی کی نبض دیکھی۔ اور سر ہلا دیا۔

سلطان ''اناللہ وانا الیہ راجعون'' کہہ کر اٹھا۔ انور علی بے حس وحرکت اپنی جگہ کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ سلطان نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا! ان کی زندگی قابلِ تقلید اور ان کی موت قابل رشک تھی۔''

○

چند دن بعد سہ پہر کے وقت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ فرحت اور مراد علی مکان کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے اچانک مراد علی چلایا۔ ''امی جان! امی

جان! بھائی جان آ گئے‘‘ پھر وہ اٹھ کر بھاگتا ہوا صحن کی طرف بڑھا اور انور علی سے لپٹ گیا۔ انور علی کا لباس پانی اور کیچڑ سے لت پت تھا وہ مراد علی کو اپنے ساتھ چمٹائے آگے بڑھا فرحت اپنی نگاہوں میں ہزاروں دعائیں لیے اٹھی اور برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب کھڑی ہو گئی۔ لیکن انور علی کے چہرے پر حزن وملال کے آثار دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ انور علی نے برآمدے کی سیڑھیوں پر پاؤں رکھتے ہوئے مرجھائی ہوئی آواز میں سلام کیا۔ اور پھر آگے بڑھ کر ماں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

’’کیا بات ہے بیٹا!‘‘ میاں نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا ’’تم بہت پریشان نظر آتے ہو‘‘

چند لمحات کے لیے انور علی کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ پھر اس نے اچانک جھک کر مراد علی کو اپنے سینے سے لگا لیا اور سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ’’امی جان! ابا جان شہید ہو چکے ہیں‘‘

فرحت کچھ دیر بے حس وحرکت کھڑی رہی اور پھر لڑکھڑاتی ہوئی دیوار کی طرف بڑھی اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس کی خاموشی چیخوں سے زیادہ دردناک اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں آنسوؤں سے زیادہ کرب انگیز تھیں۔ انور علی آگے بڑھ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی کمر کے تھیلے سے معظم علی کا خط نکال کر ماں کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ ’’امی جان! زخمی ہونے کے بعد ابا جان نے آپ کے لیے یہ خط لکھوایا تھا۔‘‘

فرحت نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط پکڑ لیا لیکن کھول کر پڑھنے کی بجائے اسی طرح بے حس وحرکت بیٹھی رہی۔ مراد علی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ’’امی

جان! آپ نے ابا جان کا خط نہیں پڑھا؟"

فرحت کے ہونٹ کپکپائے اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے ۔پھر اچانک اس نے مراد علی کو کھینچ کر سینے سے لگالیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ نکلا۔

صابر "انور علی انور علی" کہتا ہوا صحن میں داخل ہوا لیکن برآمدے کے قریب پہنچ کر ایک غیر متوقع صورتِ حالات کا سامنا کرنے کے بعد ٹھٹھک کر رہ گیا۔ کیا ہوا بی بی جی؟"

اس نے سہمی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

فرحت جواب دینے کے بجائے اٹھی اور کمرے کے اندر چلی گئی۔ مراد علی اٹھ کر آگے بڑھا اور صابر کے ساتھ چمٹ کر سسکیاں لینے لگا۔ انور علی نے کہا۔ "چچا صابر! ابا جان شہید ہو گئے ہیں۔"

صابر کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

فرحت کمرے میں جا کر ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے شوہر کا خط کھولا۔ اور پڑھنا شروع کر دیا۔ معظم علی نے لکھا تھا۔

"رفیقہ حیات! میں زخموں سے نڈھال ہوں اور بستر پر لیٹا ہوا تمہیں یہ خط لکھوا رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ قدرت کو میرا زندہ رہنا منظور ہو اور میں تمہیں دوبارہ دیکھ سکوں لیکن اب مجھے زندہ رہنے کی خواہش بھی ایک خود فریبی معلوم ہوتی ہے۔ میرے زخم بہت شدید ہیں۔ اور اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ تمہارے نام یہ خط میرا آخری پیغام ہو۔

میں نے اپنی زندگی کے بہترین ایام تمہاری رفاقت اور تمہاری رفاقت سے

پہلے تمہاری یاد میں گزارے ہیں۔ میری امیدوں، آرزوؤں، امنگوں اور ولولوں نے ان سپنوں کے ساتھ جنم لیا تھا جو میں تمہارے متعلق دیکھا کرتا تھا۔ تمہاری رفاقت نے میری زندگی کو اعلیٰ وارفع مقاصد عطا کیے۔ مجھے تمہارے بچوں کے لیے ایک ایسے وطن کی تلاش تھی جہاں وہ عزت اور آزادی کی زندگی بسر کر سکیں۔ اور میسور میرے خوابوں کی جنت ہے۔ ایک بڑی آرزو کی تکمیل کے لیے عظیم قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ میرا اور میرے بیٹوں کا خون میسور کے ان اَن گنت مجاہدوں کے خون سے زیادہ قیمتی نہیں جو قوم کی عزت اور ناموس پر قربان ہو چکے ہیں۔ میں نے اننت پور میں مٹی کا وہ انبار دیکھا تھا جس میں صدیق اور مسعود کے ساتھ سینکڑوں اور شہیدوں کی لاشیں دفن تھیں۔ کتنے والدین، کتنی بہنیں، اور بھائی، کتنے بچے اور بیویاں اننت پور سے کوسوں دوران کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اور آنے والے دور میں نہ معلوم اننت پور کی داستان میسور کے کتنے قلعوں، کتنے شہروں کتنی بستیوں میں دہرائی جائے گی۔

سلطان ٹیپو ان مجاہدوں کے قائد ہیں جنہیں قدرت نے ایک زوال پذیر قوم کے ماضی کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ سلطان کی جدوجہد کا آخری انجام کیا ہوگا۔ آگ اور خون کے کتنے طوفان ہیں جو ان کی منزل کے راستے میں حائل ہیں۔ بیرونی حملہ آوروں کے علاوہ ملک کے اندر کتنے ابن الوقت، کتنے ضمیر فروش، منافق اور غدار ایسے ہیں جو قوم کے اس بطلِ جلیل کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھیں گے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر جنوبی ہندوستان کے مسلمانوں نے خودکشی کا ارادہ نہیں کر لیا تو میسور ان کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بن جائے گا۔ وہ سلطان ٹیپو کا اپنا نجات دہندہ سمجھ کر اس کے

اشاروں پر جان دینا اپنے لیے باعثِ سعادت خیال کریں گے۔ لیکن اگر ذلت اور رسوائی ان کے لیے مقدر ہو چکی ہے تو انہیں عزت اور سر بلندی کا راستہ دکھانا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ ہماری روحوں کو یہ اطمینان ہوگا کہ ہم خدا کی زمین پر اپنا آخری فرض ادا کر چکے ہیں اور جزا و سزا کے ملک کے دربار میں کھڑے ہو کر ہم کسی دن یہ کہہ سکیں گے کہ جب قوم گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹک رہی تھی تو ہم نے اسے روشنی دکھانے کی کوشش کی تھی۔ جب حق و باطل کا معرکہ گرم تھا تو ہم باطل کی بجائے حق کا ساتھ دینے والوں میں تھے اور جب قدرت نے ایک گرتی ہوئی قوم کو سنبھالا دینے کے لیے ایک رجل عظیم کو بھیجا تھا تو ہم نے قوم کے دامن سے ذلت اور رسوائی کا داغ دھونے کے لیے اپنا خون پیش کیا تھا۔

رفیقہ حیات! میں دعا کرتا ہوں کہ صدیق اور مسعود کی طرح انور اور مراد بھی ہمیشہ سلطان ٹیپو کے جانبازوں کی صفِ اول میں نظر آئیں۔ ایک زمانہ وہ تھا جب میں صرف جنگ اور اس کے نتائج کے متعلق سوچ سکتا تھا۔ اور یہ سمجھتا تھا کہ جب جنگ میں کسی جوج کو شکست ہوتی ہے تو اس کے سپاہیوں کا خون رائیگاں جاتا ہے۔ لیکن اب یہ حقیقت میرا جزو ایمان بن چکی ہے کہ جو مجاہد فتح و شکست سے بے پروا ہو کر کسی ارفع و اعلیٰ مقصد کے لیے جان دیتے ہیں۔ ان کی قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔ اور وہ مقاصد جن کے لیے یہ بے لوث قربانیاں دی جاتی ہیں۔ انسانیت کے قیمتی میراث بن کر ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ جب حق و صداقت کے علمبرداروں کا ایک قافلہ گرتا ہے تو قدرت اس کے پرچم اٹھانے کے لیے کسی اور قافلے کو بھیج دیتی ہے۔ میں جب اپنی قوم کے ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے انسانیت کا جھنڈا سلطان ٹیپو نے اٹھایا ہے، اسے گزشتہ صدیوں میں کئی اولوالعزم

انسان بلند کر چکے ہیں۔ان میں سے بعض ایسے تھے جن کی پکار پر لبیک کہنے کے لیے زندگی اور باحمیت اقوام موجود تھیں اور ان کے مقدر میں کامیابیاں اور کامرانیاں تھیں۔بعض ایسے بھی تھے جو اپنی اولوالعزمی اور غیر معمولی جرات اور ہمت کے باوجود مغضوب اقوام کو راہ راست پر نہ لا سکے۔اور جن مٹھی بھر سرفروشوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا ان کا مقدس خون قوم کی تاریخ کے روشن صفحات لکھنے کے کام نہ آسکا۔جب میں مستقبل کے متعلق سوچتا ہوں تو بھی میرا ضمیر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ہمارا پرچم کبھی سرنگوں نہیں ہوگا۔اس ملک کے کسی نہ کسی گوشے سے کوئی کوئی اولوالعزم انسان اسے سہارا دیتا رہے گا۔اور پھر ایک دن ایسا آئے گا جب پوری قوم منظم اور متحد ہو کر اس جھنڈے تلے جمع ہو جائے گی۔اور اس کا ہر قدم کامیابیوں اور کامرانیوں کی طرف ہوگا لیکن ان کامیابیوں اور کامرانیوں میں وہ لوگ برابر کے حصے دار سمجھے جائیں گے۔جنہوں نے ماضی کے بھیانک طوفانوں میں حق وانسانیت کا یہ پرچم بلند رکھا تھا۔قیامت کے دن مختلف ادوار میں حق وانسانیت کے لیے قربانیاں دینے والے لوگ ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے۔اور میری آخری دعا یہ ہے کہ یوسف، آصف، افضل، میرے ابا جان اور صدیق اور مسعود کی طرح انور اور مراد بھی حق پرستوں کی اسی صف میں کھڑے ہوں۔۔

تمہارا شوہر

جب فرحت خط پڑھنے میں منہمک تھی تو انور اور مراد کمرے میں داخل ہوئے اور اس کے سامنے کھڑے ہو گئے لیکن اسے اپنے گردوپیش کا احساس نہ تھا۔کبھی کبھی خط کے الفاظ اور اس کی آنکھوں کے درمیان آنسوؤں کے پردے حائل ہو جاتے۔وہ آنسو پونچھتی اور دوبارہ خط پڑھنے میں مصروف ہو جاتی۔خط ختم کرنے کے بعد وہ

دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہی۔ بالآخر اس نے گردن اٹھائی اور اپنے بیٹوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تمہارے ابا جان مرے نہیں، وہ زندہ ہیں وہ اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اس دنیا میں عزت اور آزادی کا تصور زندہ ہے۔ یہ خط تمہاری میراث ہے۔ اور کوئی باپ اپنی اولاد کے لیے اس سے بہتر میراث نہیں چھوڑ سکتا۔''

ایک ہفتہ بعد انور علی محاذِ جنگ کی طرف روانہ ہو چکا تھا اور اس کے بعد مراد علی ہر روز مکتب سے واپس آ کر اپنی ماں کو سلطان کی فتوحات کی نئی نئی خبریں سنایا کرتا تھا۔ ''امی جان! بڈنور فتح ہو چکا ہے۔ جنرل میتھیوز اور اس کی فوج کو پا بہ زنجیر چیتل ڈرگ کے قید خانے کی طرف لایا جا رہا ہے۔ امی جان! آج خبر آئی ہے کہ سلطان کی افواج منگلور کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ آج یہ خبر آئی ہے کہ منگلور کا شہر فتح ہو چکا ہے۔ اور قلعے کا محاصرہ جاری ہے۔'' پھر ایک دن وہ بھاگتا ہوا آیا اور بلند آواز میں چلایا۔ ''امی جان! منگلور کا قلعہ فتح ہو چکا ہے۔''

-----The End---ختم شد-----------------